سہ ماہی

اردو ریسرچ جرنل

ISSUE 31-33 || JULY 2022 TO MARCH 2023

مشترکہ شمارہ

ابن کنول نمبر

ایڈیٹر

ڈاکٹر عزیر اسرائیل

ISSN 2348-3687

قلم کاروں سے گزارش

'اردو ریسرچ جرنل ایک اعلیٰ تحقیقی جرنل ہے جس کا مقصد اردو میں تحقیق وتنقید کو فروغ دینا ہے۔ اس وجہ سے 'اردو ریسرچ جرنل' کے لئے نگارشات بھیجنے والے معزز قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ مندرجہ ذیل امور کا خاص طور پر خیال رکھیں:

☆ مضمون نگار اپنا نام، عہدہ، مکمل پتہ، موبائل نمبر اور ای میل مضمون کے شروع یا آخر میں ضرور لکھیں۔

☆ غیر شائع شدہ مضامین ہی ارسال کریں۔

☆ ای میل بھیجتے وقت مضمون کے غیر مطبوعہ ہونے کی تصدیق کر دیں۔

☆ مضمون بھیجنے کے بعد کم از دو شماروں کا انتظار کریں۔

☆ کسی بھی قسم کی خط وکتاب ای میل پر ہی کریں۔ فون پر رابطہ کرنے سے گریز کریں۔

☆ مضمون کے ناقابل اشاعت کی اطلاع نہیں دی جائے گی۔ اگر آپ کا مضمون لگاتار دو شماروں میں نہیں شائع ہوتا ہے تو آپ اس کو کہیں اور شائع کرا سکتے ہیں۔

☆ اگر اشاعت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون اس سے پہلے کہیں اور شائع ہو چکا ہے یا کسی اور کے مضمون کا سرقہ ہے مضمون نگار کو بلیک لسٹ کر دیا جائے گا۔ مستقبل میں اس کی کوئی تحریر شائع نہیں کی جائے گی۔

☆ یہ ایک خالص تحقیقی وتنقیدی جرنل ہے اس لیے اس میں تخلیقات نہیں شائع کی جاتی ہیں۔ لہذا افسانے اور غزلیں وغیرہ نہ بھیجیں۔

☆ اردو ریسرچ جرنل میں ریسرچ اسکالر کے مضامین بھی شائع کئے جاتے ہیں، ریسرچ اسکالر سے گزارش ہے کہ مضمون ارسال کرنے سے پہلے ایک بار اپنے اساتذہ کو ضرور دکھا لیں۔

☆ مضمون نگار حوالوں کی صحت کا خاص خیال رکھیں، بلا حوالہ کوئی بات نہ درج کریں۔

☆ جرنل کے لئے مضمون ارسال کرنے کے بعد اگر مضمون نگار کہیں اور شائع کرانا چاہیں تو اس کی اطلاع 'اردو ریسرچ جرنل' کو دیں۔

☆ اردو ریسرچ جرنل میں وہی مضامین شائع کئے جائیں گے جو تبصرہ نگاروں (Reviewers) کے ذریعہ قابل اشاعت قرار دئے جائیں گے۔

☆ تبصرہ کے لئے صرف کتابیں بھیجیں، ادارہ خود ان پر تبصرہ کرائے گا۔

☆ مضمون ان پیج یا ورڈ کی فائل میں ٹائپ شدہ ہونا چاہئے۔ پی ڈی ایف فائل یا ہارڈ کاپی قبول نہیں کی جائے گی۔

نگارشات اس ای میل پر بھیجیں:

E-mail:editor@urdulinks.com

urjmagazine@gmail.com

مزید تفصیل کے لئے 'اردو ریسرچ جرنل' کی ویب سائٹ www.urdulinks.com دیکھیں۔

Approved by University of Tehran,Iran

اردو ریسرچ جرنل

Urdu Research Journal
Issue: 31-33
(July-22 to March-23)

بیادگار

پروفیسر ابن کنول

(سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی، انڈیا)

ایڈیٹر

ڈاکٹر عزیر اسرائیل

(صدر شعبہ اردو، اسلام پور کالج، نارتھ بنگال یونی ورسٹی، مغربی بنگال، انڈیا)

مجلس مشاورت

ڈاکٹر احمد القاضی
شعبہ اردو، الازہر یونی ورسٹی، مصر

ڈاکٹر صابر گودڑ
سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ، موریشس

ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، تہران یونی ورسٹی، ایران

ڈاکٹر سہیل عباس
پروفیسر شعبہ اردو، ٹوکیو یونی ورسٹی، جاپان

پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی
سابق صدر شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی، لینگویج یونی ورسٹی، لکھنؤ، انڈیا

ڈاکٹر ابوشہیم خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدرآباد، انڈیا

ڈاکٹر محمد اکمل شاداب
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو خواجہ معین الدین چشتی، لینگویج یونی ورسٹی، لکھنؤ، انڈیا

ڈاکٹر رضی شہاب
شعبہ اردو، مغربی بنگال اسٹیٹ یونی ورسٹی، باراسات، مغربی بنگال، انڈیا

ڈاکٹر محمد شہنواز عالم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، اسلام پور کالج، نارتھ بنگال یونی ورسٹی، مغربی بنگال، انڈیا

اپنی نگارشات صرف ای میل پر ارسال کریں:
P-101/A. Gali No 2, The Aliya Coahcing Istitute, Pahlwan Chawk, Batla House
Delhi-110025
editor@urdulinks.com, urjmagazine@gmail.com
Web: www.urdulinks.com/urj

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہر قسم کی قانونی چارہ جوئی صرف دہلی کی عدالتوں میں کی جاسکتی ہے۔

☆ اردو ریسرچ جرنل سے وابستہ افراد رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔

فہرست

اداریہ		
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!	عزیر اسرائیل	۹
حیات ابن کنول		
قلمی چہرہ: پروفیسر ابن کنول	ڈاکٹر شفیع ایوب	۱۰
ابن کنول حیات اور ادبی خدمات	مرتب: عزیر احمد	۱۳
منظوم خراج عقیدت		
ابن کنول	برقی اعظمی	۱۹
ابنِ کنول صاحب	ارشاد احمد ارشاد	۲۰
کیوں؟	شاہد انور	۲۴
ابن کنول	متین امروہوی	۲۵
قطعہء تاریخ وفات	تنویر پھول (امریکہ)	۲۵
رحلت ابن کنول	احمد امتیاز	۲۶
یادیں		
کچھ شگفتہ کچھ سنجیدہ مزاج دوست 'ابن کنول'	اسلم حنیف	۲۷
ابن کنول: خاص وضع قطع کا مخلص انسان	پروفیسر صغیر افراہیم	۳۵
ہمدمِ دیرینہ- پروفیسر ابنِ کنول	ڈاکٹر صابر گودڑ	۳۹
منفی ماحول کا مثبت استعارہ: ابن کنول	پروفیسر محمد کاظم	۴۳
پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ	ڈاکٹر محمد اکمل شاداب	۵۰
آہ پروفیسر ابن کنول۔۔۔۔دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں	شبنم شمشاد	۵۷
آتی رہے گی یاد ہمارے قابل ستائش استاد محترم ابن کنول	محمد جنید شکروی	۶۳
پروفیسر ابن کنول: کچھ یادیں، کچھ باتیں	ڈاکٹر افضل مصباحی	۶۹
زندہ رہتا ہے زمانے میں عمل اور کردار	ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی	۷۴
پروفیسر ابن کنول: ایک مشفق استاد کی باتیں اور یادیں	ڈاکٹر یامین انصاری	۷۷
پروفیسر ابن کنول: ایک بے مثال استاد، لاثانی شخصیت	ڈاکٹر محمد شمس الدین	۷۹

مخلص استاد پروفیسر ابن کنول	ڈاکٹر سدھارتھ سدیپ	۸۱
افسانہ نگاری		
ابن کنول کی کہانیوں میں داستانوی اثرات	ڈاکٹر محمد ارشد ندوی	۸۳
ابن کنول کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر عمران احمد	۹۲
افسانہ ''پہلا آدمی'' ایک تجزیہ	عبیدالرحمن نصیر	۹۸
ابن کنول کا افسانہ ''بند راستے'' کا تنقیدی مطالعہ	وجے کمار	۱۰۲
انشائیہ نگاری		
بساط نشاط دل: ایک جائزہ	پروفیسر فاروق بخشی	۱۰۵
خاکہ نگاری		
پروفیسر ابنِ کنول بحیثیت خاکہ نگار	ڈاکٹر محمد سراج اللہ تیمی	۱۱۱
ابن کنول بحیثیت خاکہ نگار	ڈاکٹر شاہد اقبال	۱۲۳
''کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی'' خاکوں کا گنجینۂ گوہر	ابراہیم افسر	۱۲۶
سفرنامہ نگاری		
پروفیسر ابن کنول کے سفرناموں کا تجزیاتی مطالعہ	محمد یوسف	۱۳۸
ابن کنول کا سفرنامہ چار کھونٹ	آفاق حیدر	۱۴۵
پروفیسر ابن کنول کی سفرنامہ نگاری	ڈاکٹر محمد عامر	۱۵۲
ڈرامہ نگاری		
ابن کنول کا ڈرامہ ''خواب'': ایک تنقیدی مطالعہ	ڈمپلا دیوی	۱۶۲
اعتراف		
داستانوی رنگ و آہنگ کا تخلیق کار: ابنِ کنول	پروفیسر آفتاب احمد آفاقی	۱۶۵
پروفیسر ''ابن کنول'' اردو ادب کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد طالب انصاری	۱۷۰
ابن کنول: ادبی خدمات	ڈاکٹر عبدالرّحمٰن	۱۷۶
ابن کنول: اردو ادب کا ایک روشن باب	تنویر احمد	۱۸۲
پروفیسر ابن کنول: تعلیمی خیالات اور ادبی خدمات	سونو رجک	۱۸۷
ابن کنول کی شخصیت اور ادبی خدمات	ڈاکٹر محمد شاہد زیدی	۱۹۵
اخبارات کے تراشے		
اخباروں کے تراشے		۲۰۱

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

استادمحترم پروفیسر ابن کنول کی زندگی میں ہی ان کی حیات وخدمات پر مشتمل ایک کتاب مرتب کرنے کا ارادہ تھا۔قلم کاروں سے ان کی ادبی خدمات پر لکھنے کی گزارش بھی کی تھی۔میری خواہش تھی استادمحترم کو ریٹائرمنٹ کے وقت اس کتاب کی شکل میں ایک یادگار تحفہ دیا جائے۔کئی احباب نے مضامین بھی ارسال کیے تھے لیکن ان کے ریٹائرمنٹ تک اس سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔اس لیے بروقت کتاب منظرعام پر نہیں آسکی۔

11 فروری 2023 کو ان کی اچانک موت کی خبر نے پوری ادبی دنیا کو غم والم کی کیفیت سے دوچار کردیا۔میرے لیے یہ صدمہ اتنا بڑا تھا کہ کئی دنوں تک دماغ کچھ سوچنے اور سمجھنے کی حالت میں نہ تھا۔دل کسی صورت یہ حقیقت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھنے والا استاد اس طرح اچانک ہم سے رخصت ہوجائے گا۔لیکن موت ایک حقیقت ہے۔ اس حقیقت کے آگے سرتسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

ابن کنول اپنے شاگردوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ان کے شاگرد بھی ان سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگردوں نے ایک واٹس ایپ گروپ بنایا جس نے تمام شاگردان ابن کنول کو ایک پلٹ فارم پر جمع کردیا۔اسی گروپ میں مشورہ کے بعد اردو ریسرچ جرنل کے اس خصوصی شمارے کا خاکہ تیار کیا گیا۔کتاب مرتب کرنے کا خیال اس لیے ترک کرنا پڑا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے پروفیسر محمد کاظم صاحب کی نگرانی میں ایک کتاب مرتب کرنے کا اعلان پہلے ہی کردیا ہے۔امید کی جاتی ہے کہ جلد ہی یہ کتاب منظرعام پر آجائے گی۔

پروفیسر ابن کنول اردو ریسرچ جرنل کے بانی تھے۔انھیں کے مشورہ اور سرپرستی میں اس رسالے کا پہلا شمارہ 2014 میں شائع ہوا تھا۔وہ اس رسالے کی ترقی کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہتے تھے۔ان کی محنت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مغربی بنگال آنے کے بعد بھی رسالہ تیار کرنے بعد اس کی پی ڈی ایف کاپی میں ای میل کے ذریعہ انہیں بھیجتا تھا۔وہ ایک ایک مضمون کو پڑھتے تھے۔دوسرے یا تیسرے دن فون کرتے اور حکم دیتے کہ کاپی قلم لے کر بیٹھو اور جو جو نکات میں بول رہا ہوں نوٹ کرلو۔اگر کوئی مضمون غیر معیاری ہوتا تو اس کو نکالنے کو کہتے۔مضامین کو مرتب کرتے وقت سینئر قلم کاروں کو پہلے رکھنے کو کہتے۔اگر کہیں املا کی غلطی ہوتی تو اس کی اصلاح کرتے۔ان کے بتائے طریقے کے مطابق رسالے کو مرتب کرنے کے دوبارہ بھیجتا تھا۔جب انہیں اطمینان ہوجاتا تو شائع کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ اس رسالے کے ساتھ میرا نام جڑا ہے اس وجہ سے اس کو معیاری بنانا میری ذمہ داری ہے۔پچھلے شمارے کو میں نے جب انہیں ای میل کیا تو ان کا جواب آیا "ٹھیک ہے۔" میں نے یہ سمجھ کر کہ سر نے اس کو شائع کرنے کو کہہ دیا ہے، رسالے کو شائع کردیا۔بعد میں حسب معمول جب انہوں نے کاپی قلم لے کر بیٹھنے کو کہا تو میں نے انہیں اطلاع دی کہ رسالہ تو شائع ہوگیا ہے۔میں نے انہیں بتایا کہ آپ نے ہی کہا تھا کہ

ٹھیک ہے۔" وہ ہنسنے لگے۔ کہنے لگے کہ میں نے ای میل ملنے کی اطلاع دی تھی۔ کہنے لگے کہ اگر شائع کر دیا ہے تو رہنے دو، صرف ترتیب میں پھیر بدل کرنا تھا۔

ابن کنول سر سے متعلق یادیں ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ 2008 کی بات ہے، میں نے شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی میں ایم اے سال اول میں داخلہ لیا تو اساتذہ کرام کی فہرست میں ابن کنول کا نام دیکھ کر میں نے انہیں ایک غیر مسلم استاد سمجھا۔ بعد میں اکمل بھائی نے بتایا کہ وہ بھی مسلمان ہیں۔ بلکہ صوم وصلاۃ کے بھی پابند ہیں۔ ایم اے اور ایم فل تک ان سے زیادہ شناسائی نہیں تھی۔ بس ایسے ہی سلام دعا کی حد تک۔ ایم فل میں نے پروفیسر توقیر احمد خان کی نگرانی میں کیا تھا اس لیے ارادہ تھا کہ پی ایچ ڈی بھی انہیں کی نگرانی میں کروں گا۔ لیکن حالات کچھ ایسے بنے کہ مجھے ابن کنول صاحب کے پاس آنا پڑا۔ ہوا یہ کہ مجھے یونی ورسٹی کی طرف سے ایک فیلوشپ (یو ٹی اے) ملا تھا جس کی شرائط میں شامل تھا کہ ایک سال کے اندر ہی پی ایچ ڈی میں داخلہ لینا ہے۔ توقیر صاحب کے پاس سیٹ خالی نہیں تھی اس کے باوجود وہ مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن جب ڈیڈ لائن ختم ہونے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تو انہوں نے بھی یہ سوچ کر کہ کہیں فیلوشپ ضائع نہ ہو جائے مجھے کسی بھی استاد کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت دے دی۔ ابن کنول سر نے جب یہ کیفیت سنی تو اکمل بھائی سے کہہ کر مجھے اپنے پاس بلوایا۔ پوچھا کہ میری نگرانی میں پی ایچ ڈی کرو گے؟ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں نے کہا کہ سر یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔ یہاں طلبا آپ کی سرپرستی کا خواب دیکھتے ہیں۔ مجھے تو بنا مانگے مل رہا ہے۔ خیر، سر نے میری فائل منگائی، ساتھ میں چل کر ڈین آفس گئے اور ضروری کاروائیاں مکمل کیں۔ داخلہ کی پوری کاروائی سر کی کوششوں سے اسی دن مکمل ہوگئی۔ اس کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ انھوں نے مجھے گود لے لیا ہے۔ ابن کنول سر کی خاص بات یہ تھی کہ ان کے قریبی شاگردوں میں سے ہر ایک کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ اسی کو عزیز رکھتے ہیں۔

ابن کنول سر اپنے طلبا کو ہمیشہ آگے دیکھنا چاہتے تھے۔ دہلی اور اس کے آس کہیں بھی سیمینار یا وائیوا کے سلسلے میں جانا ہوتا ساتھ میں لے جاتے۔ سیمیناروں میں کوشش کرتے کہ میں بھی مقالہ نگار کی حیثیت سے شامل رہوں۔ سر کے ساتھ جے این یو، جامعہ اور علی گڑھ کتنی مرتبہ جانا ہوا یاد نہیں۔ انہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تعریف کر کے حوصلہ افزائی کرنے کا ہنر آتا تھا۔ وائیوا کے لیے جاتے تو کہتے کہ تحقیقی مقالہ کو پڑھ کر بنیادی سوالات قائم کرو۔ جو سوال بھی تیار کرتا اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے۔ اسی بہانے وہ طلبا کی تربیت کیا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں ان کے افسانوں پر لکھ رہا تھا تو دہلی یونی ورسٹی کے راستے میں ان کے افسانوں کے بارے میں برابر پوچھتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ انہیں شک ہوا، کہنے لگے کہ کچھ لکھ رہے ہو کیا؟ میں کام مکمل ہونے سے پہلے سر کو بتانا نہیں چاہتا تھا اس لیے گول مول سا جواب دیا کہ آج کل آپ کے افسانے پڑھ رہا ہوں۔ کچھ دنوں کے بعد جب ان کے افسانوں پر لکھ چکا تو انہیں ای میل کیا اور کہا کہ سر یہ ایک مضمون ہے، آپ دیکھ لیں۔ دس منٹ کے اندر ہی سر کا فون آیا۔ خوشی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ یہ تو مکمل کتاب ہے۔ میں نے کہا کہ جی سر، کتاب ہی لکھنے کا ارادہ تھا۔ سر نے کہا کہ دوسرے مضامین میں آپ کی اصلاح کر دیا کرتا ہوں لیکن یہ کتاب چوں کہ میرے افسانوں پر ہے اس لیے اس پر اصلاح کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کو شائع کرو اور نہ ہی اس کو شائع کرنے سے روک سکتا ہوں۔ آپ جو مناسب سمجھیں کریں۔ سر کی یہ اصول پسندی مجھے اچھی معلوم ہوئی۔ یہی کتاب میں

تے"ابن کنول بحیثیت افسانہ نگار" کے نام سے شائع کی۔ابن کنول پر یہ پہلی مکمل کتاب ہے۔

لاک ڈاؤن میں انہوں نے خودکوتصنیف وتالیف کے لیے وقف کردیا۔اس درمیان انہوں نے زیادہ تر خاکے اورانشائیے لکھے۔وہ جب بھی انشائیہ یا کسی شخصیت پر خاکہ لکھتے اس کو پڑھنے کے لیے بھیجتے، میری رائے لیتے۔ایک طالب علم اپنے استاد کو کیا رائے دے سکتا ہے۔میں پسندیدگی کا اظہار کرتا اور بس۔میں نے مشورہ دیا کہ خاکوں اورانشائیوں کو ریکارڈ کرکے یوٹیوب میں ڈال دیا جائے توان کی پہنچ بڑھ جائے گی۔انہوں نے مشورہ مانا اوراس کے بعداردو ریسرچ جرنل کے یوٹیوب چینل کا لاگ ان پاس ورڈ ان کے پاس رہتا تھا۔کوئی بھی خاکہ لکھتے تواس کو یوٹیوب پر ڈال دیتے تھے۔ابتدا میں ان ویڈیو کو میں ایڈیٹ بھی کرتا تھا لیکن بعدان کو اسی حالت میں رکھا جانے لگا اس لیے کہ ان کی قرات کا انداز اتنا اچھا اورنرالا ہوتا تھا کہ پوری ریکارڈنگ میں کہیں کٹ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔

جب میں نے ذاکرنگر میں رہائش اختیار کی توسر نے اپنی گاڑی میں دہلی یونی ورسٹی چلنے کو کہا۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ یونی ورسٹی کی لائبریری سے مستقل استفادہ کا موقع ملا اور پی ایچ ڈی کے مقالے کو وقت سے پہلے تین سال میں ہی جمع کرسکا۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ سرا پنی گاڑی کے ساتھ جامعہ کے گیٹ پر پہنچ جاتے اور میں ابھی گھر سے نکلا بھی نہیں ہوتا۔ایسے موقع پر میں سر سے کہتا کہ آپ انتظار نہ کریں میں بس سے آجاؤں گا۔آپ کا جواب ہوتا، کوئی بات نہیں میں یہیں گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرتا ہوں۔کئی دفعہ ان کو میری وجہ سے بیس منٹ تک انتظار کرنا پڑا لیکن آپ کی پیشانی پر ذرا بھی شکن نہیں آتی۔شرمندگی کی وجہ سے میں کچھ دیر تک خاموش رہتا۔پھر ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لیے وہ خود ہی کوئی موضوع چھیڑ دیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ عزیز تم بہت خوش قسمت ہو،تمہیں جتنے فیلوشپ ملے، شاید ہی کسی کو ملے ہوں۔یو ٹی اے اور جے آر ایف ساتھ ساتھ ملا۔اس کے بعد فوراً ہی دیال سنگھ کالج میں گیسٹ کے طور پر لگ گئے۔اسی درمیان پوسٹ ڈاکٹورل فیلوشپ بھی مل گئی ہے۔اس درمیان معاش کے لیے کبھی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔میں نے کہا کہ میری سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ آپ استاد کی شکل میں ملے۔اگر میں آواگون (پنرجنم) کا قائل ہوتا تو یہی کہتا کہ میں نے پچھلے جنم میں کچھ اچھا کیا ہوں گا جس کی وجہ سے آپ کی صحبت نصیب ہوئی۔

میں ان خوش قسمت شاگردوں میں سے ہوں جن پر وہ بھروسہ کیا کرتے تھے۔انتقال سے کچھ دنوں پہلے انہوں نے فون کیا اور کہنے لگے کہ میں نے اپنے والد کنول ڈبائیوی کی تقریباً تمام تحریروں کو شائع کردیا ہے۔لیکن اب بھی کچھ چیزیں غیر مطبوعہ شکل میں میرے پاس ہے۔ انہیں میں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔میری زندگی کا کیا؟اب اس وراثت کو تم سنبھالو۔میں نے کہا کہ سر! یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں لیکن ان کو آپ ہی اگر شائع کروائیں تو بہتر ہوگا۔اس سلسلے میں تعاون کے لیے تیار ہوں۔کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی جلدی رخصت ہوجائیں گے۔

لاک ڈاؤن میں وہ خود بھی تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے اور اپنے شاگردوں کو بھی اس موقع کا فائدہ اٹھانے کو کہتے تھے۔ اس دوران انہوں نے مجھے ایک علمی کام کرنے کو کہا۔یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔دو ہفتے بعد انہوں نے کام کی کیفیت دریافت کی۔میں نے شرماتے ہوئے کہا کہ ابھی کام مکمل نہیں ہوا ہے۔انہوں نے پہلی بار اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے" کہا میں آپ کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں لیکن نوکری کے بعد اگر سست ہوجاؤ گے تو کیسے کام چلے گا؟" دراصل میں اس دوران اپنی

کتاب منتخب نصاب مرتب کرنے میں لگا ہوا تھا۔ادب کی وجہ سے میں ان سے یہ بات کہہ نہیں سکا۔ کچھ دنوں بعد جب یہ کتاب مکمل ہوگئی تو میں نے اس کتاب کا انتساب پروفیسر ابن کنول کے نام سے کیا۔انتساب کی عبارت تھی"مثالی استاد پروفیسر ابن کنول کے نام"۔ کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ اگر آپ کسی علمی کام میں مصروف تھے تو بتانا چاہئے تھا۔ کہنے لگے کہ"مثالی"کا لفظ ہٹا دو۔

11 فروری کو ان کے موت کی خبر کی سن کر ایسا محسوس ہوا کہ میں یتیم ہوگیا۔ یہی تاثرات ان کے دوسرے شاگردوں کے بھی تھے۔ادبی دنیا نے اردو کا ایک بڑا ادیب کھویا لیکن ہم جیسے شاگردوں نے اپنا مشفق مجازی باپ کھویا ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں!

اس شمارے میں ابن کنول کی شخصیت اور ادبی خدمات پر کئی اہم قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں۔ کچھ منظوم تاثرات بھی ہیں جن کو اس میں شامل کرلیا گیا ہے۔اس شمارے میں برقی اعظمی کی بھی ایک نظم شامل ہے جو انہوں نے میری گزارش پر لکھ کر دیا تھا۔اس نظم کو بھیجنے کے کچھ ہی دنوں بعد 5 دسمبر 2022ء کو وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میری گزارش پر ان کے بچپن کے دوست ڈاکٹر اسلم حنیف نے اپنا قیمتی مضمون بھیجا جس کے لیے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔ابن کنول سے ان کی ادبی زندگی کی ابتدا کے بارے میں اکثر ان کا نام سنتا تھا۔اس کے علاوہ ان کے دوستوں میں پروفیسر صغیر افراہیم، صابر گودڑ، پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی وغیرہ کے مضامین اس رسالے کی زینت ہیں۔

ابن کنول ہمیشہ اپنے شاگردوں کے لیے فکر مند رہا کرتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اپنی فیملی کا حصہ مانتے تھے۔آج وہ ہمارے درمیان نہیں۔لیکن انہوں نے جو اعلی اقدار ہم سب کو سکھایا ہے وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ یہ شمارہ ہماری طرف سے ایک مثالی استاد کے لیے پرخلوص نذرانہ ہے۔

چونکہ یہ ایک خصوصی نمبر ہے اس وجہ سے جرنل کی پالیسی کے برخلاف اس میں کچھ مطبوعہ مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شمارہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ اس میں ابن کنول سے متعلق ضروری مضامین کو یکجا کردیا جائے اور ابن کنول کی زندگی اور ادبی کارناموں کا ایک خاکہ تیار ہوجائے تاکہ آنے والے دنوں میں ان پر کام کرنے والوں کو کوئی پریشانی نہ ہو۔میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا؟ آپ لوگ اپنی رائے سے نوازیں۔

رہے نام اللہ کا

والسلام

عزیر اسرائیل

ایڈیٹر اردو ریسرچ جرنل

قلمی چہرہ: پروفیسر ابن کنول

ڈاکٹر شفیع ایوب
سی آئی ایل، جے این یو، نئی دہلی۔110067
shafiayub75@rediffmail.com
Mob. 9810027532

جنت مکانی حضرت کنول ڈبائیوی کے پسر ہیں۔ ہر ظلم سے لڑنے کو سینہ سپر ہیں۔ انھیں اردو افسانے کا تاج محل کہتے ہیں۔ یعنی ناصر محمود کمال کو ابن کنول کہتے ہیں۔ سر پہ بال ذرا کم، آنکھوں میں چمک زیادہ ہے۔ آواز میں رعب، لہجے میں خنک زیادہ ہے۔ درمیانہ قد، گندمی رنگت، آنکھوں میں ذہانت۔ چال میں قیامت۔ متانت وشوخی کا حسین امتزاج۔ ادا دلفریب، نگہہ دلنواز۔ حاضر جوابی میں کوئی جواب نہیں رکھتے۔ جھٹ سے کہہ دیتے ہیں، حساب نہیں رکھتے۔ باز ہیں، یہ نہ سمجھو کہ فاختہ ہیں۔ چمن سرسید کے تربیت یافتہ ہیں۔ جھپٹتے ہیں، پلٹتے ہیں، پلٹ کر وار کرتے ہیں۔ ہر یزید وقت کی بیعت سے انکار کرتے ہیں۔ فرعونِ وقت پر یلغار کرتے ہیں۔ یہ کام فقط صاحب کردار کرتے ہیں۔ اپنے طلبہ کے لئے اک شجر سایہ دار ہیں ابن کنول۔ دوستوں کے لئے بہت دلدار ہیں ابن کنول۔ یاران نکتہ داں کے لئے جان حاضر ہے مگر۔ منافقوں کے لئے تلوار ہیں ابن کنول۔ حاکمانِ وقت کو خاطر میں نہیں لاتے مگر، اپنے چھوٹوں سے جھک کر ملتے ہیں۔ یوں تو ہر لباس جچتا ہے مگر، شیروانی میں خوب کھلتے ہیں۔ گفتگو سن لیں تو لگتا ہے، بہت کچھ دل کے اندر ہے۔ وہ علم کا دریا نہیں، سمندر ہے۔ کبھی سنئے کی تقریر میں کیا روانی ہے۔ موضوع بھی پانی پانی ہے۔

علم وادب کی محفل میں ابن کنول۔ جیسے ذہن شاعر میں تازہ غزل۔ تدریسی فرائض میں چاک چوبند۔ ہمیشہ وقت کے پابند۔ جس نے کیا ہو داستان سے ناول تک سفر۔ وہی رکھتا ہے داستانوں پہ گہری نظر۔ وہ ذہن میں بوستان خیال رکھتا ہے۔ داستانوی ادب میں کمال رکھتا ہے۔ تحقیق کی کتنی منزلوں سے سرخرو آیا۔ دریائے ادب کا شناور تھا، گہر بھی ساتھ لایا۔ ابنِ کنول شاعر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں۔ خوابیدہ قوم کو جگانے والے خطیب بھی ہیں۔ شاعری میں گل وبلبل کی کہانی نہیں کہتے۔ ایک تھا راجہ، ایک تھی رانی نہیں کہتے۔ زندگی کے ہر زخم کو موضوع سخن بنایا ہے۔ بڑی محنت سے اک معیارِ فکر وفن بنایا ہے۔ شعر کی تہذیب نبھاتے ہیں، لیکن دنیا کے حالات بھی لکھتے ہیں۔ ذکرِ قبائے گل بھی کرتے ہیں، کڑوی کسیلی بات بھی لکھتے ہیں۔ باشعور بھی ہیں، ذہین بھی ہیں۔ فکرِ اسلامی کے امین بھی ہیں۔ صالح قدروں کے طرفدار بھی ہیں۔ فکرِ نو کے علمبردار بھی ہیں۔ بزرگوں کی وراثت پہ ناز بہت ہے۔ فکر کی بلندی ہے، تخیل کی پرواز بہت ہے۔

انسانیت کا نوحہ جس کی ہر کہانی ہے۔اسلوب دلکش ہے،رنگ داستانی ہے۔یہ شخص انسانی درندوں کی کہانی لکھ رہا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں داستان پرانی لکھ رہا ہے۔یہاں چپ ہیں سب سپاہی،فقط سردار بولتے ہیں۔مگر ان کے افسانوں میں کردار بولتے ہیں۔مختصر افسانوں میں درد کا اک دریا بہاتے ہیں۔بے رحم سماج کو بس آئینہ دکھاتے ہیں۔

داستانوں سے پُر اسراریت، ناولوں سے زندگی کی حقیقت لی ہے۔فکر اسلامی سے شان طریقت لی ہے۔افسانوں سے اختصار کا ہنر پایا۔اسلاف سے تہذیب کا لعل و گہر پایا۔درس و تدریس سے شان قلندری پائی۔شخصیت کو بھاتی ہے ادائے کج کلاہی۔اردو تہذیب سے ادائے دلربائی لی ہے۔گنگا کی موجوں سے پارسائی لی ہے۔گھر کے بزرگوں سے کچھ طرز ڈبائی لی ہے۔ تب جا کے اسلوب کنول نے انگڑائی لی ہے۔

عملاً سیاست سے دور بہت ہیں۔نالہ آتا ہے مگر لب پہ تو مجبور بہت ہیں۔عموماً عزیزوں کا لحاظ و پاس رکھتے ہیں۔حق پرستوں کا خیالِ خاص رکھتے ہیں۔مگر جب بات صداقت کی،حق گوئی کی آجائے۔تو کس میں ہمت ہے جو ابن کنول کو روک پائے۔چھوٹوں کی مدد کرتے ہیں،اپنے شاگردوں کے لئے اشک بار بھی ہوتے ہیں۔سخن فہم تو ہیں پر غالب کے طرفدار بھی ہوتے ہیں۔عاجزی ایسی کہ طفلانِ مکتب کو سر پہ بٹھا لیتے ہیں۔انا ایسی کہ شاہِ وقت کو نظروں سے گرا دیتے ہیں۔دل جو مائل ہو تو دشمن کو سینے سے لگا لیتے ہیں۔ضد پہ آجائیں تو اچھے اچھوں کو ہوا میں اُڑا دیتے ہیں۔

کائنات ابن کنول بہت حسین ہے۔آپ کے احباب کی دنیا بڑی رنگین ہے۔آپ کے احباب میں صوفی بھی ہیں،زاہد بھی،رند بھی،گنہگار بھی ہیں۔آپ کے اساتذہ میں قاضی بھی ہیں،شہریار بھی ہیں۔دوست کچھ دور چلے گئے،کچھ بہت پاس ہیں۔ یاروں میں فرحت احساس تو اساتذہ میں اصغر عباس ہیں۔آپ کے سر پہ سجی ہے علم کی دستار۔کہ آپ کے استاد ہیں قاضی عبد الستار۔کتاب زیست میں اک مکمل باب افسانہ نگاری کا ہے۔آپ کے احباب میں اک محترم نام طارق چھتاری کا ہے۔صلاح الدین پرویز،اسعد بدایونی اور آشفتہ چنگیزی نے اب بہت دور اپنی دنیا بسالی ہے۔مگر ابن کنول نے دل کے ویرانے میں ان کی یادوں کی اک محفل سجالی ہے۔ان کی یادوں میں پیغام آفاقی بھی بستے ہیں۔وہ یاران دل نشیں کو خوب سمجھتے ہیں۔حلقہ ارادتمنداں میں کاظم و شفیع خوش نصیب رہتے ہیں۔''ڈار سے بچھڑے'' ایس ایم اشرف دلّی سے دور،دل کے قریب رہتے ہیں۔غیاث الرحمٰن و غضنفر پاس پاس رہتے ہیں۔ذرا دور نوئیڈا میں فرحت احساس رہتے ہیں۔دوست سب،دُھن کے پکّے،ارادے کے قوی۔جیسے علی گڑھ میں مہتاب حیدر نقوی۔اہل خانہ میں صبیحہ ساغر نے زندگی کے پیمانے کو بھر دیا۔ذہن ابن کنول کو منور کر دیا۔ پاک طینت،پاک باطن شریک سفر نے زندگی آسان کر دیا۔سفر میں خوشیوں کا سب سامان کر دیا۔اریبہ اور زیانہ۔بن گئیں خوشیوں کا بہانہ۔عائش کمال کا جذبہ۔پیاری بہن ہوا ریشہ اور عذبہ۔لمحے زندگی کے مزید مسرت آمیز ہو گئے۔عزیز از جان ایمن ابن اسلم پرویز ہو گئے۔

کبھی وہ ''کچے گھڑے'' سے دریا پار کرنے کی ''آخری کوشش'' کرتے ہیں۔کبھی ''شام ہونے سے پہلے'' گھر پہنچنے کو

لمبے ڈگ بھرتے ہیں۔ابن کنول ہیں،''ابن آدم'' کو''سراب'' سے بچاتے ہیں۔''داؤدخاں'' کو''سوئٹ ہوم'' کا''خواب'' دکھاتے ہیں۔وہ''اشرف المخلوقات'' سے''اجتہاد'' کی بات کرتے ہیں۔''ہمارا تمہارا خدا بادشاہ'' کے ذریعے اتحاد کی بات کرتے ہیں۔''بند راستے'' ہیں، کیسے کوئی پرندہ آئے گا۔انھیں''خدشہ'' ہے کہ کوئی''نیا درندہ'' آئے گا۔وہ جانتے ہیں کہ''ریٹا ئرمنٹ'' میں''صرف ایک شب کا فاصلہ'' ہے۔لیکن''واپسی'' نہیں کرنی کہ ان میں بہت حوصلہ ہے۔یہ سوچ کر وہ اداس لگتے ہیں۔کیوں''تیسری دنیا کے لوگ''''فورتھ کلاس'' لگتے ہیں۔ہر''دوسرا پاگل'' کسی''چھوٹی آپا'' کو تنگ کرتا ہے۔کوئی''کینسر وارڈ'' میں زندگی سے جنگ کرتا ہے۔ ''بولومت''''خوف'' کی گھڑی ہے۔ سامنے''تیسری لاش'' پڑی ہے۔جو''وارث'' تھے،سرفروش جارہے ہیں۔''گھر جلا کر''''خانہ بدوش'' جارہے ہیں۔اب بھی''لکڑ بگھا زندہ ہے'' وہ معصوم کدھر جائے۔''ایک ہی راستہ ہے''''مٹی کی گڑیا'' مرجائے۔رسم دنیا کا سمّان نہیں کرتے؟''سپر اسٹار'' تھے تو کیا''کنیا دان'' نہیں کرتے؟ کیا، رسموں کا سمّان کیا۔''صرف ایک دن کے لئے'' سب کو مہمان کیا۔سب کا انتظام کرتے ہیں۔چھوٹے بڑوں کا احترام کرتے ہیں۔خدا عمر دراز کرے۔دین و دنیا میں سرفراز کرے۔آمین۔

(بتاریخ: 23فروری) 2019

☆☆☆

ایک دن یوں ہوا کہ جب میں تنہائی میں بیٹھا لکھ رہا تھا میرا بیٹا میرے پاس آیا اور کہنے لگا:

''ابّا آپ ہر وقت کیا لکھتے ہیں؟''

میں نے اس معصوم کی طرف دیکھا اور کہا:

''میں کہانی لکھ رہا ہوں''

''کہانی؟''اس نے چونک کر کہا''کہانی تو چڑیا اور چڑے کی ہوتی ہے۔جو نانی ماں سناتی ہیں۔کیا آپ چڑیا اور چڑے کی کہانی لکھ رہے ہیں؟''

''نہیں میں شیر اور آدمی کی کہانی لکھ رہا ہوں۔شیر جو آدمی سے ڈرتا ہے۔''

(میں کیوں لکھتا ہوں-ابن کنول)

ابن کنول حیات اور ادبی خدمات

مرتب: عزیر احمد

ایڈیٹر اردو ریسرچ جرنل

اصل نام: ناصر محمود کمال

قلمی نام: ابن کنول

والد: معروف قومی شاعر قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی

تاریخ ولادت: 15/ اکتوبر 1957 (بہجوئی ضلع مرادآباد)

تاریخ وفات: 11 فروری 2023، علی گڑھ

ابتدائی تعلیم: گنور (بدایوں) کے ایک اردو میڈیم اسلامیہ اسکول میں۔

مزید تعلیم: مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ (1967 سے 1978 تک)

ایم فل (اردو)، پی ایچ ڈی: دہلی یونی ورسٹی، دہلی (1978-1984)

ملازمت: 1985 تا 31 اکتوبر 2022 شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

کتابیں:

1۔ تیسری دنیا کے لوگ (افسانے) 1984

2۔ بند راستے (افسانے) 2000

3۔ ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں 1988

('بوستال خیال ایک مطالعہ' کے نام سے 2005 میں دوبارہ شائع ہوئی)

4۔ ریاض دلربا (اردو کا پہلا ناول) (تحقیق) 1990

5 آؤ اردو سیکھیں (قاعدہ) 1993

6۔ داستان سے ناول تک (تنقید) 2001

7- انتخاب سخن (اردو شاعری کا انتخاب) 2005

8۔ منتخب غزلیات 2005

9۔ منتخب نظمیں 2005

10۔ اصناف پارینہ (قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ) 2005

11۔تنقید وتحسین (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2006

12 تحقیق وتدوین (ترتیب) 2007

13۔میرامن (مونوگراف) 2007

14۔باغ وبہار (مقدمہ ومتن) 2008

15۔پہلے آپ (ڈرامہ) 2008

16۔نظیر اکبرآبادی کی شاعری 2008

17۔مضراب (کنول ڈبائیوی کا کلیات معہ مقدمہ) 2010

18۔اردو افسانہ (افسانوی تنقید) 2011

19۔پچاس افسانے (افسانوی مجموعہ) 2014

20۔تنقیدی اظہار 2015

21۔فسانۂ عجائب (مرتبہ) 2016

22۔اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (کنول ڈبائیوی کی تحقیق) مرتبہ 2014

23۔اھل الکہف (افسانے)، عربی مترجم: احمد القاضی، مصر 2018

24۔اردو شاعری (تنقید)، 2019

25 ۔داستان کی جمالیات، 2020

26۔بزم داغ (ڈرامے)، 2020

27۔کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی (خاکے)، 2020

28۔الحلم (افسانے)، عربی مترجم: احمد القاضی، مصر 2020

29۔تبریک (تقاریظ)، 2021

30۔بساط نشاط دل (انشائیے)، 2021

31۔داغ دہلوی ڈرامہ 2022

32۔مذہب عشق 2022

33۔چاکھونٹ (سفرنامہ)

چند اہم غیر ملکی اسفار:

امریکہ، ماریشس، انگلینڈ، پاکستان اور روس کے عالمی سمیناروں میں اردو کی نمائندگی کی ہے۔

انعامات و اعزازات:

1۔سرسید ملینیم ایوارڈ، دہلی برائے اردو فکشن 2001 ڈاکٹر منموہن سنگھ نے پیش کیا۔

2۔ ہریانہ اردو اکادمی کا کنور مہیندر سنگھ ایوارڈ برائے ادبی خدمات 2007۔ گورنر ہریانہ جناب اخلاق الرحمان قدوائی کے ہاتھوں ملا۔

3۔تیسری دنیا کے لوگ ، ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں، داستان سے ناول تک، بند راستے ،تنقید وتحسین اور اردو افسانہ پراتر پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، اور مغربی بنگال اردو اکادمی نے انعامات سے نوازا۔

4۔افسانہ بند راستے پر 1979 میں دہلی یونی ورسٹی نے کٹھپالیا گولڈ میڈل دیا۔ جسے سابق نائب صدر جمہوریہ جناب بی۔ڈی۔جُٹی نے اپنے ہاتھوں پیش کیا۔

5۔دہلی اردو اکاڈمی فکشن ایوارڈ 2008

6۔عبدالغفور نساخ ایوارڈ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ 2017

7۔ملک زادہ منظور احمد اودھ رتن ایوارڈ برائے 2019-2020

7۔غالب ایوارڈ برائے اردو نثر 2022

ابن کنول (پروفیسر ناصر محمود کمال) کی پیدائش ضلع مرادآباد کے قصبہ بجوئی میں ایک زمیندار خاندان میں ہوئی۔تاریخ پیدائش 15۔اکتوبر 1957 ہے۔والد محترم مشہور قومی شاعر قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی تھے۔ان کے اجداد شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور قاضی کے عہدے سے نوازے گئے حکومت کی طرف سے جاگیریں دی گئیں۔بعد میں آپ کے بزرگ قصبہ ڈبائی میں آکر رہائش پذیر ہوگئے۔آپ کا خاندان علمی وادبی سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔دادا قاضی شریعت اللہ (متوفی 1930) ایک قابل وکیل تھے۔پردادا قاضی ادہم علی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔

قصبہ ڈبائی علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔اس قصبے نے اردو ادب کو کئی اہم شخصیات دی ہیں۔وفاؔ ڈبائیوی، دعاؔ ڈبائیوی، انتظار حسین، منیب الرحمان اور ندؔا فاضلی جیسے اکابرین علم وفن اسی قصبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔آزادی سے پہلے یہاں علمی وادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں ہر طبقہ کو لوگ شوق سے شامل ہوا کرتے تھے۔مشاعروں سے سبھی مذاہب کے لوگ لطف لیا کرتے تھے۔بعد میں ان میں سے اکثر پاکستان چلے گئے یا علی گڑھ اور دوسرے شہروں میں منتقل ہوگئے۔

اان کے والد کنول ڈبائیوی کی شاعری وطن کی محبت کے جذبے سے معمور ہے۔وہ ایک سچے محب وطن تھے۔ان کی شاعری اس کا نمونہ ہے۔ان کی شاعری کے دو مجموعے ''بساط زیست'' اور ''سوز وطن'' اور ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے۔حال ہیں میں ان کی شاعری کو ایک کلیات کی شکل میں پروفیسر ابن کنول نے 'مضراب' کے نام سے شائع کیا ہے۔وہ ایک اچھے محقق بھی تھے انہوں نے لوک ناٹک پر بھی کام کیا تھا۔لوک ناٹک پر اردو زبان میں اب تک کوئی کتاب نہیں ہے۔انہوں نے

بڑی محنت سے لوک ناٹک کی تاریخ اور اس فن کے بارے میں تفصیلات فراہم کی ہیں۔ یہ کتاب ابھی اشاعت کے مرحلہ میں ہے۔

کنول ڈبائیوی کی شاعری کو پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین خاں، خواجہ احمد فاروقی، میکش اکبرآبادی اور پروفیسر عبدالحق جیسے مشہور ناقدین فن نے سراہا ہے۔

تعلیم:

ابن کنول نے اپنی ابتدائی تعلیم ضلع بدایوں کے قصبہ گنور میں ایک اسلامیہ اسکول میں حاصل کی۔ اسکول اردو میڈیم تھا۔ آپ 1962 میں پہلی جماعت میں داخل ہوئے آپ کے پہلے استاد حاجی صفدر علی مرحوم تھے۔ پانچویں جماعت کے بعد آپ نے آگے کی تعلیم کے لئے علی گڑھ کا رخ کیا اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے منٹوسرکل اسکول (جو سیف الدین طاہر ہائی اسکول کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) میں داخل ہوئے۔ 1972 میں ہائی اسکول مکمل کرنے کے بعد پری یونی ورسٹی سائنس میں داخلہ لیا۔ آپ بتاتے ہیں کہ والدین میڈیکل کالج میں داخلہ دلانا چاہتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ان کی بھی خواہش تھی کہ ان کا لڑکا بڑا ہو کر ڈاکٹر یا انجینئر بنے۔ مگر بقول ابن کنول پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ بی اے میں اردو بنیادی مضمون قرار پایا اور اس طرح والد کی علمی وراثت کو سنبھالنے کے لئے آپ نے اسی وادی میں قدم رکھا جس کے راہ روان کے والد محترم تھے۔ 1978 میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ایم اے کیا۔ یہاں کی علمی فضا سے بھرپور استفادہ کیا۔ پروفیسر ابن کنول کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں علی گڑھ میں پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر قاضی عبدالستار، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی، پروفیسر شہریار، پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر نعیم احمد اور پروفیسر اصغر عباس جیسے اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ ایم اے مکمل کرنے کے بعد آپ نے دہلی یونی ورسٹی کا رخ کیا۔ اس کے بعد ابن کنول نے دہلی یونی ورسٹی سے اپنا رشتہ اس طرح قائم کیا کہ پھر اس دن سے لے کر آج تک قائم ہے۔ پی ایچ ڈی میں آپ نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نگرانی میں 'بوستان خیال کا تہذیبی ولسانی مطالعہ' کے عنوان سے تحقیقی کام کیا۔ آپ کی یہ کاوش کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔ دہلی میں آپ کو بانیٔ شعبۂ اردو خواجہ احمد فاروقی اور مشہور ترقی پسند نقاد قمر رئیس سے بھی شرف تلمذ حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ادبی نشوونما:

ابن کنول ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد کنولؔ ڈبائیوی ایک قومی شاعر تھے، شعروادب کی خدمت آپ کا مشغلہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کی تربیت میں رہ کر آپ کے ادبی ذوق کو جلا ملی ہوگی۔ ابن کنول کے والد کہا کرتے تھے کہ ہماری زمینداری ہماری اولاد ہے۔ انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ الحمدللہ ان کے سبھی لڑکوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اسکول کے زمانے میں ہی آپ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے لگے تھے۔ آپ کے اسکول کے ساتھی اسلم حنیف شاعری کیا کرتے تھے اور آپ کہانی لکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان سے متاثر ہو کر ابن کنول بھی شاعری میں طبع

آزمائی کرلیا کرتے تھے۔ابن کنول بتاتے ہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی تخلیقات پڑھ کر سناتے اور خوش ہوتے۔ یہ ابتدائی زمانے کی شاعری اور افسانے ظاہر ہے کہ اس معیار کی نہیں ہوتی تھیں کہ انہیں افسانہ یا شاعری میں شمار کیا جاتا۔لیکن کہتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ یہ ابتدائی نگارشات ابن کنول کے مستقبل کے ادبی سفر کی تمہید تھے۔ابن کنول کے ادبی ذوق کو جلا بخشنے میں علی گڑھ کی ادبی وعلمی فضا کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ایم اے میں آپ ''انجمن اردوئے معلیٰ'' کے سکریٹری رہے۔ یہ وہی انجمن ہے جس کی بنیاد مولانا حسرت موہانی نے رکھی تھی۔اسلم حنیف سے متاثر ہوکر ابن کنول نے اس زمانے میں انسان کے چاند پر قدم رکھنے پر پہلی نظم کہی تھی جو ماہنامہ نور رامپور میں شائع ہوئی۔لیکن جلد ہی ابن کنول نے اندازہ لگا لیا کہ ان کا حقیقی میدان افسانہ ہے۔اس وجہ سے آپ نے اپنی توجہ اسی طرف رکھی۔ابتدا میں ناصر کمال کے نام سے افسانے لکھتے تھے۔لیکن 1975 سے ابن کنول کے نام سے افسانے لکھنے لگے۔ابن کنول اصل میں آپ کے والد کی طرف نسبت ہے۔ باقاعدہ افسانہ لکھنے کا آغاز 1972 سے ہوا۔آپ کا پہلا مطبوعہ افسانہ 'اپنے ملے اجنبی کی طرح' ہے جو 1974 میں آفتاب سحر (سکندرآباد) نامی رسالے میں شائع ہوا۔ جب 1973 میں آپ نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا تو قاضی عبدالستار کی سرپرستی مل گئی۔قاضی عبدالستار کے مکان پر ماہانہ نشستیں ہوتی تھی جس میں نوجوان ادیب اپنی نگارشات پیش کیا کرتے تھے اور قاضی عبدالستار اور دیگران پر تبصرہ کرتے تھے۔ان نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں جو لوگ تھے ان میں سے چند اہم نام یہ ہیں: شارق ادیب، سید محمد اشرف، غضنفر، پیغام آفاقی، طارق چھتاری، غیاث الرحمان، صلاح الدین پرویز، آشفتہ چنگیزی، فرحت احساس، اسعد بدایونی، مہتاب حیدر نقوی وغیرہ۔

علی گڑھ میں تعلیم کے دوران آپ کے افسانے ملک کے معروف ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے۔جن میں شاعر، عصری ادب، آہنگ، صبح ادب اور نشانات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ابن کنول نے بتایا کہ 'بندر راستے' جب 1976 میں عصری ادب میں شائع ہوا تو محمد حسن نے اس کی بڑی تعریف کی۔طالب علمی کے زمانے میں اردو کے اس عظیم ناقد سے تحسین کے کلمات کسی سند سے کم نہیں تھے۔

دہلی یونی ورسٹی میں داخل ہونے کے بعد بھی افسانہ نگاری کا سلسلہ برقرار رہا۔ یہاں آکر پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی تربیت میں آپ کے اندر تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتیں پروان پائیں۔

ملازمت:

ابن کنول تعلیم کے زمانے سے ہی ادبی دنیا میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ جہاں آپ نہیں گئے تھے وہاں آپ کا نام پہنچ چکا تھا۔یہی وجہ ہے کہ تعلیمی سلسلہ ختم ہونے کے بعد جلد ہی آپ کو اپنے مادر علمی دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد 1985 میں سی ایس آئی آر کی طرف سے شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ سائنٹسٹ کے طور پر آپ نے اپنی ملازمت شروع کی۔اس کے بعد آپ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔اپنے صلاحیتوں کے بل پر ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔ 1987 سے لے کر 1990 تک شعبۂ اردو ہی میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کی حیثیت سے کام کیا۔اسی دوران جنوری 1990 میں باقاعدہ مستقل لکچرر کے عہدے پر آپ کی تقرری ہوئی۔اس کے بعد سے لے کر اب تک وہ شعبہ میں ایک مستقل استاد کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔آپ 1998 میں ریڈر، اور جنوری 2006 میں ترقی کرتے ہوئے

پروفیسر کے عہدے تک پہنچے۔ پروفیسر ابن کنول صاحب نے دو قسطوں میں کم وبیش ساڑھے سات برس شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبہ رہے۔ پہلی بار 10 اپریل 2005 سے 9 اپریل 2009 تک اور دوسری بار 10 اپریل 2014 تا 30 ستمبر 2018۔

علمی و منصبی حصولیابیوں کے باوجود ابن کنول ایک سادہ زندگی گزارنے کے قائلتھے۔ وہ ایک ملنسار ہنس مکھ انسان تھے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ ان کا معاملہ ایک استاد سے بڑھ کر دوست کا ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ درخت پر پھل آتے ہیں تو اس کی شاخیں جھک جاتی ہیں۔ ابن کنول کی حیثیت بھی ایسے پھل دار درخت کی تھی جس کی شاخیں اپنے شاگردوں اور احباب کے لئے جھکی رہتی تھیں۔

تحقیقی مقالے:

ان کنول کی زندگی ہی میں ان پر کئی ملکی اور غیر ملکی یونی ورسٹیوں میں تحقیقی کام ہوئے ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

ابن کنول بحیثیت افسانہ نگار (ایم فل) مقالہ نگار: عبدالرحمن، نگراں: مسرت جہاں، شعبہ اردو، مولانا آزاد یونی ورسٹی حیدرآباد، سال تکمیل: 2014

ابن کنول کے افسانوں میں سماجی پہلو (بی اے) مقالہ نگار: علی بخش بی بی نوریدہ، نگراں: ڈاکٹر علی محمد آصف، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ، ماریشش، سال تکمیل: 2014

ڈاکٹر ابن کنول کی تحقیقی وتنقیدی خدمات (ایم فل) مقالہ نگار: سعدیہ سرور، رفاہ انٹرنیشنل یونی ورسٹی، فیصل آباد، پاکستان، سال تکمیل: 2015

وفات:

11 فروری 2023 کو وہ پی ایچ ڈی کا وائیوا لینے کے لیے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ گئے ہوئے تھے۔ وائیوا کے بعد قریب دو بجے اپنے بھائی کے مکان کی طرف گئے جہاں انہیں سینے میں شدید درد کی شکایت ہوئی۔ انہیں فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا لیکن راستے ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ علی گڑھ ان کے دل میں بستا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کروں گا۔ اللہ کو شاید یہی منظور تھا۔ پہنچی وہیں پر خاک جہاں کا خمیر تھا۔ دوسرے دن 12 فروری کو ان کے رشتہ داروں، شاگردوں اور چاہنے والوں کی موجودگی میں انہیں علی گڑھ کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆

ابن کنول

برقی اعظمی
جوہری فارم، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو کے ابن کنول ہیں ایسے اک تخلیق کار
جن کو نظم و نثر میں حاصل ہے یکساں اعتبار
گردش حالات پر رکھتے ہیں وہ گہری نظر
ان کے ناول اور افسانوں سے ہے یہ آشکار
ان کی ہے خاکہ نگاری مرجع اہل نظر
ہے جو دنیائے ادب میں باعث صد افتخار
سب کی منظور نظر ہیں ان کی معیاری کتب
شخصیت ہے جس سے ان کی آج فخر روزگار
میرے کہنے پر نہ جائیں آپ خود ہی دیکھ لیں
ہے مشاہیر ادب میں ان دنوں ان کا شمار
ان کے قول و فعل سے ہے جو بخوبی آشنا
شہر دہلی میں پڑوسی ان کا ہے یہ خاکسار
اس سے اقصائے جہاں میں اب سبھی ہیں آشنا
اب مقامی سطح پر ہے بے رخی کا جو شکار
کررہے ہیں اب عزیر احمد جو ان کا تجزیہ
ان کی اس تحقیق کا ہے اب سبھی کو انتظار
قدرداں ان کے محاسن کا ہے برقی اعظمی
جس کی شہرت کا ہے سوشل میڈیا پر انحصار

برقی اعظمی 14 نومبر 2022 بوقت 12.23 شام

ابنِ کنول صاحب

ارشاد احمد ارشاد، دہلی

(مثنوی کی ہئیت میں ایک تعزیتی نظم)

رہا باقی دنیا میں کس کا ہے نام
نہیں ہے کسی کو بھی اس میں کلام
ہمیشہ سے ہے جو رہے گا سدا
قدیم اور باقی وہ ہے کبریا
وہی سب کا خالق ہے مالک وہی
چلے اس کی رہ پر ہے سالک وہی
وہی مارتا ہے جِلائے وہی
بگاڑے وہی اور بنائے وہی
کھلیں پھول گلشن میں ہیں بے شمار
سدا ان کا باقی رہا کب نکھار
کھلے کھل کے بکھرے فنا ہوگئے
وہ خوش بو بھی آخر یہاں کھو گئے
جو آیا ہے دنیا میں ہوگا فنا
رہے گا ہمیشہ ہمیشہ خدا
یہی ہے حقیقت ہے فانی جہاں
نہیں کوئی رہتا ہے باقی یہاں
قضا ساتھ لاتی ہے یہ زندگی
فنا سنگ آتی ہے یہ زندگی
جو آیا ہے دنیا میں وہ جائے گا
مزہ موت کا ہر کوئی پائے گا
یہی اک حقیقت ہے گزری جو کل

ہے جس کی خبر سے گیا دل دہل
وہ ابنِ کنول تھے جو ناصر کمال
قضا لے گئی ہو گیا انتقال
وہ استاد اردو کے ابنِ کنول
گئی لے کے سنگ جن کو اپنے اجل
کسی نے نہ سوچا تھا یوں جائیں گے
کبھی بھی نہ پھر لوٹ کر آئیں گے
گئے ہیں سبھی کو وہ یوں چھوڑ کر
پلٹ کے نہ دیکھا ہے منہ موڑ کر
قضا ایسا آکے وہ کہتی ہے کیا
سنی اس کی اور ساتھ اس کے ہوا
یہی کام ابنِ کنول نے کیا
کسی کی نہ سوچی انھوں نے ذرا
قضا کا یہ رائج وہ دستور ہے
کہ ہر ایک اس آگے مجبور ہے
چلی اس کے آگے کسی کی کہاں
ہے مجبور بوڑھا ہو بچہ جواں
جو آئی وہ لینے تھی ان کو اجل
نہ ٹھہرے جہاں میں وہ پھر ایک پل
وہ پل میں ہی بس آں جہانی ہوئے
وہ موجود سے اک کہانی ہوئے
گئے تھے علی گڑھ نبھانے جو فرض
اجل آگئی روح کرنے کو قبض
ہوئے با وضو وہ جو پڑھنے کو ظہر
ادا فرض اپنا وہ کرنے کو ظہر

خدا کو بھی کچھ اور منظور تھا
جو فہم و گماں سے بہت دور تھا
ادا کرنے سے ظہر رہ ہی گئی
قضا ساتھ اپنے انھیں لے گئی
پڑا ایک ماتم تھا ہر سو وہاں
رہا ہوش باقی کسی کو کہاں
گئے چھوڑ کر ہیں جو ابنِ کنول
کہ آیا ہے غم یہ بہت جاں گسل
گیا چھوڑ کر کے وہ اردو کا یار
نہیں ہے کسی کو بھی کچھ اختیار
وہ دنیا میں جب تک بھی زندہ رہے
وہ اردو کی خدمت ہی کرتے رہے
بہت نیک تھے وہ بہت نرم خو
گئے ہیں جہاں سے بھی وہ با وضو
بہت پُر خلوص اور ملنسار تھے
بہت باشعور اور با کردار تھے
وہ پیکر تھے لطف اور ایثار کا
وہ پیکر مثالی سے کردار کا
وہ استاد ایسے ہو جیسے پدر
رہے شعبۂ اردو کے وہ تھے صدر
وہ افسانہ تحقیق خاکے تمام
ادب میں وہ رکھتے تھے اعلا مقام
ظریفانہ کافی تھا ان کا مزاج
کہاں لوگ ملتے ہیں ایسے بھی آج
غرض اس جہاں سے ہے جو بھی گیا

خلا اس کے جانے سے کب ہے بھرا
یہی حال ابنِ کنول کا بھی ہے
وہ اپنے مثالی تو بس آپ تھے
بہت یاد آئیں گے ہم کو سدا
کرے مغفرت اور رحمت خدا
لکھے کیسے ارشادؔ ان کی صفات
کہ ہستی تھی جن کی ادب کی لغات

☆☆☆

کیوں؟

پروفیسر ابن کنول کے سانحہء ارتحال پر

شاہد انور

بچھڑنا ایک فطرت ہے
مگر بے ساختہ عہد شناسائی اگر ٹوٹے
تو اک احساس ہوتا ہے
مگر یہ بھی حقیقت ہے
بچھڑنا اور فنا ہونا، نظامِ کُل ہے قدرت کا
جو اک احساس ہی تو ہے!
تبسم جن لبوں پر رقص فرما ہو
قضا کی مار سے وہ لب اگر خاموش ہو جائیں
پتنگے شمع محفل کی لہکتی، جھومتی لو پر
مٹا دیتے ہیں ہستی کو
گلستان محبت سے مہکتے گل کا
شاخوں سے جدا ہونا
مثالیں ہیں بچھڑنے کی
مگر وہ داغ ہائے دل کے ان روٹھے ہوئے اشک رواں میں تو
ہمیشہ زندہ رہتے ہیں
خدائے برتر و برحق
اجازت ہو تو تیری بارگاہ معتبر میں اک
سوال عاجزانہ ہے
یہاں سے جانے والے تو بچھڑ جاتے ہیں ایک پل میں
مگر ان کی سنہری یاد ذہنوں سے
بچھڑتی کیوں نہیں آخر؟؟

☆☆☆

ابن کنول

متین امروہوی

ابن کنول جو زلف ادب کا اسیر تھا
اس کا چراغ علم سے روشن ضمیر تھا
دلی کی سرزمین سے کہہ دیجئے متینؔ
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

☆☆☆

قطعہء تاریخِ وفات (ہجری)

تنویر پھول (امریکہ)

دانشورِ عظیم تھے، دیتے تھے درس نیک		دیکھیں کسی کو دکھ میں تو ہوتے تھے مضطرب
اے پھولؔ! وہ خلیق تھے، سب کو تھے چاہتے		"ناصر کمال ابن کنول با رُخِ محب "

1444ھ

قطعہ تاریخ عیسوی

کوشش سے اپنی علم کا دریا رواں کیا		تعلیم کے سرور میں ہوتے تھے ذہن گم
قُم کہہ کے وہ اٹھاتے تھے تعلیم کے لیے		"ناصر کمال ابن کنول ارمغانِ قُم"

2023ء

رحلت ابن کنول

احمد امتیاز
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

(نظم بقید صنعت توشیح)

ن۔	ناصر بھی گئے چھوڑ کے اب باغ ارم کو		ہنستا ہوا اک پھول گیا ملک عدم کو
ا۔	انداز تخاطب بھی بہت خوب تھا ان کا		رکھتے تھے رواں خوب ہی وہ اپنے قلم کو
ص۔	صدمے کو کہیں طاق پہ رکھتے تھے وہ ہنس کر		دکھ میں نہ بھلایا کبھی ہستی کے بھرم کو
ر۔	رسم و رہ دنیا کو نبھاتے تھے کنول جی		توڑا نہیں کرتے تھے کبھی اپنی قسم کو
م۔	مخلص تھے محبی تھے مکرم تھے سدا سے		محبوب وہ رکھتے تھے بہت ناز و نعم کو
ح۔	حد پار نہ کرتے تھے کبھی اپنی طرف سے		پسپا نہ کبھی ہونے دیا اپنے حتم کو
م۔	مصروف ادب لکھنے میں رہتے تھے ہردم		برجستہ تخیل میں وہ لاتے تھے حِکم کو
و۔	وابستہ رہے اپنے پرایوں سے خوشی سے		دانستہ کبھی ٹھیس نہ پہنچائی صنم کو
د۔	دیتے تھے بہت داد وہ طلبا کے قلم کی		کرتے تھے سدا دور بھی طلبا کے سقم کو
ک۔	کس کس کو بتاؤں کہ وہ محمود ادب تھے		جھکنے نہ دیا فکر کو، غیرت کو، علَم کو
م۔	ماتم نہ کیا، بخش دیا دشمن جاں کو		ظاہر نہ کیا، راز رکھا اپنے اَلم کو
ا۔	اللہ کرے ان کو عطا رحمت کامل		دیکھا تھا کئی بار عرب جاکے حرم کو
ل۔	للہ دعا کرنا سبھی واسطے ان کے		انجان سی اک رہ میں رکھا ہے قدم کو

19 فروری 2023

کچھ شگفتہ کچھ سنجیدہ مزاج دوست 'ابن کنول'

اسلم حنیف

گنور، ضلع سنبھل، 243722

email: aslamhaneef760@gmail.com
Mobile: 9997429226

کم وبیش دو ماہ سے میری طبیعت زیادہ ہی خراب چل رہی تھی مگر ۱۱ر فروری ۲۰۲۳ء کی صبح سے ہی ذہن میں ایک عجیب سے ہیجان کی کیفیت بپا تھی۔ نامعلوم ہیجان کے ساتھ دھیرے دھیرے عصر کا وقت آ گیا۔ فریضۂ صلوٰۃ کی ادائیگی میں مشغول تھا کہ موبائل کی بیل بجنا شروع ہوئی۔ صاحب زادے نے فون ریسیو کیا۔ اس کی گھبرائی ہوئی آواز اور کب، کیسے اور کہاں، جیسے سوالات سے یہ تو اندازہ ہو گیا کہ کسی کی موت کے المناک حادثے کی خبر ہے۔ سلام پھیرتے ہی بیٹے نے رقت آمیز لہجے میں کہا: ''ابو..... چچا ناصر کمال کا ہارٹ اٹیک سے انتقال ہو گیا۔'' میری زبان سے بیک لخت 'انا للہ وانا الیہ راجعون' کا جملہ نکلا اور پھر میں نے اس خبر کی مزید تصدیق وتفصیل کے لئے کئی قرابت داروں کو فون کرنا شروع کر دیے۔ انتقال کی تفصیلات کسی کو معلوم نہیں تھیں۔ لگ بھگ آدھا گھنٹہ جستجو کے بعد پتہ چلا کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائیوا (Viva) لینے کے لئے آئے تھے۔ علی گڑھ میں نمایش لگی ہوئی تھی اس لئے وہ اہل وعیال کو بھی ساتھ لائے تھے۔ رات نمایش گھومنے بھی گئے تھے اور آج دو بجے وائیوا سے فراغت کے بعد بڑے بھائی کے گھر آ گئے تھے۔ آنے کے کچھ دیر بعد ہی دل کی حالت خراب ہو گئی۔ میڈیکل لے جایا گیا مگر ڈاکٹروں کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ ایک مخلص بچپن کے ساتھی کے اچانک سانحۂ ارتحال سے میرے دل ودماغ کی کیا کیفیت ہوئی تھی، اسے میں لفظوں میں ادا نہیں کر سکتا۔

ناصر محمود کمال (ابن کنول) میرے بچپن کے ساتھی تھے۔ ان کی پیدائش ان کے ننہال بھجوئی (ضلع سنبھل، جو پہلے ضلع مرادآباد میں شامل تھا) میں ۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو ہوئی۔ ان کے والد ڈاکٹر شمس الحسن کنول ڈبائی ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ (بھجوئی، گنور سے تیس کلومیٹر اور ڈبائی تیئس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے)۔

ڈاکٹر کنول ڈبائیوی نے ہومیوپیتھی کا ڈپلوما حاصل کر کے پہلے بھجوئی میں میڈیکل پریکٹس شروع کی۔ اسی دوران اپنا اور والدہ ابن کنول (آمنہ بیگم) کا پریکٹس رجسٹریشن لکھنؤ سے کرایا۔ اس کے بعد انھوں نے ''دھگواں'' جو گنّور سے لگ بھگ ۲۴ر کلومیٹر دور بدایوں روڈ پر واقع ایک موضع ہے، میں کچھ دن پریکٹس کی۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے گنّور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ گنّور میں ان کی پریکٹس خوب چلی۔ ڈبائی والے ڈاکٹر کے نام سے گنّور اور آس پاس کے دیہات میں وہ کافی مشہور ہو گئے، کیوں کہ ناصر کے والد کے ساتھ ان کی والدہ بھی علاج ومعالجے کے کام میں برابر کی شریک رہتی تھیں، اس لئے ان کے

والد نے میڈیکل پریکٹس کی پوری ذمہ داری ان پر چھوڑ کر اپنے وطن ڈبائی کے کبیر انٹر کالج کے شعبۂ اردو کے استاد اور انچارج کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ یوں بھی اتوار اور چھٹیوں کے دن وہ گنّور ہی میں گزارتے تھے، مگر ۱۹۸۲ء میں رٹائرمنٹ کے بعد ان کا مستقل وقت گنّور ہی میں گزرنے لگا۔

ڈاکٹر کنول ڈبائیوی محب وطن شاعر اور محقق و ادیب بھی تھے، اس لئے وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی ادبی کام میں مصروف رہا کرتے تھے۔

اس دور میں اردو شعر و ادب کی مایہ ناز شخصیت علامہ ابر احسنی کے وجود نے یہاں کی شعری روایت کو باوقار اور توانا بنا دیا تھا۔ مست احسنی، علامہ رمز آفاقی اور سیفی پریمی وغیرہ جیسی شعری ہستیاں اس ماحول میں روح رواں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جگہ جگہ مشاعروں کا انعقاد عام سی بات تھی۔ ڈاکٹر کنول ڈبائیوی ہر مشاعرے میں نہ صرف شریک ہوتے بلکہ اپنے تلامذہ اور خود سے متعلق بیرونی شعری شخصیتوں کو بھی مشاعروں میں مدعو کرلیا کرتے تھے اور مہمانوں کے قیام و طعام اور زادراہ کی ذمہ داریاں بھی خود اٹھاتے۔ ابن کنول ایک ایسی ہی با اخلاق اور علمی شخصیت کی اولاد تھے۔

اِدھر میرا معاملہ ان کے گھرانے سے قدرے مختلف تھا۔ ماحول سخت مذہبی تھا اور شاعری کو معیوب عمل سمجھا جاتا تھا۔ خاندان کے سبھی اسلاف طب و حکمت کے پیشے سے منسلک تھے۔ والد صاحب اگرچہ شاعری کے مخالف تھے مگر اصلاحی اور مذہبی مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح گنور اور گھر کے ماحول کے اثرات ناصر محمود کی علمی و فنی تربیت کے لئے لاشعوری صورت میں بنیادی رول ادا کر رہے تھے اسی طرح میرے اندر ادبی رجحان پیدا کرنے میں ماحول کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ناصر محمود کمال اور میں اسلامیہ اردو میڈیم اسکول میں پانچویں جماعت تک ایک ساتھ پڑھے تھے۔ اسی دوران ہمیں شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ پھر دونوں نے کہانیاں بھی لکھنا شروع کر دیں، لیکن ہوا یہ کہ وہ پانچویں کلاس پاس کرنے کے بعد آگے کی تعلیم کے لئے علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں جا کر ان کا شعری ذوق ختم ہو گیا اور وہ صرف افسانہ نگاری تک محدود ہو کر رہ گئے۔ ادھر خاکسار کا رجحان افسانہ نگاری کو خیر آباد کہہ کر شاعری اور مضمون نگاری کی طرف مائل ہو گیا۔

چونکہ ناصر محمود کمال کے والد شمس الحسن صاحب کنولؔ تخلص کرتے تھے اسی کی مناسبت سے انھوں نے اپنا قلمی نام ابن کنولؔ رکھا تھا۔ اور خاکسار محمد اسلم (عبدالمقیت) نے اسلمؔ حنیف۔ ان کے قلمی نام کو میری تائید حاصل تھی اور میرے قلمی نام کو انھوں نے پسند کیا تھا۔

علی گڑھ پہنچ کر ابن کنول نے قاضی عبدالستار، خورشید الاسلام، خلیل الرحمن اعظمی، نورالحسن نقوی، شہریار، عتیق احمد صدیقی، منظر عباس نقوی، اصغر عباس اور نعیم احمد جیسے اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ یہاں کی علمی اور ادبی فضا نے ابن کنولؔ کی فنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۸ء میں ایم اے کرنے کے بعد ابن کنول دہلی چلے گئے۔ دہلی یونیورسٹی سے

۱۹۸۴ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔موضوع تھا''بوستانِ خیال کا تہذیبی اور لسانی مطالعہ''اورنگراں تھے تنویر احمد علوی۔ ابن کنول کا یہ مقالہ''ہندوستانی تہذیب بوستانِ خیال کے تناظر میں''۱۹۸۸ء میں شائع ہوااور دوبارہ''بوستانِ خیال ایک مطالعہ'' کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں چھپا۔

ابن کنول جب تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے،ان کا ہر اتوار اور چھٹیوں کے دن گنّور ہی میں گزرتے۔ دہلی پہنچنے کے بعد بھی جلد جلد گنّور آنے جانے کا سلسلہ قائم رہا،مگر ۱۹۸۵ء میں والدہ کینسر کا شکار ہوگئیں اس لئے دواخانہ بند ہوگیا اوران کے والداور والدہ گنّور چھوڑ کر علی گڑھ چلے گئے۔

والدین کے گنّور سے ہجرت کرنے کے بعد ابن کنول کا یہاں آنا جانا عزیز واقارب میں خوشی اور غم کے اہم مواقع تک محدود ہوکر رہ گیا۔

دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ابن کنول اسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سی ایس آئی آر کی طرف سے ریسرچ سائنٹسٹ کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور پھر ریسرچ ایسوسی ایٹ،ریڈر اور لکچرر کے بعد پروفیسر کے عہدے تک پہنچے۔ وہ تین سال تک (اپریل ۲۰۰۵ء سے ۲۰۰۸ء) شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر بھی رہے۔

ابن کنول کا شمار ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ابھرنے والا''لاتحریک نسل''میں ہوتا ہے۔اردو میں جدیدیت کی تحریک کے بعد جو ادیبوں اور شاعروں کی نسل ابھر کر سامنے آتی ہے وہ کسی نظریے یا اصول کے تحت ادب تخلیق کرنے کی بجائے انفرادی ذہنی آزادی کو اہمیت دیتی تھی اس لئے اس کا سلسلہ تحریکوں کے ادوار کے لاتحریکیت پسند فنکاروں سے جاملتا ہے۔اور جس طرح ہر دور کے لاتحریکیت پسند فنکاروں نے تحریکوں سے باہر رہ کر تحریکوں سے استفادہ تو کیا مگر وہ اس کے دائروں میں مقید نہیں ہوئے اسی طرح اردو میں مابعد جدید لاتحریک نسل نے سابقہ کسی تحریک کی توسیع نہیں کی بلکہ امتزاج کے نظریے کو اہمیت دی۔

ابن کنول کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع جہاں ان کے امتزاجی رویے کو نشان زد کرتا ہے وہیں مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف وتالیفات کو بھی اسی رویہ کا لاشعوری اظہار کہا جاسکتا ہے۔

ابن کنول کا پہلا افسانہ''اپنے ملے اجنبی کی طرح''،''آفتابِ سحر''(سکندرآباد) نام کے رسالے میں چھپا لیکن جب ان کا افسانہ''بند راستے''۱۹۷۶ء میں عصری ادب جیسے موقر رسالے میں شائع ہوااور محمد حسن جیسے ناقد نے اس کو سراہا تو ابن کنول نئے افسانہ نگاروں میں ایک معتبر آواز قرار پائے۔

ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ''تیسری دنیا کے لوگ''۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد مختلف موضوعات سے متعلق ان کا قلم رواں دواں رہااور لگ بھگ ڈھائی درجن کتابیں شائع ہوکر ادب میں اضافے کا سبب بنتی رہیں۔فہرست کچھ اس طرح ہے:

(۲) ہندوستانی تہذیب،بوستانِ خیال کے تناظر میں(تحقیقی مقالہ)،۱۹۸۸ء(جو ۲۰۰۵ء میں بوستانِ خیال ایک

مطالعہ کے عنوان سے شائع ہوا)۔(۳) بند راستے (افسانے) ۲۰۰۰ء۔(۴) ریاض دل ربا (اردو کا پہلا ناول) (تحقیق) ۱۹۹۰ء۔(۵) آؤ اردو سیکھیں (قاعدہ) ۱۹۹۳ء۔(۶) داستان سے ناول تک (تنقید)، ۲۰۰۱ء۔(۷) انتخاب سخن (اردو شاعری کا انتخاب) ۲۰۰۵ء۔(۸) منتخب غزلیات، ۲۰۰۵ء۔(۹) منتخب نظمیں، ۲۰۰۵ء۔(۱۰) اصنافِ پارینہ (قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ)، ۲۰۰۵ء۔(۱۱) تنقید و تحسین (تنقیدی مضامین)، ۲۰۰۶ء۔(۱۲) تحقیق و تدوین (ترتیب)، ۲۰۰۷ء۔ (۱۳) میرا من (مونوگراف) ۲۰۰۷ء۔(۱۴) باغ و بہار (مقدمہ و متن) ۲۰۰۸ء۔(۱۵) پہلے آپ (ڈرامہ)، ۲۰۰۸ء۔ (۱۶) نظیر اکبر آبادی کی شاعری، ۲۰۰۸ء۔(۱۷) مضراب (ڈاکٹر کنول ڈبائیوی کی کلیات مع مقدمہ)، ۲۰۱۰ء۔(۱۸) اردو افسانہ (افسانوی تنقید)، ۲۰۱۱ء۔ (۱۹) پچاس افسانے (افسانوی مجموعہ)، ۲۰۱۴ء۔ (۲۰) تنقیدی اظہار (تنقید)، ۲۰۰۵ء۔(۲۱) فسانۂ عجائب (مرتبہ) ۲۰۱۶ء۔(۲۲) اردو لوک ناٹک، روایت اور اسالیب (مصنف کنول ڈبائیوی) مرتبہ ابن کنول، ۲۰۱۴ء۔ (۲۳) اردو شاعری (تنقید)، ۲۰۱۹ء۔ (۲۴) کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی (خاکے)، ۲۰۲۰ء۔ (۲۵) داستان کی جمالیات، ۲۰۲۰ء۔(۲۶) داغ دہلوی (ڈرامے)، ۲۰۲۰ء۔(۲۷) تبریک (تقاریظ)، ۲۰۲۱ء۔(۲۸) بساطِ نشاطِ دل (انشائیے)، ۲۰۲۱ء۔(۲۹) داغ دہلوی (مونوگراف)۔(۳۰) اھل الکہف کے عنوان سے ان کے افسانوں کا عربی ترجمہ جواحمد قاضی (مصر) نے کیا۔ ۲۰۱۸ء

اردو کے نمائندے کی حیثیت سے امریکہ، ماریشس، انگلینڈ، پاکستان اور روس میں منعقد ہونے والے عالمی سیمیناروں میں بھی شرکت کی اور بیرون ملک اردو سے متعلق تقاریب اور جلسوں کی دعوتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

ابن کنول کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مختلف انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا، مثلاً:

۱-سرسید ملینیم ایوار، دہلی، برائے اردو فکشن، ۲۰۰۱ء ڈاکٹر منموہن نے پیش کیا۔

۲- ہریانہ اردو اکادمی کا کنور مہندر سنگھ ایوارڈ برائے ادبی خدمات ۲۰۰۷ء گورنر ہریانہ اخلاق الرحمن قدوائی کے ہاتھوں دستیاب ہوا۔

۳-ان کی مختلف کتب پر دہلی اردو اکیڈمی، اتر پردیش اردو اکاڈمی، بہار اردو اکیڈمی اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی وغیرہ وغیرہ نے بھی انعامات سے نوازا۔

۴-افسانہ ''بند راستے'' پر ۱۹۷۹ء دہلی یونیورسٹی نے کٹھپالیا گولڈ میڈل سابق نائب صدر جمہوریہ جناب بی ڈی جُٹی کے بدست عطا کیا گیا۔

۵-۲۰۰۸ء میں دہلی اردو اکاڈمی نے فکشن ایوارڈ سے نوازا۔

حالانکہ ابن کنول ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ کے بھی مستحق تھے مگر گروہی عصبیت اور عدم چاپلوسی کی وجہ سے انھیں یہ ایوارڈ نہیں مل سکا۔

بذلہ سنجی اور طبیعت میں شگفتگی کے عناصر ان میں بچپن ہی سے موجود تھے اور انھیں عناصر نے ان کو انشائیہ اور خاکہ نگاری کی طرف مائل کیا۔اس بات کا اقرار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

''.....مزاج میں شگفتگی ابتدا ہی سے تھی جس کا اظہار محفلوں میں تو کیا، تحریر میں نہیں آیا۔اگر وہ جملے اور فقرے محفوظ ہو جاتے تو مجاز کی طرح لوگ یاد کرتے۔طبیعت کی بذلہ سنجی نے حالت نظر بندی میں خاکے لکھوائے اور اس کے بعد انشائیے کی طرف رغبت دلائی۔''(بساطِ نشاطِ دل: پیش لفظ، صفحہ ۷)

یادش بخیر ایک بار وہ گنّور ملنے آئے۔اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولے کہ میرے ایک ملاقاتی جن کا تعلق بہار سے ہے، ایک دن ہوٹل میں مل گئے۔میں ان کا نام بھول گیا تھا مگر کبھی ان سے نام پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے چائے میں گھونٹ مارا اور پھر سر کھجاتے ہوئے ان سے سوال کیا''بھول رہا ہوں آپ کا پورا نام کیا ہے؟ وہ برجستہ بولے ''آپ آدھا نام ہی بتا دیجئے''۔دیرینہ ملاقاتی تھے اس لئے قہقہے لگا کر شرمندگی دور کی.....اسی طرح کتنے واقعات ہوں گے جو ضابطۂ تحریر میں نہیں آسکے۔قطع نظر اس کے جب کورونا وائرس کی وبا نے پوری دنیا میں ہیجان برپا کر دیا تھا اور ملک میں ۲۴/مارچ ۲۰۲۰ء کو لاک ڈاؤن کا اعلان ہو گیا تو ہر گھر یا رہائش گاہ جیل خانہ بن کر رہ گئی۔جن ادیبوں، شاعروں اور مفکروں کو اس قید بے گناہی میں تخلیقی کارناموں کو بروئے کار لانے کا بھرپور موقع ملا، ان میں ابن کنول بھی شامل ہیں۔

ابن کنولؔ نے لاک ڈاؤن کے دوران خاکہ نگاری کی طرف توجہ دی۔پہلے انھوں نے اپنے خاکوں کے ویڈیو سوشل میڈیا کے حوالے سے پیش کئے اور پھر''کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کرا دیا۔

خاکہ نگاری ایک الگ صنف سخن ہے۔خاکہ ایک طرح کی ایک ایسی لفظی تصویر ہے جس میں خاکہ نگار شخصیت، اس کی وضع قطع، عادات واطوار، چال ڈھال، نشست برخاست، قیام وطعام اور دوسرے اعمال ووظائف کو اس خوشگوار اور بذلہ سنجیدگی کے انداز میں پیش کرتا ہے کہ شخصیت قاری کے ذہن پر جیتی جاگتی تصویر بن کر ابھر آتی ہے۔خاکہ نگار، شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کو گرفت میں لاتا ہے۔وہ شخصیت کے کردار کے محاسن ہی پر روشنی نہیں ڈالتا بلکہ اس کی کمزوریوں کو بھی نہایت سلیقے سے بیان کرتا ہے۔

یوں تو مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب''آبِ حیات'' میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش مل جاتے ہیں، مگر اس صنف پر باقاعدہ توجہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے دی تھی۔انھوں نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا جو خاکہ کھینچا ہے اس میں اس صنف کی من جملہ خوبیاں موجود ہیں۔ان کے بعد رشید احمد صدیقی، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالمجید سالک، جگن ناتھ آزاد، محمد طفیل، رئیس جعفری، شاہد دہلوی، سعادت حسن منٹو اور ممتاز مفتی وغیرہ نے اعلیٰ درجے کے خاکے لکھے ہیں۔اور کئی خاکہ نگاروں نے خاکہ نگاری کی روایت کو مستحکم کیا ہے، مگر مولوی عبدالحق نے ہم عصروں کے جو خاکے تحریر کئے ہیں وہ فنی و جمالیاتی نقطہ نظر سے کافی

اہمیت کے حامل ہیں۔انھوں نے معاصر اہم شخصیتوں کے ساتھ نور خان اور دیومالی جیسے معمولی کرداروں کے خاکے لکھ کر انھیں جاوداں بنادیا ہے۔

خاکہ کا تعلق زندہ شخصیت کی خوشگوار لفظی تصویر کشی سے ہے اس لئے خاکہ وہی لکھ سکتا ہے جس نے شخصیت کا مطالعہ گہری نظر سے کیا ہو،اس کے اعمال وکردار اور بودوباش کے من جملہ پہلوؤں سے آگہی رکھتا ہو اور وہ اس کی نفسیات سے بھی آشنا ہو۔

ابن کنول کے خاکوں میں ہمیں خاکہ نگاری کے من جملہ اوصاف دستیاب ہوجاتے ہیں، کیوں کہ خاکہ کسی شخصیت یا شخص کے سطحی مطالعہ سے وجود میں نہیں آتا، بلکہ اس کے لئے مدتوں شخصیت کی زندگی،اس کے اعمال وکردار اور نفسیات کا بغائر جائزہ لینا پڑتا ہے اس لئے یادداشت کا بہتر ہونا اور شعور کا باریک بیں ہونا اس صنف کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

ابن کنول نے پچیس لوگوں پر خاکے تحریر کئے ہیں۔بقول ان کے:

''..... ۱۴/اپریل سے خاکے لکھنا شروع کردیے۔سب سے پہلے اپنے پرائمری اسکول کے استاد کو یاد کیا، پھر اسکول کے ہم جماعت کی یاد آئی، پھر علی گڑھ اور دہلی کے اساتذہ اور دوستوں کو یاد کیا۔''(ص ۹)

''کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی'' میں اگرچہ ابن کنول نے پرائمری کے استاد منشی چھٹن کا ذکر نمبر ایک ہی پر کیا ہے مگر اپنے ہم جماعت (اسلم حنیف) کو سولہویں نمبر پر رکھ دیا ہے۔اس کی وجہ تو مرحوم ہی جانتے ہوں گے،لیکن ان دونوں خاکوں کو پڑھ کر میرے سامنے بچپن کی ان گنت واقعات ومناظر تازہ ہوگئے۔ایک عالم گمشدگی کی کیفیت نے مجھے حال سے کاٹ کر ماضی کے اس ماحول میں داخل کردیا جسے زندگی کے مسائل نے ذہن سے اوجھل کردیا تھا۔

منشی چھٹن کے خاکے میں لکھتے ہیں:

''.....اب تو اس اسکول کی عمارت بھی زمیں دوز کردی گئی۔سرکاری اسکول تھا، اردو ذریعۂ تعلیم تھی ..... پرائمری اسکول تھا۔میز کرسی صرف اساتذہ کے لئے تھے۔ بچے ٹاٹ کی لمبی دریوں پر بیٹھا کرتے تھے۔پہلی کلاس میں ہمارے کلاس ٹیچر منشی حاجی صفدر علی تھے، بعد میں جن کی پوتی ہماری شریک حیات بن گئیں.....منشی ہادی علی ہیڈ ماسٹر تھے.....۔بچوں کے کان مروڑنے میں انھیں بڑی مہاوت حاصل تھی .....منشی حفظ علی مارتے وقت گجگجاتے تھے، دانت بھینچ لیتے تھے۔کلّو منشی جب سنٹی (چھڑی) سے مارتے تو لگا تار مارتے جیسے روئی کوٹ رہے ہوں۔منشی صفدر علی میز کے نیچے ہاتھ دبا دیتے تھے اور کبھی کمر پر تختی چلا دیتے تھے۔کبھی مرغا بناتے اور کبھی کرسی۔''.....

(منشی چھٹن) مارتے کم تھے، مسکراتے زیادہ تھے اسی لئے سب کے پیارے تھے۔''

(ص ۱۴و۱۵)

''.....گنّور میں آئے دن جگہ جگہ مشاعرے ہوتے تھے، اسلم حنیف اور ہم دونوں ہی مشاعروں میں سامع کی حیثیت سے جاتے تھے۔ دونوں کو شاعری کا شوق پیدا ہوگیا۔ اکثر ایک مصرع موزوں کرکے میں اسلم سے شعر مکمل کرنے کے لئے کہتا۔''

.....''گنّور میں اس وقت شاعر بہت تھے۔ ابراحسنی گنوری کی سرپرستی حاصل تھی۔ زمیں دار اور چیئرمین سے لے کر حلوائی اور چائے والے تک شاعری کرتے تھے۔''

(خاکہ اسلم حنیف، ص ۱۶۰)

خاکہ نگاری کے حوالے سے ابن کنول کی زیر بحث کتاب ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے اس کتاب کے منجملہ اوصاف کو نظر انداز کرتے ہوئے کتاب کے کچھ اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

''.....میرے پاس سائیکل تھی۔ مجھ سے سائیکل لی، سائیکل پر اس طرح سوار ہوئے جیسے گھوڑے پر چڑھے ہوں۔'' (قاضی عبدالستار، ص ۲۹)

''.....اس زمانے میں پڑھا لکھا اُسے ہی کہا جاتا تھا جو اللہ رسول کو برا بھلا کہے اور روزے نماز کو فضول سمجھے.....خوش قسمتی یا بدقسمتی سے قمر صاحب نے لکھنؤ اور علی گڑھ میں ایسے ہی لوگوں کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جتنے لامذہب مسلمان ترقی پسند تھے وہ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی مسلمان ہی کہلائے۔'' (قمر رئیس، ص ۴۳)

''شمس تبریزی پر پٹھانیت غالب آجاتی ہے تو وہ مرصع مغلظات سے نوازنے میں رعایت نہیں کرتے۔ اصل شمس تبریزی کی روح بھی گھبرا جاتی ہے کہ مسجع مغلظات کاتبین اعمال نامہ کی یکسانیت کے سبب کہیں ان کے حساب میں نہ لکھ دیں۔'' (گیسو دراز شمس تبریزی، ص ۲۰۴)

''علی گڑھ میں ایک عتیق احمد صدیقی کو چھوڑ کر آیا تھا.....دہلی پہنچ کر آدھے درجن کے قریب عتیق نام کے مصنّفین سے واقفیت ہوگئی۔ پتہ نہیں کیوں والدین کو یہ نام اتنا پسند ہے کہ اِدھر لڑکے کی ولادت ہوئی اُدھر اس کا نام اس امید پر کہ نہایت برگزیدہ شخصیت کا مالک ہوگا، عتیق رکھ دیا۔'' (قلندر ادیب، محمد عتیق صدیقی، ص ۲۲)

''آدمی لکھتا اچھا نہ ہو، بس بولتا اچھا ہو تو مقبول ہوجاتا ہے، مثلاً مشاعرے والے

شاعر جتنے عوام میں مقبول ہوتے ہیں کتابوں والے نہیں .....ایک بات میں نہیں سمجھ پایا کہ اتنا گھر سے باہر رہنے پر ان کی بیگم کو کوئی اعتراض کیوں نہیں ہوتا۔ یا تو کاظم کے باہر رہنے میں ہی وہ عافیت محسوس کرتی ہوں گی یا انھیں لگتا ہوگا کہ میرا شوہر بہت مشہور آدمی ہے، اس لئے اس کی مانگ باہر زیادہ ہے۔'' (مشکل کشا محمد کاظم، ص ۳۴)

تشریح کی ضرورت نہیں۔ یہ اقتباسات یوں ہی کتاب کو الٹتے پلٹتے ہوئے بغیر کسی کاوش کے نقل کر دیے گئے ہیں۔

ابن کنول آج دنیا میں نہیں ہیں، ان کا ہنستا، مسکراتا چہرہ اب بھی میری نظروں میں گھوم رہا۔ ابن کنول سے میری آخری ملاقات ۲۵ رجنوری ۲۰۲۱ء کو ہوئی تھی وہ اپنے ایک عزیز سفیان علی کے یہاں ایک تقریب میں گنّور آئے تھے۔ صبیحہ اور ابن کنول شام کے وقت گھر بھی آئے اور اپنے خاکوں کی مذکورہ کتاب یہ کہہ کر دے گئے کہ اس پر تاثرات لکھ کر بھیج دینا۔ کسے علم تھا کہ ان کی خواہش میں ان کی حیات میں پوری نہیں کر سکوں گا۔

ابن کنول مجھ سے ہمیشہ نثر یا شاعری کی کتاب کی اشاعت کا تقاضہ کرتے تھے، وہ جب آتے تب بھی اور فون پر گفتگو کرتے تب بھی لگ بھگ آٹھ ماہ قبل میں نے انھیں فون پر اطلاع دی کہ میں غزل کا مجموعہ بعنوان ''ورق ورق نیا آہنگ'' مرتب کر رہا ہوں، سن کر بہت خوش ہوئے۔ پھر میں نے ازراہِ مذاق کہا یہ دنیائے شعر و ادب کی منفرد کتاب ہوگی۔ بولے ''یہ دعویٰ چھوڑو، کتاب مدوّن کرو''۔ میں نے کہا شاعری کے اعتبار سے نہیں، اوزان کے اعتبار سے۔'' جواب دیا۔ کتنے وزن استعمال کر لئے۔ میں نے کہا ''ساڑھے سات سو''۔ حیران ہو کر کہا: ''تب تو واقعی کارنامہ ہے۔''

یہ کتاب پریس میں ہے اور ہفتہ پندرہ یوم میں چھپ جائے گی، مگر مرحوم کے بعد اس کی اشاعت کا دکھ مجھے ہمیشہ بے قرار کرتا رہے گا۔

☆☆☆

Aslam Haneef
Gunnaur, Dist. SAMBHAL-243722 (UP)
email: aslamhaneef760@gmail.com
Mobile: 9997429226

ابن کنول: خاص وضع قطع کا مخلص انسان

پروفیسر صغیر افراہیم

سابق صدر شعبہ اردو

وسابق مدیر تہذیب الاخلاق

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ۲

s.afraheim@yahoo.in

دراز قد، بھرا ہوا بدن، گندمی رنگ، گول چہرہ، سیال بال، چوڑی پیشانی، روشن آنکھیں، موٹی ناک، نخشتی مونچھیں، مُسکراتے لب، مختصر تھوڑی، چھوٹی گردن مگر کشادہ سینہ اور اُس سے بھی زیادہ وسیع قلب۔ یہ ہے شبیہ باغِ سرسید کے اُس نونہال کی جسے بچپن کے دوست اور عزیز واقارب ناصر محمود کمال اور دانشورانِ ادب ابن کنول کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔ ناصر اور محمود کے جملہ صفات وکمالات سے مزین، کنول کی طرح کھِلتے ہوئے فقرے اور تھرکتے ہوئے جملے، پچھلی کئی دہائیوں سے ہمارے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔ وہ طالب علمی کا زمانہ رہا ہو، بادِ صبا کی تیز وتند ملازمت کا دور یا پھر سبک دوشی کے بعد کے پُرسکون وفرحت بخش لمحات۔ پروفیسر ابن کنول محفل اپنے زعفران زار طرزِ بیان اور اندازِ تخاطب سے ہر جگہ چھائے رہتے تھے، اِس فہمائش کے ساتھ ؎

اکیلا ہوں مگر آباد کر دیتا ہوں ویرانہ
بہت روئے گی میرے بعد میری شام تنہائی

حسابِ دوستاں کے طویل سائے ہیں اور سبھی خوشگوار یادوں سے مزین۔ اُن کو چُننے اور ترتیب دینے کی استطاعت نہیں پا رہا ہوں۔ رزم ہو یا بزم، وقفہ وقفہ سے مزاج کی پُھل جھڑیاں چھوڑنے والے اِس مخلص دوست کا مزاج ظریفانہ اور انداز کجکلاہانہ تھا۔ چہرہ سے متانت ٹپکتی تھی۔ ابن کنول کی شخصیت کو صیقل کرنے میں بدایوں کی روحانیت وقناعت، منٹوسرکل کی ظرافت وشرارت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ذہانت وفطانت اور دہلی کی معاملہ فہمی اور مصلحت اندیشی رچی بسی تھی۔ قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی کے گھر کی پرورش اور صحیح سمت میں آگے بڑھنے کی تلقین کے ساتھ ابن کنول کو اساتذہ بھی ایسے ملے جو قابل رشک تھے۔ اُن کا حلقۂ احباب بھی چُنندہ تھا۔ میرا، اُن کا ساتھ مادرِ درس گاہ علی گڑھ میں بھی رہا اور علی گڑھ سے باہر بھی، اُن مذاکروں اور مباحثوں میں بھی جہاں اتفاق اور اختلاف سے گزرنا پڑتا مگر یہ شریفانہ تربیت ہی کا اثر تھا کہ اُن کی خوش اطواری، خوش بیانی اور خوش اخلاقی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ وہ جامہ زیب بھی تھے، گھر میں اور مہمان خانہ میں عموماً کُرتا اور علی گڑھ کٹ پاجامہ۔ باہر، محفلوں میں شرٹ، کوٹ اور کبھی کبھی شیروانی۔ پیراہن کے اعتبار سے جسم کی جو آخری زینت بنی وہ چیک کی

شرٹ اور انگلش کیپ۔

مرحوم ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۷ء کو قصبہ بجوئی، ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ والد قاضی شمس الحسن سرکاری ملازم اور معروف ادیب وشاعر تھے۔ کنول ڈبائیوی کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ ڈراموں اور نوٹنکیوں پر بھی ان کا تحقیقی کام ہے۔ دادا قاضی شریعت اللہ عالم باعمل تھے۔ اُن کے اجداد مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور قاضی کے عہدہ پر سرفراز کیے گئے۔ اِس علمی ماحول میں ابن کنول (ناصر محمود کمال) کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ گنور، ضلع بدایوں کے اسلامیہ اسکول میں ابتدائی تعلیم پانچویں جماعت تک حاصل کرنے کے بعد، ۱۹۶۷ء میں علی گڑھ کے سیدنا طاہر سیف الدین اسکول (منٹوسرکل) میں داخلہ لیا۔ ۱۹۷۲ء میں ہائی اسکول کرنے کے بعد پری یونیورسٹی سائنس میں داخل ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں اردو سے ایم۔اے۔کیا۔ اگلے سال دہلی یونیورسٹی سے ایم۔فل کے بعد پھر دہلی ہی کے ہوکر رہ گئے۔ علی گڑھ سے کچھ ایسا تعلق تھا کہ آخری دن بھی علی گڑھ ہی میں گزرا۔ ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

وقت گزر جاتا ہے، اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے رنگ برنگی یادوں کا طویل سلسلہ۔ ماضی قریب سے ماضی بعید کی طرف مڑ کر دیکھیں تو وہ ناصر محمود کمال کے نام سے اسکول کے ایام میں لکھنے لگے تھے۔ یونیورسٹی میں آکر اُن کی تحریر میں نکھار پیدا ہوا۔ ادبی جلسوں میں مضامین سُنانے لگے۔ ''انجمن اردوئے معلیٰ'' کے سکریٹری ہوئے تو خوب محفلیں جمائیں اور اسی زمانہ میں ''ابن کنول'' نام اختیار کیا۔ قاضی عبدالستار کی نگہہ داشت میں اُن کے افسانوں میں مزید نکھار آیا۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' ۱۹۸۴ء میں اور ''بندراستے'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ منتخب افسانوں کا اُن کا انتخاب بھی منظرعام پر آچکا ہے۔ قدروں کے زوال اور رشتوں کے بکھراؤ کو بنیادی موضوع بنانے والے اِس انتخاب میں بچھڑنے کا غم، کھوجانے کی کسک اور گلے لگانے کی تڑپ شدّت سے ملتی ہے۔ موجودہ منظرنامے کے تناظر میں دیکھیں تو ''بندراستے'' میں وہ بڑی سادگی سے ہندو پاک کی بدلتی صورت حال کا ذکر کرتے ہیں۔ تبدیلیٔ وقت کے تئیں وہ ماضی، حال اور مستقبل کی قصباتی فضا کو مدغم کرتے ہوئے دکھاتے ہیں کہ مٹی کے ٹوٹے پھوٹے گھروں کی جگہ سیمنٹ کے پختہ مکانوں نے لے لی ہے۔ سڑک اور گلیوں میں لگے ہوئے بجلی کے اونچے اونچے کھمبے پُرانی لگی ہوئی لالٹینوں کے منہ چڑھا رہے ہیں۔ لیکن کیا ترقی بس اِسی کا نام ہے۔ آزادی کے خواب کی تعبیر وتفسیر یہی ہے؟ کہ خاں صاحب کی ڈیوڑھی، لالہ جی کے گودام میں بدل چکی ہے۔ داغ داغ اُجالے کی دُھند سے نکلتی ہوئی اُن کی معروف کہانی ''بندراستے'' کا مرکزی کردار ''خالد'' محسوس کرتا ہے کہ تبدیلی کے اس برق رفتار دور میں بھی اگر کچھ نہیں بدلا ہے تو چاہت اور محبت کا رشتہ جو ذہنی تناؤ کے باوجود پائیدار ہے۔ اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اب رحیم گڑھ، زمین دار کے رحم وکرم پر نہیں ہے۔ حق وانصاف کے دائرے وسیع ہوئے ہیں۔ البتہ شدّت پسندی کی بنا پر تعصب، تنگ نظری اور استحصالی رویوں کا غبار نئی شکل میں اُبھر رہا ہے جو مساوات اور یکجہتی کی فضا کو مکدر کر رہا ہے۔

خیال وخواب کی تصوراتی دُنیا میں بسنے والوں کو وہ اپنے تحقیقی مقالہ بہ عنوان ''بوستانِ خیال کا تہذیبی ولسانی مطالعہ'' میں ایک نئے طلسماتی ماحول سے آگاہ کرتے ہیں۔انھوں نے یہ لائق قدر مقالہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نگرانی میں لکھا تھا۔علوی صاحب فارسی اوراردو زبان کی باریکیوں سے واقف،فنِ طب کے رمز آشنا،ہندی کے شناسا اوراصول تحقیق وتنقید کے نبض شناس تھے۔

ابن کنول نے اپنے دیرینہ شوق کی بنا پر داستانوں کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔وہ قدیم ترین قصوں سے لے کر جدید افسانوں کو اپنے احاطۂ تحریر میں لائے۔تحقیق کے جدید طریقِ کار پر انھوں نے ان گنت مقالے پیش کیے۔اس موضوع پر''تحقیق وتدوین'' کے عنوان سے ان کی ایک ضخیم کتاب بھی ہے۔قدرت کے حسین مناظر سے عشق اور سیر وسیاحت کے شوق نے ابنِ بطوطہ کے اسفار کی ورق گردانی پر مجبور کیا۔اِس ذہنی سفر نے عملی شکل اختیار کی تو بخارا،سمرقند،تاشقند اور وسط ایشیا کے دوسرے شہروں کی خوب سیر کی۔ ؎

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں

پر عمل کرتے ہوئے یورپ،امریکہ وافریقہ ہی نہیں مکہ اور مدینہ کی بھی زیارت کی۔

اسفار کی نیرنگیوں نے خاکوں کی شکل اختیار کی تو کووڈ-۱۹ کے زمانے میں ایک سے بڑھ کر ایک خاکہ قلم بند کیا۔ہر خاکہ لطفِ زبان اورلطفِ بیان کا ایسا مرقع،جس میں ادبی نکات اور مزاحیہ عناصر مدغم ہوتے ہیں اور صاحبِ کردار کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔وہ خاکوں کی ابتدا نہایت شگفتہ انداز سے کرتے،پھر درمیان میں سادہ اور عام فہم انداز میں ایسی چٹکیاں لیتے کہ قاری وسامع باغ باغ ہوجاتا۔

اِس شگفتہ مزاج شخصیت سے میرے مراسم ۱۹۷۵ء سے شروع ہوئے تھے۔شعبۂ اردو کے علاوہ ڈاکٹر نعیم احمد اور قاضی عبدالستار کے یہاں اُن سے گفتگو رہتی تھی۔میں آفتاب ہال کے ممتاز ہوسٹل میں رہتا تھا۔شام کو ٹہلتے ہوئے شمشاد مارکیٹ ضرور جاتا تھا۔یونیورسٹی کی یہ مارکیٹ انوپ شہر روڈ پر واقع ہے۔سوئمنگ پول کے سامنے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کی کوٹھی ہے۔اِسی آفتاب منزل کے ایک حصہ میں ڈاکٹر نعیم احمد رہتے تھے۔تھوڑے فاصلے پر سلیمان ہال کے صدر دروازہ کے بالمقابل یونیورسٹی کی عمارت کے بالائی حصہ میں قاضی عبدالستار رہتے تھے۔ان کی رہائش کے نیچے کے حصے میں کشن سنگھ کی کتابوں کی دوکان''کتاب گھر'' کے نام سے تھی۔

حبیب ہال سے تصویر محل تک،انوپ شہر روڈ کے ڈیڑھ کلومیٹر کا یہ حصّہ شام کو طلبہ سے آباد رہتا۔چاہے بُوم کلب کے متوالے ہوں یا سنڈے کلب کے دیوانے،کسی نہ کسی ڈھابے کی رونق میں اضافہ کرتے نظر آتے۔پیغام آفاقی،آشفتہ چنگیزی، فرحت احساس،خورشید احمد،نسیم احمد،کفیل احمد،غضنفر،مہتاب حیدر نقوی،غیاث الرحمن،طارق چھتاری،سید محمد اشرف،ذوالفقار علی جیسے ادب نواز طالب علم،جن میں کچھ نیا کرنے اور ادبی اُفق پر چھا جانے کی لگن۔ان بھری پری اور رونق دار محفلوں کو چھوڑ

کر، ابن کنول دہلی چلے گئے۔ اچانک اُن کے چلے جانے کا سب ساتھیوں نے درد محسوس کیا۔ دہلی میں جلد ہی اُنھیں تنویر احمد علوی اور قمر رئیس جیسے اساتذہ میسّر آئے مگر علی گڑھ کے دوست احباب نہیں مل سکے۔ اِسی کسک کی وجہ سے وہ ہمیشہ علی گڑھ کے احباب سے ملنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالا کرتے تھے ؎

تم آگئے زہے قسمت تمہاری عمر دراز
تمہارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے

اپنی وضع خاص کے اِس مُخلص انسان نے زندگی کی آخری رات بھی علی گڑھ کی نمائش میں گُزاری۔ ۱۱ر فروری بروز سنیچر شعبۂ اردو میں آئے۔ اپنے دوست سید محمد امین سے ہنستے، مسکراتے، قہقہے لگاتے، جمال پور کے لیے رُخصت ہوئے۔ جمال پور میں اُن کی بیگم ان کے سب سے بڑے بھائی قاضی جاوید ناصر کے یہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ظہر کی نماز کے لیے وضو کیا مگر قلب کے شدید دورہ نے مزید مہلت نہیں دی بقول ظفرؔ زیدی ؎

چل دیا ایک اور پتہ ٹوٹ کر
آندھیوں کے دوش پر تکیہ کیے

ہنستا، مسکراتا، نئے نئے تقاضوں کو قبول کرنے والا یہ خوبصورت انسان ایسی راہ پر گامزن ہوا کہ ؎

درپیش وہ سفر ہے شناسا جہاں نہیں
نکلے ہیں خالی ہاتھ لئے اپنے گھر سے ہم

☆☆☆

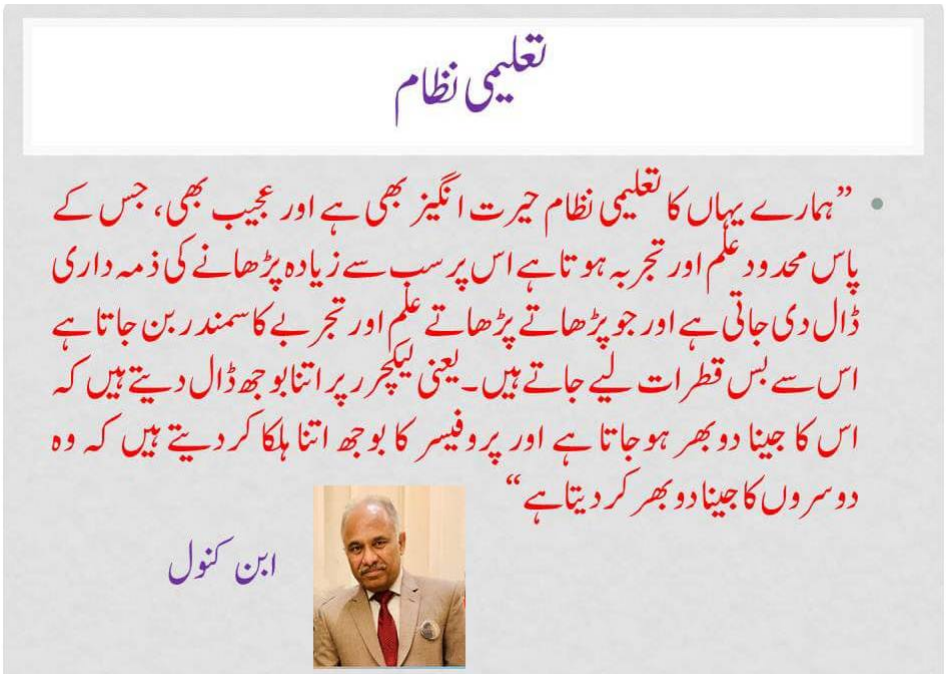

ہمدمِ دیرینہ- پروفیسر ابنِ کنول

ڈاکٹر صابر گودڑ
سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ، موریشس
E-mail: swabirgood@yahoo.com

۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ پروفیسر ابنِ کنول میرے سینئر تھے۔ علی گڑھ میں ان سے زیادہ ملاقاتیں نہیں ہوئیں۔ لیکن تعلیم مکمل کرنے کے بعد ماریشس سے ان سے میل جول کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا کہ ہمارے درمیان کا فاصلہ قربت میں استواری کی بنیاد پر مٹ چکا۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ہفتہ دو ہفتے بعد ان سے مختلف موضوعات پر بالخصوص عالمی تناظر میں اردو، ان کی تخلیقات حتیٰ کہ شب و روز کے مشاغل کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ یہ سب جدید ٹکنالوجی کا فیض ہے کہ ہم غالبؔ کی طرح ہجر میں بھی وصل کے مزے حاصل کرتے ہیں۔ اگست ۲۰۰۳ء میں اردو اسپیکنگ یونین نے ماریشس میں بڑے پیمانے پر دوسری عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ دنیائے اردو سے تعلق رکھنے والے مختلف ممالک کے مشاہیر اور نابغۂ روزگار تشریف لائے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک یادگار کانفرنس تھا۔ مندوبین میں کیرالہ کے گورنر عزت مآب سکندر بخت، پروفیسر ظہورالدین، پروفیسر فتح محمد ملک، احمد فراز، کشور ناہید، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر انیس اشفاق، ندا فاضلی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر شاہد ماہلی، ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز، ڈاکٹر لدمیلہ واسی لیوا، ایرینا میکسی مینکو، پروفیسر تاش مرزا، پروفیسر آزادشاتوف، پروفیسر امیر عارفی اور پروفیسر ابنِ کنول وغیرہ شامل تھے، کانفرنس کے لیے انہوں نے ''اردو میں ناول'' مقالہ پڑھا تھا۔ ہماری دوستی جیسے رشتہ داری میں تبدیل ہو گئی۔

ابنِ کنول نے ان برسوں میں بہت کچھ لکھا۔ ان کی تحریریں تقریباً چار پانچ دہائیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ عالمی وبا کی قیدِ تنہائی میں انہوں نے جس قدر اپنے قلم کے گھوڑے دوڑائے اس سے ان کے فن، اسلوب، طرزِ تحریر اور فطری جہت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس درمیان انہوں نے مسلسل خاکے اور انشائیے قلمبند کیے جو کتابی صورت میں منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

ادیب جب کسی تخلیقی عمل سے گزرتا ہے اور اپنے تجربات، خیالات، جذبات اور احساسات کو کاغذی پیرہن عطا کرتا ہے تو وہ قارئین تک پہنچتا ہے۔ ہر قاری انفرادی طور پر اس کا مطالعہ کرتا ہے اور نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ ابنِ کنول کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف اپنے فن کو قارئین تک پہنچایا ہے بلکہ بزبانِ خود خاکوں اور انشائیوں کی قرأت سے چار چاند لگا دئے ہیں۔ سلیس، عام فہم، بامحاورہ زبان، لب ولہجہ کے اتار چڑھاؤ، اندازِ بیاں، مکالماتی انداز، موقع و محل کی مناسبت سے طنز کے نشتر سے ہر تخلیق کی عکاسی اس قدر واضح ہو گئی ہے کہ پوری تصویر اور منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور سمجھنے اور نتیجہ اخذ کرنے کے

لیے ذہنی کاوش درکار نہیں ہوتی۔ یہ ادبی فن پارے یقیناً اصنافِ مذکورہ میں اضافے کے باعث ہیں۔

بات چلی تھی ماریشس میں عالمی اردو کانفرنس کی۔ ان کی تشریف آوری سے ہماری پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور شعبۂ اردو کے حوالہ سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کل کی بات ہو۔ فیکلٹی، مولانا آزاد لائبریری، کنیڈی ہال کے ادبی وتفریحی پروگرام، شمشاد مارکیٹ، تصویر محل کی چائے، علی گڑھ کی سالانہ نمائش، یونین کا الیکشن، غرض کہ علی گڑھ کا پورا علمی، تہذیبی وثقافتی نقشہ سامنے تھا۔ ابنِ کنول ہی نہیں بلکہ سبھی کہتے ہیں کہ جو علی گڑھ جاتا ہے علی گڑھ کا اسیر ہوجاتا ہے۔ چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو اس کی شناخت علی گڑھ ہی سے ہوتی ہے۔

جب میں مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ اردو کا صدر ہوا تو بی اے اردو امتحانات کے لیے بحیثیتِ بیرونی ممتحن ان کا نام انتظامیہ کو تجویز کیا اور تین سال کے لیے منظوری دی گئی۔ ابنِ کنول نے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھائے اور اپنی مفید آراء سے ہمیں نوازتے رہے۔ شعبے کے اساتذہ کے ساتھ دوستانہ ماحول میں میٹنگ ہوتی لیکن کبھی ان کی شخصیت میں انا کا پہلو نظر نہیں آیا۔ ان کے اعزاز میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ اور اردو اسپیکنگ یونین میں استقبالیہ پروگرام منعقد ہوئے۔ ادبی نشستیں بھی لگیں جن میں خاصی تعداد میں طلباء اور کالج کے اساتذہ نے شرکت کر کے ان کے علمی خطابات سے استفادہ کیا۔ ایک مرتبہ ان کے ساتھ ''افسانہ کی ایک شام'' نامی پروگرام اردو اسپیکنگ یونین میں رکھا گیا۔ انہوں نے اپنے مشہور افسانہ لچھمی جب حاضرین کو اپنے مخصوص انداز میں پڑھکر سنایا تو کئی لوگوں میں رقت طاری ہوگئی۔ حقیقت اور جذبات سے مملو اس افسانہ کو اگر ایک شاہکار کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ ابنِ کنول کی منتخب اور مرتب شدہ شعری ونثری اصناف پر کتابیں ماریشس کے طلباء کے لیے کارآمد اور مفید ثابت ہوئیں۔ اور جو قلت اس ضمن میں کئی برسوں سے محسوس کی جارہی تھی وہ دور ہوگئی۔ ان کے افسانے یہاں کے جامعۂ اردو اور نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ امتحانات بورڈ کی مجوزہ نصابی کتب میں شامل کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں، ان کی کتاب ''داستان سے ناول تک'' طلباء اور اساتذہ شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ امتحان کے نقطۂ نظر سے یہ ایک بے حد مفید کتاب ہے۔ اب جبکہ ان کی کتاب ''داستان کی جمالیات'' شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کے ایم اے کے طلباء اور ریسرچ اسکالرز ضرور استفادہ کریں گے۔

قیام ماریشس کے دوران ابنِ کنول صاحب نے تارکینِ وطن کی تاریخ، یہاں کے قدرتی مناظر، رسم ورواج، تہذیب و ثقافت، کثیر المذاہب معاشرہ اور مذہبی وسماجی سرگرمیوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہوں نے ماریشس کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کو اپنی ایک طویل نظم بعنوان ''ماریشس کا سونا'' میں اتنی وضاحت اور خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے جیسے کہ وہ خود یہاں کا باشندہ ہو۔ اگرچہ انگریزوں نے کہا تھا کہ یہاں پتھر الٹنے سے سونا ملتا ہے جو کہ سراسر دھوکا تھا۔ لیکن ابنِ کنول نے اپنے قلم کے جادو سے ان محنت کش مزدوروں کے ذریعے خون پسینے سے بنجر نما جزیرے کو دلکش اور خوبصورت ملک میں تبدیل کر کے حقیقی سونا پانے پر سچ ثابت کیا ہے۔ نظم میں وطن پرستی کی جو کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ یہ نظم اردو اسپیکنگ یونین کے

سہ لسانی رسالہ ''صدائے اردو'' میں شایع ہو چکی ہے۔اور ریڈیو انٹرویو میں نشر ہوئی ہے جسے سامعین نے بہت سراہا تھا۔

ابنِ کنول صاحب کی سادہ مزاجی اور سادگی نے ہم سب کو متاثر کیا۔ یہاں کے اردو طبقے اور دیگر شعبۂ حیات کے لوگوں سے ملاقات اور گفتگو کے دوران ان کی ساری خصوصیات ہم پر واضح ہو جاتیں۔ وہ غیر ملکی طلباء کی اردو کو بہتر بنانے اور ان کی رہنمائی کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔آج بھی ان کی زیرِ نگرانی یہاں کے طلباء اور اساتذہ پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھنے میں ملوث ہیں۔ یہاں کی جن ادبی اور غیر ادبی شخصیات سے وہ ملتے رہے ان میں سابق صدرِ جمہوریہ ٔماریشس عبد الرؤف بندھن،مرحوم احمد عبداللہ احمد، قاسم ہیرا،عنایت حسین عیدن،شہزاد عبداللہ احمد،مرحوم ڈاکٹر ریاض گوکھول، ڈاکٹر رحمت علی، انور دوست محمد، ڈاکٹر آصف علی محمد، ڈاکٹر نازیہ جافو خان،سکینہ رسم علی، فاروق رجل، رشید نیروا، فاروق بوچا، خالق بوچا،سعید میاں جان، زینب جومن،گلناز جومن، فاروق حسنو، قاسم علی محمد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ فہرست کافی طویل ہے۔وہ یہاں کے قلم کاروں کی تحریریں پڑھتے رہتے ہیں اور ان پر اپنی رائے دیتے رہتے ہیں۔بعض احباب کی کتابوں پر تحسینی کلمات بھی قلمبند کیے ہیں۔

۲۰۱۸ء میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے جانب سے دلی میں عالمی اردو کانفرنس ہوئی۔ابنِ کنول صاحب کے ایما پر اس ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا۔ابنِ کنول کی ہمیشہ دلی خواہش رہی کہ اردو کی نئی بستیوں میں ماریشس کی اردو خدمات کو سراہا جائے۔ ماریشس کے لیے ان کے دل میں یہ نرم گوشہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہمیں اپنا سمجھتے ہیں۔کانفرنس کے بعد ہم نے ان سے علی گڑھ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ کہنے کی دیر تھی۔سارا انتظام انہوں نے خود کیا۔شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر ہاشم سے رابطہ قائم کر کے مقالہ پڑھنے کا تذکرہ بھی کیا۔ یہ سب کچھ تھوڑے عرصے میں طے ہو گیا اور ہم علی گڑھ گاڑی کے ذریعے پہنچے۔

شعبۂ اردو میں اساتذہ اور دیگر احباب سے مل کر بے انتہا مسرت حاصل ہوئی۔شفیق استاد، پروفیسر ابوالکلام قاسمی اور کینڈا سے ولی عالم شاہین بھی موجود تھے۔شاہین صاحب نے اپنے مجموعے سے چند نظمیں گوش گزار کرائیں۔قاسمی صاحب نے شاہین صاحب کے کلام پر اظہارِ خیال کیا اور میرے متعلق چند باتیں کیں۔ابنِ کنول نے افسانے کے حوالہ سے گفتگو کی اور میں نے ماریشس کی اردو تخلیقات پر پیپر پڑھا۔ایم اے اور ایم فل کے طلباء نے کئی سوالات کیے۔ مجھے اپنا زمانہ یاد آ گیا۔شعبہ کے سمینار میں حاضر ہو کر ادبی محافل سے مستفیض ہونا۔وہ دن بھی یاد آیا جب علی گڑھ کو الوداع کہتے وقت میں نے استاد محترم قاضی عبدالستار کو اپنی ڈائری میں اوٹو گراف لکھنے کی درخواست کی۔انہوں نے جو حوصلہ افزا جملہ تحریر کیا تھا وہ آج بھی میرے دل و دماغ میں نقش ہے۔''خدا کرے تم ماریشس میں اردو کی شمع روشن کر سکو''۔ابنِ کنول نے ہلکی سی مسکراہٹ زیرِ لب لاتے ہوئے کہا ؛ ہم دونوں خوش قسمت ہیں کہ قاضی عبدالستار جیسے عظیم استاد سے پڑھنے کا موقع ملا۔ابنِ کنول کا خاکہ منٹو سرکل اور علی گڑھ کا جغرافیہ پڑھنے کے بعد Aligarian کے دل میں وہ حسین یادیں کیسے مٹ سکتی ہیں۔وہ جب دلی آئے تو یہیں کے ہو کر رہ

گئے لیکن علی گڑھ سے ان کا رشتہ منقطع نہیں ہوا۔ آج بھی جب ہم محوِ گفتگو ہوتے ہیں تو ذکرِ علی گڑھ موضوعِ سخن ضرور ہوتا ہے۔

ابنِ کنول کے دوست واحباب اور شناسا کئی ملکوں میں مقیم پذیر ہیں۔ ان سے با قاعدہ رابطے میں رہتے ہیں۔ کئی بیرونی ممالک کا سفر بھی کیا۔ کبھی ممتحن تو کبھی کانفرنس میں شرکاء کی حیثیت سے۔ ان کی شناسائیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں اردو زبان سیکھنے کا شوق ہے۔ اس کے پیشِ نظر انہوں نے ''آؤ اردو سیکھیں'' نامی کتاب بچوں کی سطح پر اتر کر تحریر کی اور یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ بھی نہیں کہ ادبِ اطفال پر قلم اٹھانا ہر کس وناکس کی بات نہیں۔ بقولِ غالب جوئے شیر لانے کی مترادف ہے۔

میرے تخلیقِ سفر میں ابنِ کنول نے ہمیشہ ساتھ دیا ہے۔ میرے شعری مجموعہ ''درد کا سفر'' کے لیے اپنی مفید اور گراں قدر آراء سے نوازا ہے۔ اس مجموعہ میں ان کی پیش گفتار اور پروفیسر فاروق بخشی اور پروفیسر محمد کاظم کی تقاریظ بھی شامل ہیں۔ جس سے میری ہمت افزائی ہوئی ہے۔ میں ان کے بے حد مشکور ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ دنیا میں کچھ لوگ جب بڑے عہدوں میں فائز ہوجاتے ہیں یا شہرت کی بلندیوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں تو اپنی انا کا لبادہ اتارنا باعثِ توہین سمجھتے ہیں۔ اپنی انا کے خول سے نکل کر دوسروں کی معاونت تو دور کی بات ہے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ دیارِ غیر میں ہم جیسے اردو کی بجھتی ہوئی لو میں تیل ڈالنے پر ہوا کو روکنے کے بجائے مزید پھونک مارتے ہیں۔ مگر بلا مبالغہ میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ابنِ کنول میں یہ منفی سوچ قطعی نہیں پائی جاتی۔

ابنِ کنول جتنے اچھے انسان ہیں اتنے مخلص مہمان نواز بھی ہیں۔ ضروری نہیں کہ انسان عالیشان محلوں میں رہائش پذیر ہو مختصر مکان میں رہ کر بھی مہمان نوازی کے لیے اپنے دل کے دروازے کو وا رکھتے ہیں۔ یہ جان کر بے حد خوشی حاصل ہوئی کہ ان کے شاگرد اردو ریسرچ جرنل کے ایڈیٹر عزیز احمد صاحب استادِ محترم ابنِ کنول اور ان کی ادبی خدمات پر کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ میں ان کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ان کی یہ سعی ضرور پایۂ تکمیل تک پہنچے گی۔

ے

دشوار ہے مگر وہی منزل تلاش کر
ہمت نہ ہار موج میں ساحل تلاش کر

****

منفی ماحول کا مثبت استعارہ: ابن کنول

پروفیسر محمد کاظم
شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

ایک ایسی شخصیت پر قلم اٹھانے کا حکم ہوا ہے جن کے بارے میں لکھنے کا یارا میرے اندر ابھی بالکل ہی نہیں ہے۔ دہلی آنے کے بعد اب تک جن چند شخصیات نے مجھے سنوارنے کی کوشش کی ان میں سے ایک پر قلم اٹھانے کی جسارت کر رہا ہوں۔ قلم میں روشنائی تو ہے لیکن انگلیوں میں وہ توانائی ابھی محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ قلم کا بوجھ بھی اٹھا سکے۔ لیکن وہ شخصیت ہی ایسی ہے کہ جن پر لکھے بغیر چارہ بھی نہیں اور وہ شخصیت ہیں پروفیسر ناصر محمود کمال یعنی ابن کنول۔ بقول فاروق بخشی ؎

سایا بھی دیں گے پھول بھی اور پھل بھی آئیں گے
پودے رفاقتوں کے یہاں بو گیا ہے وہ

گزشتہ دنوں جو کچھ ہوا اس سے تو کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ایک جانب سینکڑوں لوگ افسردہ ہیں تو اسی غمناک ماحول میں کچھ لوگوں نے تو بے حسی کی حد اس قدر پار کر لی کہ انسانیت شرمسار ہوتی نظر آئی۔ بقول داغؔ دہلوی ؎ 'پر تمھیں شرمسار کون کرے'۔ لیکن ان کے ساتھی، دوست، رشتہ دار اور شاگرد ابھی بھی نم آنکھوں سے نہ صرف انھیں یاد کر رہے ہیں بلکہ ان کی عادت اور خصلت کے مطابق منفی فکر رکھنے والے افراد کو نظر انداز کر کے اپنا کام مثبت طور پر کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ خود کہتے تھے: 'میاں منفی باتوں اور پہلوؤں کو یاد بھی نہ کیا کیجیے اس سے آپ کے مثبت کاموں پر اثر پڑتا ہے اور آپ کی صلاحیت اور توانائی ضائع ہوتی ہے۔' آیئے ان کے حوالے سے چند باتیں کر لی جائیں۔

منظر: ایک

میں 1992 میں دہلی آیا۔ یہ شہر میرے لیے نہ صرف نیا تھا بلکہ یہاں کا ماحول اور زبان دونوں ہی میرے لیے اجنبی اور نامانوس تھے۔ اس ماحول میں مجھے سفر کرنے میں پریشانی ہوتی تو دوسری جانب خود کو درست کرنے کا موقع فراہم ہوتا۔ لیکن ابتدائی دنوں میں درست کرنے کا موقع کم اور کرخت زبان ہی نہیں بلکہ ڈانٹ ڈپٹ سننے کا موقع زیادہ ملا۔ کلکتے میں ہم لوگ بس کے ٹکٹ کنڈکٹر کو ڈانٹتے تھے لیکن یہاں معاملہ الٹا تھا۔

1993 میں فروری یا مارچ کا مہینہ رہا ہوگا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان مہینوں میں جلسے جلوسوں کی بہار ہوتی ہے۔ اس زمانے میں دہلی اردو اکادمی نہ صرف فعال تھی بلکہ اچھے اچھے موضوعات پر معیاری سمینار کا انعقاد بھی کیا جاتا تھا۔ غالب اکادمی اس طرح کی سرگرمی کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ سو یہاں کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں شامل ہونے کی غرض سے میں بھی اپنے سینئر

اور ساتھیوں کے ساتھ وہاں اکثر جاتا رہتا تھا۔مختلف اجلاس میں ملک کی مختلف ریاستوں سے تشریف لانے والے اہل علم و ہنر مقالے پیش کرتے تھے۔ایک جلسے میں ان میں سے ایک قدرے پست قامت، لمبے بال (کم وبیش کاکل)، چوڑی پیشانی، روشن آنکھیں، آواز میں خاص طرح کی کھنک، چہرے پر تازگی، مزاج میں نرمی اور ملائمیت کے ساتھ بذلہ سنج، خوش گفتار، خوش اخلاق اور خوش لباس (چار جیبوں والے سفاری سوٹ میں ملبوس) شخصیت نے داستان کے حوالے سے نہایت بے باکی سے اپنا مقالہ پیش کیا۔چوں کہ داستان ہمارے نصاب کا اہم حصہ تھا اس لیے اس مقالے میں دلچسپی زیادہ رہی۔مقالہ ختم ہوا۔جیسے ہی وہ اسٹیج سے نیچے اترے میں نہایت گرم جوشی سے ان کی جانب بڑھا اور مبارکباد پیش کی۔تب معلوم ہوا کہ آپ ابن کنول صاحب ہیں۔اس وقت ان سے یہ جاننے کی ہمت نہیں کر سکا کہ وہ کہاں سے وابستہ ہیں۔پھر مختلف سمیناروں میں انھیں سننے کا موقع ملا اور نہ جانے کیسے میرے ذہن میں یہ بیٹھ گیا کہ ابن کنول صاحب دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج سے وابستہ ہیں۔اس زمانے میں ان سے متعلق یہ ذہن نشیں ہو گیا تھا کہ وہ ہمیشہ سفاری سوٹ ہی پہنتے ہیں اور کالج میں اردو کے استاد ہیں جنھیں داستان سے خصوصی دلچسپی ہے۔اسی زمانے میں شمس الرحمن فاروقی صاحب کا داستان کے حوالے سے خصوصی خطبہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں سننے کو ملا تھا اور اس میں ابن کنول صاحب کو بہت سرگرم پایا جس سے یہ محسوس ہوا کہ اس خطبے کا انعقاد انھوں نے ہی کیا ہے۔بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شعبہ اردو کے نظام خطبات کے تحت منعقد ہوا تھا۔یہ خطبہ دراصل فاروقی صاحب کے وقیع اور بسیط مطالعے کی تلخیص تھا جو بعد میں کتابی صورت میں 'ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ' کے عنوان سے کئی جلدوں میں منظر عام پر آیا۔

منظر:دو

1995 میں ایم فل کی ڈگری مجھے مل چکی تھی اور پی ایچ ڈی میں داخلہ ہو چکا تھا۔اسی زمانے میں دہلی یونیورسٹی میں اردو کے لکچرر کی اسامی آئی۔اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ میں نے بھی فارم بھر دیا تھا۔حسب معمول فارم پر کرنے کے بعد میں اسے بھول کر پی ایچ ڈی کے کام میں مصروف ہو گیا۔اس دوران دہلی یونیورسٹی کے موڈرن انڈین لینگویجز کے شعبہ میں پروفیسر اندرا پارتھا سارتھی اور ایک تمل یا تلگو کے استاد سے ملنے کی غرض سے کئی بار جانے کا موقع ملا۔میں ڈرامے پر کام کر رہا تھا اور یہ دونوں شخصیتیں ڈرامے کے حوالے سے نہایت اہمیت کی حامل تھیں۔انشخصیات سے ملنے کے بعد میں شعبہ اردو میں بھی چلا جاتا تھا۔حسن اتفاق کہ ابن کنول صاحب سے ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔اس سے میرے اس خیال کو مزید تقویت ملی کہ ابن کنول صاحب کالج کے استاد ہیں۔2002 میں لکچرر کی بحالی کے لیے انٹرویو ہوا اور اس میں مجھے بفضل خدا کامیابی ملی۔ان دنوں میں وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند، نئی دہلی سے شائع ہونے والے ادبی وثقافتی مجلہ 'آجکل' کی ادارتی ٹیم میں شامل تھا۔21 نومبر 2002 کو جب وزارت سے ریلیو ہو کر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں جوائن کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تو شعبے میں جس پہلی شخصیت سے ملاقات ہوئی وہ ابن کنول صاحب تھے۔انھوں نے نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ مجھے گلے سے لگایا اور

ہاتھ پکڑ کر صدر شعبہ اردو، پروفیسر صادق صاحب کے پاس لے گئے اور کہا یہ لیجیے۔۔۔۔آپ کا فعال اور متحرک نوجوان ڈرامے کا شوق رکھنے والا جن کے بارے میں آپ دریافت کر رہے تھے۔ پھر وہ مجھے صدر شعبہ کے کمرے میں بٹھا کر دفتر میں گئے اور جب لوٹ کر آئے تو ان کے ساتھ دفتری شرما جی ہاتھ میں ایک کاغذ لیے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا وہ میرا جوائننگ لیٹر ہے اور مجھے صرف دستخط کرنے ہیں۔ یہاں ایک نئے ابن کنول صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پیشانی مزید روشن، چہرے پر قدرے زیادہ سنجیدگی، چار جیبوں والے سفاری سوٹ کی جگہ کوٹ اور پتلون کے ساتھ ٹائی میں ملبوس بالکل الگ نظر آ رہے تھے۔ ہاں ان کی بذلہ سنجی اور خوش گفتاری ہنوز حسب سابق جاری تھی۔ اگر کچھ تبدیلی محسوس ہوئی تو ان کے اخلاق میں۔ اس بار وہ پہلے سے زیادہ با اخلاق اور عزیزوں پر دست شفقت رکھنے والے معلوم ہوئے۔ اس دن جا کر میری یہ غلط فہمی دور ہوئی کہ وہ کروڑی مل کالج میں نہیں بلکہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر ہیں۔ اس دن میں بہت شرمندہ ہوا اور ان سے اپنے دل کی بات کہی کہ اب تک میں آپ کو کروڑی مل کالج کا استاد ہی سمجھ رہا تھا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: 'اب آپ شعبے میں شامل ہو گئے ہیں تو رفتہ رفتہ بہت کچھ معلوم ہو جائے گا'۔ اس دن تو بہت زیادہ گفتگو نہیں ہوئی لیکن ان کی شخصیت کا نقش ذہن میں محفوظ ہو گیا۔

ابن کنول صاحب یوں تو کم گو لیکن خوش لباس تھے۔ اچھے کپڑے، نئے نئے جوتے اور سینڈل خریدتے، کبھی کبھی کیجول میں انھیں شعبہ میں نہیں دیکھا۔ چیزوں کو بہت سنبھال کر رکھتے تھے۔ یونیورسٹی کے 75 برس مکمل ہونے پر تمام اساتذہ کو کلائی گھڑی دی گئی تھی۔ 2022 میں یونیورسٹی کے 100 برس پورے ہونے کے بعد بھی وہ گھڑی ان کی کلائی میں تھی۔ انھیں موبائل فون کا بہت شوق تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ موبائل کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کے پاس بھی اس کا نمونہ موجود رہتا تھا۔ ابھی ان کے پاس نیا آئی فون آیا تھا۔ نئے لباس اور گجٹ کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی ذہانتوں کی قدر کرتے تھے اور خود بھی مسلسل پڑھتے لکھتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے اندر علمیت کا زعم نہیں تھا۔ جب کہ ان کی کتابوں کی فہرست تیار کی جائے تو ان میں ''چار کھونٹ (۲۰۲۲)، کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی (۲۰۲۰)، بزم داغ (۲۰۲۰)، تنقیدی اظہار (۲۰۱۵)، پچاس افسانے (۲۰۱۴)، میرا من (۲۰۱۲)، اردو افسانہ (۲۰۱۱)، تنقید و تحسین (مضامین، ۲۰۰۶)، داستان سے ناول تک (۲۰۰۳)، بند راستے (۲۰۰۰)، ہندوستانی تہذیب: بوستان خیال کے تناظر میں (۱۹۸۸)، تیسری دنیا کے لوگ (۱۹۸۴)'' وغیرہ ان کی فکر، مطالعہ اور تحقیق و تنقید کے قابل تحسین نمونے کے طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ اسی طرح ''(سفرنامہ حج، کنول ڈبائیوی، ۲۰۲۱)، نظیر اکبر آبادی (منتخب شاعری، ۲۰۱۳)، مضراب (کنول ڈبائیوی، ۲۰۱۰)، تحقیق و تدوین (۲۰۰۶)، اصناف پارینہ (مثنوی، قصیدہ، مرثیہ ۲۰۰۵)، بحر تجلیات انتخاب سخن (اردو شاعری کا نیا انتخاب، ۲۰۰۵)، منتخب غزلیات (امیر خسرو سے ناصر کاظمی تک، ۲۰۰۵)، منتخب نظمیں (۲۰۰۵)، سیرت مسیح (۱۹۹۸)، ریاض دلربا (منشی گمانی لعل، ۱۹۹۰)'' وغیرہ ان کی تحقیق و تدوین کا ثبوت ہیں۔

صادق صاحب کے بعد شعبہ اردو کی صدارت 10 اپریل 2005 کو تین برس کے لیے ان کے سپرد کی گئی۔ اس وقت بھی

ان کے دوست اور دشمن دونوں نے چہ مگوئیاں کیں لیکن انھوں نے حسب عادت منفی باتوں پر کبھی کان نہ دھرا۔ بلکہ اپنے دشمنوں کے لیے بھی اچھے الفاظ ہی استعمال کیے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے: 'میاں آپ بھلا کرتے جائیں، برا کرنے والوں کو اللہ پر چھوڑ دیں، بلکہ اس جانب توجہ ہی نہ دیں'۔ اور انھوں نے ہمیشہ ایسا ہی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا برا چاہنے والوں کو کبھی کامیابی نہ ملی بلکہ خود ہی رسوا اور ذلیل وخوار ہوئے۔ ان تین برسوں میں انھوں نے اپنے بزرگ رفقا کے تجربے، ہم عصروں کی محبت اور نئی نسل کی توانائی کو ذہن میں رکھتے ہوئے حسب ضرورت ان کی مدد لی۔ بزرگوں نے ان کی رہنمائی کی، تو ہم عصروں نے مصلحت سے کام لیا اور نئے لوگوں نے اپنی توانائی اس غرض سے لگا دی کہ کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ ان میں سے کچھ کو سیکھنے کی للک تھی اور تو کچھ سہولت اور آرام پسند ثابت ہوئے تو کچھ نے اپنی دلچسپی کے مطابق صرف اپنا کام کرنے کو ترجیح دی۔

جب ہم لوگوں کی تقرری ہوئی تو اس زمانے میں اڈھاک اساتذہ کو مزید توسیع نہیں دی گئی۔ اپنی تقرری کی خوشی کسے نہیں ہوتی لیکن کسی کے بے روزگار ہو جانے کا دکھ بھی بہت ہوتا ہے۔ جب ابن کنول صاحب صدر شعبہ ہوئے تو انھوں نے پھر سے کوشش شروع کی تا کہ اڈھاک اساتذہ کے لیے کوئی گنجائش نکل سکے اور انھیں اس سلسلے میں کامیابی بھی ملی۔ اور پھر یکے بعد دیگرے ان اساتذہ کو پھر سے شعبہ سے وابستہ کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے کب، کن حالات میں اور کیسے کیسے ان کی مدد کی یہ ان کا دل ہی جانتا ہے۔ ان میں سے بعض اس کا اعتراف کرتے ہیں تو بعض نے احسان سوزی کی حد پار کر دی۔ صرف اس زمانے میں ہی نہیں بلکہ بعد کے دنوں میں بھی مدد اور تعاون کرنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا رہا۔ ابن کنول صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک تھے مگر ان میں ایک عیب یہ تھا کہ ان کی یادداشت بہت کمزور تھی۔ وہ اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے منفی رویے اور شخص کو بہت جلد بھول جاتے تھے۔ ہاں ان کے لیے اگر کسی نے ذرہ برابر بھی مثبت رویہ رکھا تو نہ صرف ان کو یاد رکھتے تھے بلکہ اس کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ اور شاید یہی یادداشت ان کی خوشی اور ترقی کی ضامن تھی کہ پول آفیسر کی حیثیت سے شعبہ سے وابستہ ہوئے اور اپنی مسلسل محنت اور مثبت فکر کی وجہ سے سینئر پروفیسر کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔

منظر: تین

پروفیسر ابن کنول صاحب نے دو قسطوں میں کم وبیش ساڑھے سات برس شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبہ رہے۔ پہلی بار 10 اپریل 2005 سے 9 اپریل 2009 تک اور دوسری بار 10 اپریل 2014 تا 30 ستمبر 2018۔ انھوں نے ان برسوں میں شعبہ میں وہ ماحول پیدا کیا کہ کیا اساتذہ بلکہ طالب علم بھی جب چاہیں ان سے نہ صرف مل سکتے ہیں بلکہ راہ چلتے ہوئے اپنے کاغذات ان کے سامنے رکھ دیں اور وہ بخوشی اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیں۔ بعض اوقات طالب علم سے ہی قلم لے کر دستخط کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان کے ان ساڑھے سات برسوں کی صدارت کے دوران کبھی ان کی جیب یا میز پر سبز سیاہی والا قلم (گرین پین) نہیں دیکھا اور نہ ہی ان کے دستخط کی مہر ہی نظر آئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو عہدے کی وجہ سے ان کا دماغ خراب ہوا اور نہ ہی وہ سہولت پسند تھے۔ اپنا کام نہایت سنجیدگی سے کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی کوشش ہوتی کہ ان کی

وجہ سے کسی دوسرے کا نقصان نہ ہو۔ ہاں بذات خود ان کو اس کی وجہ سے کئی بار خسارہ اٹھانا پڑا۔

پروفیسر ابن کنول صاحب نے اپنے سے چھوٹوں کو ہمیشہ عزیز رکھا۔ پہلے چائے خانے پر جا کر چائے پینے کا رواج نہیں تھا۔ ہم لوگوں کے آنے کے بعد پہلے علی جاوید صاحب اور پھر بعد میں پروفیسر ابن کنول صاحب ساتھ میں چائے پینے لگے۔ جب بھی وہ ساتھ رہتے ان کی کوشش یہی رہتی کہ ہم میں سے کسی کو چائے کے پیسے نہ دینا پڑیں۔ سمینار اور کانفرنس میں بھی اپنے عزیزوں اور طالب علموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بعد کے دنوں میں پتہ نہیں کیوں مجھے بہت عزیز رکھنے لگے۔ میں اسکول کے زمانے سے مختلف طرح کی سرگرمیوں میں شامل رہا۔ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں اس میں مزید اضافہ ہوتا گیا اور دہلی یونیورسٹی میں آنے کے بعد انتظامی امور میں بھی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ محبت کے آدمی تھے اور نوجوانوں کی قدر کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی صدارت کی دوسری اور طویل مدت میں ان کو سمجھنے اور جاننے کا زیادہ موقع ملا۔ انھوں نے میری سرپرستی کی اور مجھ سے جو ہوسکا ان کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ میرے مشاہدے میں اب تک یہ تھا کہ سربراہ ہمیشہ خود نمائی اور Self-projection/appreciation میں لگے رہتے ہیں۔ مگر پروفیسر ابن کنول صاحب کے ساتھ خود تشہیری جیسی کوئی علت نہیں تھی۔ بلکہ ابن کنول ہمیشہ اپنے شاگردوں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھنے کے خواہشمند رہے۔ چنانچہ ان ساڑھے چار برسوں کے دوران شعبہ میں طالب علموں کی تربیت اور ان کی صلاحیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے ہر مہینے ادبی وثقافتی نشست کرنے کا فیصلہ کیا۔ جن طالب علموں کو افسانہ لکھنے کا شوق تھا ان کے لیے کسی اہم افسانہ نگار کو مدعو کر کے ان کے سامنے ان بچوں کو اپنا افسانہ پیش کرنے کا موقع دیا گیا اور مہمان ان کی حوصلہ افزائی کے ساتھ تربیت بھی کرتے رہے۔ جن کو شاعری کا شوق تھا انھیں اسی طرح کی محفل میں شعر پڑھنے کا موقع دیا گیا اور جنھیں تنقیدی وتحقیقی مضامین لکھنے کی خواہش تھی انھیں ان کا شوق پورا کرنے کا پورا موقع فراہم کیا گیا۔ ان طالب علموں کی حوصلہ افزائی اور تربیت کے لیے مہمانوں کے ساتھ ساتھ شعبے کے اساتذہ بھی موجود رہتے تھے۔ آخری زمانے میں تو ان محفلوں کی نظامت سے لے کر صدارت تک کے فرائض طالب علموں نے ہی ادا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ آج شعبے کے طالب علموں میں کئی اچھے افسانہ نگار ہیں تو کئی شعر گوئی میں مہارت حاصل کر چکے ہیں اور بہت سے طالب علم اچھے مضامین تحریر کر رہے ہیں۔ گویا انھوں نے اپنے طالب علموں میں افسانہ نگار، شاعر اور ناقد بننے کے جراثیم پیوست کر دیے جس کا نتیجہ ہم مانیں یا نہ مانیں ہمارے سامنے ہے اور ان میں سے کئی تو اب صاحب کتاب بھی ہیں۔ ان کی صدارت سے پہلے پی ایچ ڈی کا زبانی امتحان بند کمرے میں ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے طالب علموں میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور دوسرے ریسرچ اسکالرس اوع طالب علموں کی تربیت کے لیے اوپن وائیوا کا سلسلہ شروع کیا اور اس کا خاطر خواہ فائدہ بھی دیکھنے کو ملا۔

پروفیسر ابن کنول صاحب نہ صرف طالب علموں کی حوصلہ افزائی فرماتے بلکہ اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کو بھی موقع فراہم کرتے رہے۔ ہاں جن لوگوں نے سرد مہری دکھائی ان کی جانب توجہ کم ہوتی گئی۔ اس سرد مہری بلکہ بعض اوقات مخالفت کے

باوجود ان کی جانب سے کبھی منفی رویہ نہیں اختیار کیا گیا۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ انھوں نے ایک بار چار روزہ جشن اردو منانے کا ارادہ کیا۔ شعبہ کی میٹنگ میں طے بھی کیا گیا اور پھر اس کی تیاری میں وہ دن رات لگ گئے۔ اخراجات کے لیے تگ ودو شروع کی اور نہ صرف یہ کہ تمام مشکلیں آسان ہوگئیں بلکہ آخری وقت میں بھی پیسوں کی ضرورت پڑی تو اس میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ شاندار نظام اور غالب لکچر ہوئے، آل انڈیا مشاعرہ ہوا، ساحر کی طویل نظم کو اسٹیج کیا گیا، دو روزہ شاندار سمینار ہوا اور ایک شام قوالی کا پروگرام بھی رکھا گیا۔ اسی زمانے میں یونیورسٹی میں نئے نصاب بنائے گئے، پہلی بار NAAC کی ٹیم آئی اور قومی و مقامی سطح پر منعقد ہونے والے مختلف سمینار و کانفرنس، مشاعرے اور محفل افسانہ میں طالب علموں نے شعبے کی نمائندگی کی۔ شعبہ کے مختلف کورس میں داخلے نہ صرف آسانی سے ہوئے بلکہ زیادہ تعداد میں ہوئے۔ اپنے ہی شعبے سے ایم فل کرنے والے فیلو شپ پانے والے طالب علموں کو باہر کا راستہ دکھانے کے بجائے فیلوشپ پانے والے درخواست گزار ایک بھی ایسے نہیں تھے جن کو داخلہ نہ ملا ہو۔ وہ اکثر کہتے تھے: 'میاں! کتنی محنت اور مشکل سے یہ بچے فیلوشپ حاصل کرتے ہیں، اس لیے اگر ذرا کمزور بھی ہیں تو داخلہ دے دیجیے، ان کی تربیت کرنا ہی تو ہماری ذمہ داری ہے، وہ ہم لوگ کرلیں گے۔ ان میں سے بہت سے بچے ایسے ہیں جن کی فیلوشپ سے ان کے گھر کے چولہے جلتے ہیں۔' یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے میں فیلوشپ پانے والا ایک بھی طالب علم مایوس نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ نان نیٹ کے بھی پورے داخلے ہوئے۔

پروفیسر ابن کنول صاحب کے ساتھ اندرون ملک اور بیرون ملک سفر کرنے کے کئی مواقع مجھے ملے۔ ان کے ساتھ سفر کرنے میں نہ صرف لطف آتا تھا بلکہ ایک سرپرست کے ساتھ ہونے کا احساس ہمیشہ رہا۔ اکثر انھوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ 'یہ شعبے کے ایک متحرک اور مقبول استاد ہیں، ان کا خاص میدان ڈراما ہے لیکن انتظامی امور میں ماہر ہیں اور مجھے بہت عزیز ہیں۔'

منظر: چار

11 فروری 2023، دن سنیچر، شام کے تقریباً چار بجے میرے ایک عزیز شاگرد نے اپنا فون دیکھ کر مجھ سے کہا کہ ابن کنول سر کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ میں نے کہا: اللہ کا شکر ہے۔ ابھی تو پیر سے جمعرات تک ہم لوگ NCERT کے ایک ورک شاپ میں ساتھ تھے۔ وہیں انھوں نے عمرہ سے لوٹنے کے بعد علی گڑھ کے رشتہ داروں سے ملنے کا ذکر کیا۔ پھر وہیں بیٹھ کر شعبہ اردو کے چیئرمین پروفیسر محمد علی جوہر صاحب سے گفتگو کے بعد سنیچر یعنی 11 فروری 2023 کو ایک پی ایچ ڈی کا وائیوا طے کیا گیا تھا۔ ابھی وہ وائیوا لے کر فارغ ہوئے ہوں یا شاید دہلی واپس آرہے ہوں گے۔ کل ہی بات ہوئی تھی میری۔ شاگرد نے کہا ایک بار خیریت معلوم کر لیجیے۔ میں نے فوراً انھیں فون کیا، فون نہیں لگا تو پھر پروفیسر محمد علی جوہر صاحب کو فون ملایا اور انھوں نے فون اٹھایا۔ سلام کے بعد میں نے ابن کنول صاحب کی خیریت جاننی چاہی تو انھوں نے کہا: آپ سلطان صاحب سے بات کر لیجیے اور فون ان کے سپرد کر دیا۔ میرے دریافت کرنے پر رندھی ہوئی آواز میں انھوں نے جو کچھ کہا اس پر اول تو یقین ہی نہیں آیا

اور پھر جب وہ خود رونے لگے تو تھوڑی دیر کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میرے شاگرد نے مجھے سنبھالا اور پھر اس کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ؎ 'چراغوں میں روشنی نہ رہی'۔ اس کے بعد اگلے دن صبح تک میرے پاس فون کا سلسلہ جاری رہا اور کم وبیش تمام لوگ تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ کیا واقعی ابن کنول صاحب نہیں رہے اور میں مجبور و بے بس سب کو یہی جواب دیتا رہا کہ اب یقین کر لیجیے خدا کو شاید یہی منظور تھا کہ وہ وائیوا لینے کے بعد دو بجے دوپہر کو اپنے رشتہ دار کے گھر جائیں، نماز کے لیے وضو کریں اور ظہر کی نماز ادا کیے بغیر دہلی لوٹنے کے بجائے اپنے معبود حقیقی کے پاس چلے جائیں۔ اگلے روز 12 فروری 2023 کی صبح سویرے ہی میں اور احمد امتیاز صاحب اپنی اپنی کار میں جتنے ریسرچ اسکالرز کو لے جا سکتے تھے لے کر علی گڑھ پہنچے اور تقریباً گیارہ بجے دن انھیں ان کے معبود کے سپرد کر دیا گیا۔ ان کے جنازے میں جس قدر اساتذہ، عمائدین دہلی و علی گڑھ اور پورے ملک سے آئے ہوئے ان کے ریسرچ اسکالرز موجود تھے اس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گزشتہ تین مہینے میں، اپنی زندگی سے وابستہ میں نے تین اہم شخصیات کو کھویا ہے۔ یکم نومبر 2022 کو اپنے والد محترم محمد مطیع الرحمن کو، 16 جنوری 2023 کو والدہ محترمہ مستقیمہ خاتون کو اور 11 فروری 2023 کو اپنے سرپرست پروفیسر ناصر محمود کمال (پروفیسر ابن کنول) صاحب کو۔ اللہ ان سب کے درجات بلند کرے۔ اس موقع پر غالبؔ کے خط کا یہ جملہ مجھے شدت سے یاد آ رہا ہے: ''یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو، ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مرونگا تو میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون''۔

☆☆☆

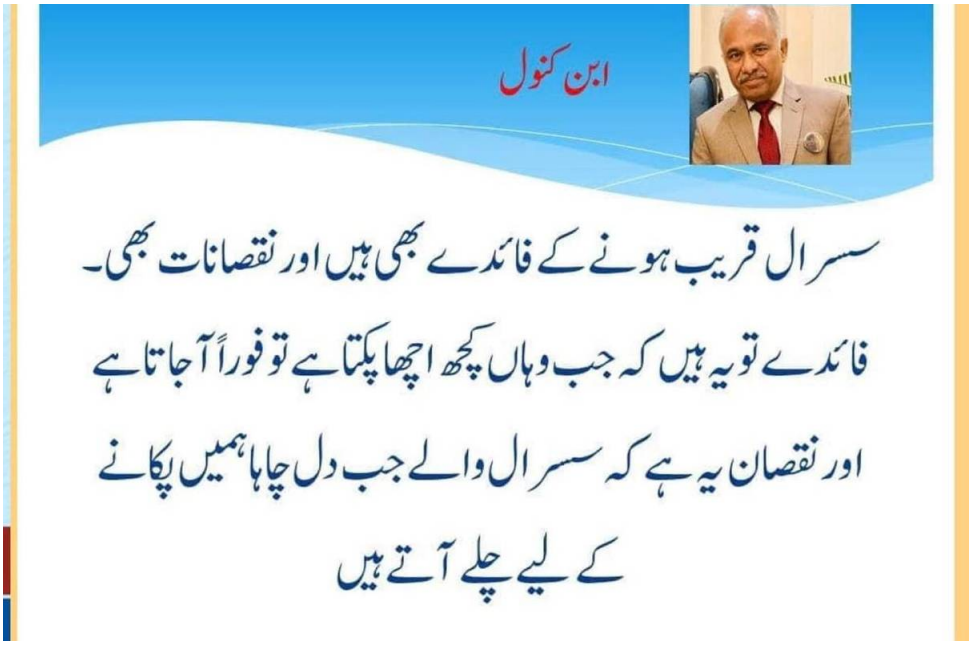

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ڈاکٹر محمد اکمل شاداب
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونی ورسٹی، لکھنؤ

کل من علیھا فان ہر وہ چیز جو دنیا میں پائی جاتی ہے اسے ایک نہ ایک دن فنا ہو جانا ہے۔ سوائے خدا کے کسی کو ثبات، بقا اور دوام نہیں۔ یہ دنیا اور اس دنیا میں موجود تمام اشیاء ایک دن نیست و نابود اور ختم ہو جائیں گی، ہر ذی روح عالم ارواح کی جانب کوچ کر جائے گی۔ آدم و حوا سے لے کر آج تک اس فانی دنیا میں اولاد آدم کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے اور تا قیامت یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔

مرزا شوق لکھنوی کے بقول

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے"

بات 11/فروری 2023 کی ہے۔ میں یونیورسٹی سے گھر نکلنے کی تیاری میں تھا کہ میرے ایک عزیز دوست اور شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاد ڈاکٹر مامون رشید کا۔ شام 4 بجکر 42 منٹ پر فون آتا ہے اور کانپتی ہوئی آواز میں ایک جان کاہ خبر سنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اکمل بھائی! ایک بہت بری خبر ہے، سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیسے کہوں؟ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب! اچھی خبریں سنایا کریں، پھر بھی بتائیں، کیا بات ہے؟ خیریت؟ جس پر ڈاکٹر مامون نے کہا آپ کے استاد ابن کنول صاحب اس دنیا میں نہیں رہے، آج علی گڑھ میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اتنا سنتے ہی میں نے ان کا فون کاٹ دیا اور چند لمحوں تک یہی سوچتا رہا کہ مامون نے مجھ سے ایسا مذاق کیوں کیا؟ پانچ منٹ بعد میں نے دوبارہ فون کر کے دریافت کیا، جواب وہی ملا کہ ابن کنول صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اچانک اس طرح کی خبر سن کر یقین نہیں ہو رہا تھا، بار بار دل میں یہی بات گردش کر رہی تھی کہ ڈاکٹر مامون کے ذریعہ دی گئی خبر جھوٹی ہو، صداقت پر مبنی نہ ہو اور یہ ہونی نہ ہوئی ہو مگر ہونی کو انہونی کون کر سکتا ہے۔ یہ خبر میرے لئے نا قابل یقین اور نا قابل برداشت تھی، مانو میرے اوپر پہاڑ ٹوٹ پڑا، یہ خبر سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں مبہوت اور جہاں کا تہاں جامد و ساکت کھڑا رہا، ہر طرف اندھیرا چھا گیا، ذہن ماؤف ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ خدا خیر کرے۔ چار و ناچار، کچھ دیر کے بعد گھر کا رخ کیا، تمام راستے یہی دعائیں کرتا رہا کہ یہ خبر جھوٹی ہو۔ بمشکل تمام گھر پہونچ کر اپنے کمرے میں دراز ہو گیا۔ ابا اور اہلیہ نسیمہ نے میری مبہوت شکل، پریشان حالی اور آنکھوں میں آنسو دیکھ کر یک زبان پوچھا کہ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ موبائل فون کی گھنٹیاں

مسلسل بجے جارہی ہیں،فون کیوں نہیں ریسیو کررہے ہیں؟ میں نے خود پر ناکام قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا سر کا انتقال ہوگیا ہے، میں یتیم ہوگیا،شفقت استادی سے محروم ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے سر کو اپنے پاس بلالیا ہے۔اتنا سنتے ہی گھر میں صف ماتم بچھ گئی، چہار سو سناٹا چھا گیا۔کسی بھی طرح یقین نہیں ہورہا تھا کہ سر نے دار فانی سے مقام جاودانی کا سفر قبل از وقت طے کرلیا ہے۔استاد محترم پروفیسر ابن کنول صاحب کے اچانک رحلت کی خبر پوری اردو دنیا میں بہت تیزی سے گردش کرنے لگی جو ہر کسی کے لئے ناقابل یقین تھی۔موبائل کی گھنٹیاں اب بھی لگاتار بج رہی تھیں۔ بیشتر اہل اردو جانتے ہیں کہ میں پروفیسر ابن کنول صاحب کا سب سے چہیتا،عزیز اور بے تکلف شاگرد تھا۔میرا اور سر کا رشتہ صرف استاد اور شاگرد ہی کا نہیں بلکہ باپ اور بیٹے جیسا تھا۔شاید اسی لئے ہر کوئی اس خبر کی صداقت اور تصدیق مجھ سے چاہتا تھا یا لوگ میرے لئے تعزیتی فون کررہے تھے۔نظام خداوندی کل نفس ذائقۃ الموت کے تحت ہر کسی کو موت کا مزہ چکھنا ہے، ناچاہتے ہوئے بھی یقین کرنا پڑا کہ ابن کنول صاحب ہندوستان کے بیشتر شہروں اور دیگر کئی ممالک کا سفر طے کرکے سفر آخرت کے لئے روانہ ہوگئے ہیں۔انسان جہان فانی میں آتا ہے اور ایک دن اسے الوداع کہہ کر مٹی میں مل جاتا ہے، باقی رہتی ہیں تو بس اس کی کچھ یادیں اور کچھ باتیں۔ پروفیسر ابن کنول ہمہ جہت اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، کئی خوبیوں سے مالا مال، ایک ہمدرد وغم گسار انسان، ادیب، شاعر، تخلیق کار، اداکار اور مثالی و بہترین استاد تھے۔استاد محترم نہ صرف مثالی استاد اور مثالی شخصیت کے مالک تھے بلکہ شخصیت ساز بھی تھے۔

پروفیسر ابن کنول نے اپنے شاگردوں کی اصلاح وتربیت بہت ہی مخلصانہ انداز میں کی ہے،انہوں نے اپنے کسی بھی شاگرد کا کبھی بھی استحصال نہیں کیا، اپنے ہر شاگرد کی مدد اور اصلاح بنا کسی مفاد کے کی ہے۔اس ضمن میں آپ اسم با مسمیٰ ناصر ہیں۔اردو دنیا اور بالخصوص یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو میں استحصال کرنے والے اساتذہ اور استحصال کا شکار ہونے والے ریسرچ اسکالرز کی بھرمار (ایک طویل فہرست) ہے۔ پروفیسر ابن کنول سدا بہار اور جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔آپ بہترین استاد کے ساتھ ساتھ بہترین مربی بھی تھے۔ ہمہ وقت فکر مند رہتے کہ جملہ طلبہ بالخصوص اپنے شاگردوں کو روزگار سے کیسے جوڑیں اور ان کی بہترین شخصیت سازی کیسے ہو؟ بہت سے ایسے شاگرد ہیں جو ابن کنول صاحب سے تعلیم وتربیت پاکر ہندو بیرون ہند کے مختلف مقامات پر آپ کے نقوش مرتسم کررہے ہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر فخر عالم کہتے ہیں

> ان کے طالب علموں کی ایک بڑی تعداد ہے جو دنیا بھر میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کی تربیت اس طرح ڈوب کر کی ہے کہ مرحوم کے بعض شاگردوں کو دیکھ کر خود مرحوم کی شخصیت کا گمان ہوتا ہے اور کبھی کبھی من تو شدم تو من شدی کا۔"

پروفیسر ابن کنول کے شاگرد ہونے کا شرف مجھے بھی حاصل رہا ہے۔ میں ابن کنول صاحب کے اولین شاگردوں میں سے ایک ہوں۔سر نے اپنے دیگر شاگردوں کی طرح میری بھی سرپرستی اور تربیت بہت ہی خلوص کے ساتھ کی ہے۔اگر یہ کہوں کہ سر سے استفادہ کرنے والے شاگردوں میں میں سرفہرست ہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ میں نے مرحوم کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا ہے،

مقالے کی اصلاح کے لئے یونیورسٹی سے زیادہ سر کے ودلت کدہ پر جانے کا اتفاق ہوا، میری تحریروں کو پڑھنے کے بعد بارہا حکم دیتے کہ انہیں پڑھ کر ایسے سناؤ جیسے کہ سمیناروں میں مقالے پیش کئے جاتے ہیں، کبھی کہتے کہ ایسے پڑھو جیسے کہ ریڈیو پر پڑھا جاتا ہے، مجھ سے پڑھوا کر سنتے اور خود بھی پڑھ کر سناتے، مقالہ خوانی نیز ریڈیو پر پیش کش کی باریکیاں بھی سمجھاتے، مجھے مقالہ نویسی اور مقالہ خوانی کے اصول وآداب سے واقفیت استاد محترم کے توسط سے ہوئی۔ جب کبھی آپ کے پاس کسی یونیورسٹی سے سوال نامے تیار کرنے کے لئے خطوط آتے تو اکثر مجھے طلب کرتے، سوالات تیار کرنے کا حکم دیتے اور خود بھی سوالات تیار کرتے، خود کے تیار کردہ سوالات متعلقہ یونیورسٹی کو بھیج دیتے اور میرے ذریعہ تیار کئے ہوئے سوالات کو غور سے پڑھتے، حسب ضرورت اصلاح کے ساتھ حوصلہ افزائی فرماتے۔ اس کے علاوہ آپ دیگر تعلیمی سرگرمیوں سے وابستہ رکھنے کے لئے اپنے دولت کدہ پر بلایا کرتے تھے، مجھے آج بھی یاد ہے کہ کسی غرض سے سر کے گھر گیا ہوا تھا کہ ظہر کی اذان ہوگئی، سر نے فرمایا کہ مسجد چلو، نماز پڑھنے کے بعد کام ہوگا کہ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ سر آپ پڑھ کر آئیں تب تک میں یہ کام نپٹاتا ہوں۔ میری اس حرکت پر سر نے ناراضگی کا اظہار کیا، سمجھایا اور ادائیگی صلوۃ کے لئے وصیت وتنبیہ کی۔ اس طرح کی تربیت والدین ہی کرتے ہیں یا وہ اساتذہ جو طلبہ کو اپنی اولاد سمجھتے ہیں۔ میں ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں جن کی اصلاح وتربیت صرف ایک طالب علم کی حیثیت سے نہیں بلکہ اولاد کی طرح کی گئی ہے، مجھے ابن کنول صاحب کے اہل خانہ میں جو اہمیت حاصل ہے، اس پر فخر ہے۔ سر کے لئے ان کے بڑے بیٹے اور بچوں کے لئے بڑے بھائی کی حیثیت رکھتا ہوں۔ شعبۂ اُردو خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ میں 20 / مارچ 2021 کو "مجاز لکھنوی" خطبات سیریز کے تحت "داستان کی جمالیات" پر پروفیسر ابن کنول صاحب کے توسیعی خطبہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس خطبے کے لئے لکھنؤ میں سر کی مع اہل وعیال آمد ایک دن قبل یعنی 19 / مارچ 2021 کو ہوئی۔ ابن کنول صاحب کے ٹھہرنے کا انتظام "ہوٹل رتن انٹرنیشنل، کلیان پور" میں کیا گیا تھا۔ 19 / مارچ کو میرے اور میری اہلیہ کے اصرار پر عشائیہ کے لئے میرے غریب خانے پر تشریف لائے، عشائیے کے بعد استراحت کے لئے "ہوٹل رتن انٹرنیشنل" تشریف لے گئے۔ اگلے روز یعنی 20 / مارچ کی صبح خیریت اور ناشتے کے سلسلے میں سر کو فون کیا، علیک سلیک کے بعد سر نے سب سے پہلے یہی کہا کہ اکمل! اگر تمہیں کوئی دقت نہ ہو تو ہم لوگ تمہارے گھر آجائیں، بچوں کو تمہارا گھر بہت پسند آیا، استاد محترم کی اس بے تکلفی سے مجھے بے حد خوشی ہوئی، میں نے فوراً عرض کیا کہ صدر شعبۂ اردو پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی صاحب نے مجھے اختیار دیتے ہوئے کہا تھا تمہارے استاد لکھنؤ آرہے ہیں، استاد اور شاگرد کا معاملہ ہے، تمہیں اختیار ہے، اپنے استاد کے قیام کا انتظام ہوٹل میں کرو یا اپنے گھر میں۔" میں نے آپ سے اپنے گھر میں قیام کے لئے درخواست صرف اس لئے نہیں کی کہ کہیں آپ کو یا آپ کے بچوں کو تکلف نہ ہو۔ جواب ملا اگر میں کسی شہر میں جاؤں اور میرا بیٹا وہاں رہتا ہو تو میں اپنے بیٹے کا گھر چھوڑ کر ہوٹل میں تھوڑی ٹھہروں گا، تم میرے لئے میرے بڑے بیٹے اور عائش جیسے ہو۔" سر کے اس مشفقانہ جملے کے سنتے ہی عرض گزار ہوا" یہ میری خوش بختی ہے کہ آپ میرے غریب خانہ کو عزت بخشیں، میں آپ کو لینے کے لئے آرہا ہوں۔" میرے گھر تشریف

آوری کے بعد سر اور بھابھی (استانی ماں) نے اپنے ساتھ جو تحفے تحائف لے کر آئے تھے، مجھے اور میرے بچوں کو پیش کیا، دو دن قیام رہا، اس دوران ایک سرپرست اور بڑے بزرگ کی طرح ہم سب کو اپنے پاس بلا کر بیٹھاتے، سب سے باتیں اور ہنسی مذاق کرتے، میری چھوٹی بیٹی عنب سے خود کو دادا کہلواتے اور اس سے دریافت کرتے کہ میں کون ہوں؟ عنب جب یہ کہتی کہ آپ پاپا کے سر ہیں تو استاد محترم فرماتے کہ نہیں، میں تمہارا دادا ہوں، مجھے دادا کہو۔"

سر کے دولت کدہ پر مع اہل وعیال بارہا جانے کا موقع نصیب ہوا، اسی طرح سر نے بھی دہلی میں اور لکھنؤ میں میرے غریب خانہ کو مع اہل وعیال بارہا عزت بخشی ہے۔ سر جب بھی لکھنؤ تشریف لاتے، میرے غریب خانے کو لازمی طور پر عزت بخشتے، ہمیشہ ایک سرپرست کی طرح پیش آتے۔ کاش پاک پروردگار ہمیں استاد محترم کی شفقت ومحبت اور عنایات سے مزید فیض یاب ہونے کے مواقع فراہم کرتا۔

سر کے ساتھ آپ کی اسکوٹر اور کار کی سواری تکونہ پارک جامعہ نگر سے دہلی یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی سے تکونہ پارک جامعہ نگر اور دہلی یونیورسٹی سے آل انڈیا ریڈیو کی انگنت بار نصیب ہوئی۔ آپ کو شعبۂ اردو میرٹھ یونیورسٹی میں ممتحن (واؤا لینے) کی حیثیت سے تشریف لے جانا تھا، مجھے بھی ساتھ چلنے کا حکم ہوا، حکم کی تعمیل ہوئی، سر کے ساتھ بذریعہ کار رخت سفر باندھا، راستے میں سر نے ایک تھیسس (پی ایچ ڈی کا مقالہ) میرے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے کہا کہ میرٹھ تقریری امتحان لینے کی غرض سے چل رہے ہیں، اس تھیسس کے حوالے سے کچھ سوالات قائم کر کے مجھے بتاؤ، میں نے چند سوالات استاد محترم کے حوالے کئے، سر نے میرے ذریعہ تیار کردہ سوالات پر غور کیا، کچھ سوالات کی خوب سراہنا کی اور حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔ صحیح معنوں میں پروفیسر ابن کنول استادیت کے مقام پر فائز تھے جو چلتے پھرتے اپنے طلبہ کی تربیت واصلاح اور رہنمائی کرتے رہتے تھے اور اپنے طلبہ کے لئے ہمیشہ فکرمند رہتے۔ پروفیسر ابن کنول کی طلبہ نوازی اور طلبہ کے تئیں فکرمندی کو پروفیسر ثوبان سعید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

> ہمیشہ طلبہ کی بہتری اور ذہن سازی کے لئے فکرمند رہتے تھے اور اس فکر کا اظہار ایسے شگفتہ انداز میں کرتے تھے جہاں ان کے خلوص کی گرمی محسوس کی جاسکتی تھی۔ ان کی تحریروں سے بھی یہی خلوص مترشح ہوتا ہے۔"

طلبہ نوازی، طلبہ کے لئے فکرمندی، طلبہ کی خیرخواہی، طلبہ کی بہتری اور ذہن سازی یہ وہ اوصاف کمال ہیں جن کی وجہ سے پروفیسر ابن کنول طلبہ کے مابین محمود ومقبول تھے۔ طلبہ میں ابن کنول صاحب کی مقبولیت شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ کو راس نہیں آئی، نہ تو ان کی حیات میں اور نہ ہی بعد الممات۔ جس کا بین ثبوت ملازمت سے سبکدوشی کے بعد طلبہ کے ذریعہ اہتمام کئے گئے الوداعی تقریب اور انتقال کے بعد شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے تعزیتی جلسے کے موقع پر دیا گیا۔

ابن کنول صاحب سے میری وابستگی 1998 سے 11/فروری 2023 تک رہی ہے۔ میں نے سر کے ساتھ بہت سا وقت گزارا ہے۔ اس دوران مجھے سر سے استفادے کا خوب موقع ملا اور سر نے بھی میری اصلاح وتربیت میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ابن

کنول صاحب قدم قدم پر اور چلتے پھرتے صرف میری ہی نہیں بلکہ اپنے ہر شاگرد کی اصلاح فرماتے رہے۔سینئرز کی عزت افزائی اور ان کے مقام و مرتبے اور اہمیت کا پاس ولحاظ کیسے رکھا جاتا ہے،سر کی ہدایت سے اس وقت اندازہ ہوا جب میں بزم ادب شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے ایک پروگرام کی نظامت کررہا تھا،اس پروگرام میں میرے دو سینئرز ڈاکٹر فیاض اور ڈاکٹر انعام الحق بھی موجود تھے (اس وقت فیاض بھائی اور انعام بھائی ریسرچ کررہے تھے) پروگرام کی صدارت ابن کنول صاحب فرما رہے تھے،سر نے ہدایت دی کہ تمہارے دو سینئر ساتھی پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں انہیں بلا کر آگے بیٹھاؤ۔ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمائیں، میں پی۔ایچ۔ڈی کررہی رہا تھا کہ اکتوبر 2005 میں میرا تقرر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کے عہدے پر ہوا،میرے کئی ساتھی اس وقت ریسرچ کررہے تھے۔اپنے چند دوستوں جاوید اقبال،فیصل ذکی،جنید،جلیس بھائی، عفیفہ،فریدہ اور ذکیہ وغیرہ کے ساتھ ایک عام طالب علم کی طرح کرسی پر پیر رکھ کر میز کے اوپر بیٹھا ہوا تھا،سر نے جب مجھے اس طرح دیکھا تو یہ کہتے ہوئے میرے پاس سے گزرے کہ اب تم صرف طالب علم نہیں بلکہ ایک استاد ہو گئے ہو۔

پروفیسر ابن کنول بخوبی جانتے تھے کہ ہر فرد کچھ نہ کچھ صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے، کچھ کی صلاحیتیں پوشیدہ بھی ہوتی ہیں جن کو نکھارنا اور ابھارنا والدین اور اساتذہ کی ذمہ داری ہوتی ہے، پروفیسر مرحوم یہ بھی جانتے تھے کہ حوصلہ افزائی سے بہتر کارکردگی کی امید کی جاسکتی ہے،طلبہ پر حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی کے دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں، ہمارے معاشرے میں عام طور پر ان طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جن کی تعلیمی کارکردگی بہتر ہوتی ہے، کمزور طلبہ کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ جب کہ پروفیسر ابن کنول اس سلسلے میں مختلف نظر آتے ہیں،آپ بلا امتیاز ہر طالب علم کی رہنمائی فرماتے ،طلبہ کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہتے تھے تا کہ طلبہ کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو سکے۔سر کے ساتھ بارہا آل انڈیا ریڈیو اور ایک بار جموں کشمیر پبلک سروس کمیشن جانے کا اتفاق ہوا، بیشتر مواقع پر استاد محترم میرے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور میرے حوصلوں کو تقویت بخشنے کے لئے یہ کہہ کر تعارف کرواتے کہ یہ ڈاکٹر محمد اکمل ہیں اور بروقت شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں میرے رفیق کار ہیں۔ جب کہ میں پہلے ایک شاگرد اس کے بعد ہی کچھ اور تھا۔

پروفیسر مرحوم بے ضرر اور دوسروں کو فائدہ رسانی کے لئے پیش پیش رہتے تھے،آپ سے فیض یاب ہونے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے،فیض یاب ہونے والوں سے آپ کبھی بدل کے طلب گار نہیں ہوئے۔کسی کی بدخواہی نہیں کی،شعوری طور پر کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔آپ"نیکی کر دریا میں ڈال" کے فارمولے عمل پیرا تھے، جب آپ پہلی دفعہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے عہدۂ صدارت پر فائز ہوئے تو ایسے لوگوں کو بھی درس و تدریس سے وابستہ کیا جو کافی سینئر تھے، ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ساتھ بے روزگاری کی زندگی گزار رہے تھے، یہ بات دیگر ہے کہ کچھ استفادہ کرنے والے مفاد پرستوں نے احسان فراموشی کا مظاہرہ کیا۔ فائدہ رسانی کی صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔

مجھ سے کافی سینئر اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ایک بے روزگار ڈاکٹر (پی ایچ ڈی) کا ایڈہاک تقرر دہلی یونیورسٹی

کے شعبۂ اردو میں پروفیسر ابن کنول کے توسط سے عمل میں آیا۔ ان کی تقرری کے بعد استاد محترم نے مجھ سے ذکر کیا میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنے والد کی کتاب پر تبصرہ کے لئے درخواست کی تھی، موصوف وہ کتاب لے گئے پھر کچھ دنوں کے بعد بغیر تبصرہ کئے یہ کہتے ہوئے واپس کر گئے کہ لوگ اپنا کام کروا لیتے ہیں، فائدہ نہیں پہنچاتے، میں مفت میں نہیں لکھوں گا۔" پھر بھی میں نے ان کی تقرری کی۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہے۔ انہوں نے اس کا ذکر مجھ سے کیا تھا۔ ابن کنول صاحب نے فرمایا: معلوم تھا تو مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ سوچ کر نہیں بتایا کہ کہیں اس وجہ سے ان کا نقصان نہ ہو جائے۔ سنہرے حرفوں میں لکھی جانے والی نصیحت آپ نے فرمائی" بہت اچھا کیا، آئندہ کبھی بھی کوئی بھی ایسا کام مت کرنا جس سے کسی کا نقصان ہو، اپنی ذات سے اگر کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے تو نقصان بھی مت پہنچانا۔" اس کے علاوہ بھی کئی لوگوں کو آپ کے قلم نے بے لوث فیض پہنچایا ہے۔ یہ تھے بے ضرر پروفیسر ابن کنول۔

اساتذہ کو مجازی باپ کہا گیا ہے، حقیقی باپ انسان کے جسمانی وجود کا سبب ہوتا ہے تو مجازی باپ یعنی استاد انسان کے روحانی وجود کو جلا بخشنے کی وجہ بنتا ہے۔ ایک کامیاب شاگرد کا تصور استاد کی شفقت، توجہ اور تربیت کے بغیر ناممکن ہے، پروفیسر ابن کنول ایک عظیم استاد ہیں جنہوں نے اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت ایک سرپرست اور باپ کی طرح کی ہے، اپنے کردار، اعمال، اخلاق اور طلبہ پر شفقت و محبت کی وجہ سے تکریم و تحسین اور تعظیم کے حق دار ہیں۔ پروفیسر ابن کنول کا ہر شاگرد اپنے محبوب و مقبول استاد کے لئے بے پناہ عقیدت و جذبات رکھتا ہے، یہی ان کے عظمت کی دلیل ہے۔

عہد حاضر میں اساتذہ کی کمی نہیں، کئی طرح کے اساتذہ پائے جاتے ہیں، کچھ صحیح معنوں میں استاد ہوتے ہیں، ایسے اساتذہ اپنے شاگردوں کے لئے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک بہترین استاد متاثر کن شخصیت کا مالک ہوتا ہے، اسے شریف، اخلاقیات، اعلیٰ ظرف، مزاج شناس، بے ضرر، دوسروں کے لئے فائدہ مند اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور اسے بخوبی انجام دینے والا ہونا چاہئے۔ ایک اچھے استاد کی تربیت طالب علم کی زندگی کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پروفیسر ابن کنول ان خوش نصیب اساتذہ میں سے ایک ہیں، جنہیں ان کے کئی شاگرد اپنا آئیڈیل تسلیم کرتے ہیں اور فخریہ اپنا نام ان سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ وقار، عزت اور مرتبہ آج کے کم ہی اساتذہ کو حاصل ہے۔ آج کے اس عہد میں ایسی شخصیتیں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ شاد عظیم آبادی کا یہ شعر پروفیسر ابن کنول پر صادق آتا ہے۔

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں ، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہل زمانہ قدر کرو، نایاب نہ ہوں، کم یاب ہیں ہم

مضمون کے آخر میں پروفیسر ابن کنول کے اوصاف حمیدہ، ان کی استادیت اور شفقت و محبت کو مدنظر رکھتے ہوئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ملاحظہ فرمائیں:

میں ہر نماز کے بعد اپنے استاد اور والد محترم کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں اور میں

نے کبھی بھی اپنے استاد محترم کے گھر کی طرف اپنے پاؤں دراز نہیں کئے، حالانکہ میرے گھر اور ان کے گھر کے درمیان سات گلیاں واقع ہیں اور میں ہر اس شخص کے لئے استغفار کرتا ہوں جس سے میں نے کچھ سیکھا ہے یا جس نے مجھے علم پڑھایا"

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

☆☆☆☆

آہ پروفیسر ابن کنول۔۔۔۔۔دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

شبنم شمشاد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
مانو، آرٹس اینڈ سائنس کالج فار وومن، سری نگر

ناصر محمود کمال بمعروف ابن کنول کا نام دبستان ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ شمس الحسن کنول ڈبائیوی کے بیٹے ابن کنول دنیائے شعر و ادب میں ایک ممتاز افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، انشائیہ نگار، خاکہ نگار، نامور محقق، نقاد، بلند پایہ ادیب، فنکار و مبصر کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ابن کنول نے 40 سے زائد کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی کیا ہے۔ ان کی یہ علمی و ادبی کاوشیں گوشۂ ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے، اس کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ لیکن جس چیز نے انہیں شہرت دوام عطا کیا وہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔ ابن کنول گونا گوں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک اچھے ادیب، افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک مشفق استاد بھی تھے۔ ان کے افسانوی مجموعہ ''تیسری دنیا کے لوگ، 1984'' اور ''بند راستے، 2000'' اور ''پچاس افسانے، 2014'' منظر عام پر آ کر اپنی مقبولیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔

پروفیسر ابن کنول سے میری پہلی ملاقات شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ایک خصوصی لکچر میں ہوئی تھی۔ جس میں انہوں نے اپنا افسانہ ''ہمارا تمہارا خدا بادشاہ'' سنایا تھا۔ ان کے افسانہ خوانی کا انداز غضب کا تھا، ہم جمیع طلبا و طالبات اس افسانہ سے بہت لطف اندوز ہوئے تھے۔ لیکن اس وقت میں چوں کہ ایم۔فل کی ایک ادنیٰ سی طالب علم تھی۔ افسانے کی گہرائی و گیرائی کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ لیکن آج جب ان کے اسی افسانہ کا دیدہ ریزی و عرق ریزی سے مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ابن کنول نے اس افسانے میں ہمارے سماج میں ہو رہے حکمرانوں کے جابرانہ روش پر ضرب کاری لگایا ہے۔ انہوں نے اس افسانہ میں حکمرانوں کے مصلحت آمیز کرداروں کی عکاسی بہت عمدہ انداز میں کی ہے جسے ان کے افسانہ ''ہمارا تمہارا خدا بادشاہ'' کے اس اقتباس میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ رقم طراز ہیں:

> ''ہم جانتے ہیں کہ ہماری رعایا ایک عذاب آسمانی میں گرفتار ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے اور ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ تم سب ہماری اولاد کی طرح ہو۔ ہم تمہارے لیے فکرمند ہیں اور کوشش کریں گے کہ تم لوگوں کو جلد اس مصیبت سے نجات ملے۔ ہم نے اپنے وزیروں کی ایک جماعت کو اس کی تحقیقات کے لیے متعین کیا ہے۔۔۔۔ابھی چند ہی قدم آگے

بڑھے تھے کہ جہاں پناہ کے عالی شان محل کے چاروں دروازوں سے چار بلند
پرواز عقاب اپنے پنجوں میں سیاہ سانپوں کو دبائے ہوئے نکلے اور مجمع کے اوپر
چھا گئے۔۔۔۔رعایا نے عالم غیض وغضب میں جہاں پناہ کی طرف دیکھا وہ
اب بھی کہہ رہا تھا تم سب ہماری اولاد کی طرح ہو۔ہم تمہارے فکر مند ہیں۔''

(ابن کنول: بندر راستے، ہم قلم پبلی کیشنز، دہلی، 2000، صفحہ:14)

راحت اندوری نے شاید اسی ضمن میں یہ بات کہا تھا کہ ؎

جب جی چاہے موت بچھا دو بستی میں
لیکن باتیں پیاری پیاری کیا کرو

''ہمارا تمہارا خدا بادشاہ'' یہ ایک تمثیلی افسانہ ہے۔اس افسانے کا خاصہ سیاسی، سماجی، تہذیبی ونفسیاتی کشمکش کی عکاسی ہے ۔یہ افسانہ جو کہ داستانوی رنگ وآہنگ لیے ہوئے ہے۔اس کی فضا مافوق الفطرت عناصر سے تیار ہوا ہے۔اس افسانے کی ابتدا ڈرامائی انداز میں ہوئی ہے۔جس میں ایک عقاب اپنے پنجوں میں سانپ کو لے کر شہر کے لوگوں کے گردنوں میں چھوڑ دیتا ہے۔ سانپ جب انسانوں کو ڈس لیتا ہے تو پھر وہی عقاب اس سانپ کو اپنے پنجوں میں لے کر روپوش ہو جاتا ہے۔اس افسانے کے ذریعہ ابن کنول دور حاضر میں ہندوستان کی سیاست اور سیاست دانوں کی فکر کو عیاں کیا ہے کہ کس طرح ہمارے ملک کے حکمران ضرورت پڑنے پر مفلوک الحال، معصوم لوگوں کو اپنے کام کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اپنا کام نکل جانے پر انہیں موت کی ابدی نیند سولا دیتے ہیں۔اس افسانے کا مرکزی کردار عقاب اور سانپ ہیں جو کہ شروع سے آخر تک نظر آتے ہیں۔اس افسانے میں کہیں کہیں کہانی پن ختم ہو جاتا ہے اور حکایت کا احساس ہونے لگتا ہے۔مکالمہ نگاری اس افسانے میں نہیں کے برابر ہے اور منظر نگاری کے اعتبار سے یہ ایک عمدہ افسانہ ہے۔القصہ مختصر یہ کہ یہ افسانہ ملک کی سیاست پر مبنی ہے۔جس میں لیڈروں کی گرم جوش تقریروں کو زہریلے سانپ کے وش سے تعبیر کیا گیا ہے اور لیڈروں کی چال بازیوں کو عقاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ''بندر راستے'' کے دوسرے افسانوں میں ''وارث''، ''صرف ایک شب کا فاصلہ''، ''پہلا آدمی'' وغیرہ سیاسی، سماجی وتاریخی نوعیت کے افسانے ہیں۔افسانہ ''پہلا آدمی'' میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ کس طرح سے جابر ومفاد پرست حکمران اپنی طاقت ومنصب کا غلط استعمال کر کے بے بس عوام کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ابن کنول مجاہد معاشرہ تھے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں موجودہ دور کے مسائل، زندگی کی پیچیدگیوں، محرومیوں، جبر وتشدد، عدم تحفظ کا احساس، حکمرانوں کے بہروپ، زندگی کی خواہشات کے حصول غرض زندگی کے ہر پہلو پر بے باکانہ قلم اٹھایا ہے۔ابن کنول کی ادبی جہت کے سلسلے میں پروفیسر وہاب اشرفی کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''ابن کنول اشتراکی ذہن رکھتے ہیں، ترقی پسندی کل بھی ان کی جولان گاہ تھی اور آج بھی ہے۔ شعر ہو یا افسانہ یا مضمون ان کی تحریروں میں عالمی صورت واقعہ کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ وہ مقامی مسائل اور احوال کو بھی وسیع تناظر میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ استحصال کے طور اور انداز کی انہیں خبر ہے ۔۔۔۔اس امر سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ معاملات کو وسیع تناظر میں دیکھنا پسند کرتے ہیں''۔

(وہاب اشرفی: تاریخ ادب اردو (جلد سوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007، صفحہ:1373)

ابن کنول کا تعلق اردو افسانہ نگاروں کی اس صف سے ہے جنہوں نے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اپنی شناخت قائم کی۔ ان کے معاصر افسانہ نگاروں میں سید محمد اشرف، صغیر افراہیم، طارق چھتاری، غضنفر، پیغام آفاقی، سلام بن رزاق، عبدالصمد اور حسین الحق کا نام سرفہرست ہے۔ ان افسانہ نگاروں میں جو بات قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان کے افسانے جدید افسانوں کی طرح فیشن پرستانہ نہیں ہیں اور نہ ہی یہ ترقی پسند ادیبوں کی مانند نظریاتی دباؤں کا شکار ہیں اور نہ ہی انہوں نے کلاسیکی افسانے کی شعریات وقدیم افسانے کی روایات سے انحراف کیا ہے۔ بلکہ ''نئے اقدار میں ماضی کو بھی ڈھالا جائے'' کا عزم مصمم لیے ہوئے تھے۔ ابن کنول اور ان کے معاصرین نے بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں سیاسی، سماجی، تاریخی، ثقافتی، معاشی، اخلاقی و مذہبی ہر چند صورت حال کے دو پہلو مرکزی وضمنی کو گرفت میں لے کر حقیقت پسندانہ انداز میں غیر جانب داری سے اپنے افسانے میں برتا ہے نیز برق انتشار تبدیلیاں پیدا کی ہیں اور تضاد لفظ ومعانی میں کھونے کے بجائے حکایت غم ہستی میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ اثر انصاری کا یہ شعر میں ابن کنول اور ان کے معاصرین کی نذر کرتی ہوں ؎

قلم کارو ، ادب کے جاں نثارو!
تم اپنے وقت کے ہشیار لوگو!
تمہارے فکر کی گہرائیوں سے
کسے ہے جرأت انکار لوگو!

ابن کنول نے اپنے افسانہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' میں 1947ء کے حالات وواقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اس افسانے کا پس منظر 1947ء کے بعد یعنی تقسیم ہند کے نتیجے میں درپیش فسادات اور قوم ومذہب کے نام نہاد پر ہونے والا ظلم وتشدد ہے اور قتل وخوں ریزی کی وہ داستان عبرت ہے جس میں لاکھوں لوگوں کو زندہ نذر آتش کر دیا گیا تھا، بستیوں کو اجاڑ دیا گیا، ماں باپ کی نظروں کے سامنے ان کی اولاد کو قتل کر دیا گیا، جوان بیٹیوں کی عصمت کو تار تار کر دیا گیا، ہر چہار سو حیوانیت کا بول بالا تھا، جس کو دیکھ کر انسانیت بھی کراہ اٹھی۔ فلک نے آنسو بہائے، زمیں سہم گئی، روح کانپ اٹھی۔ شاید اسی منظر کو دیکھتے ہوئے ترقی پسند

شاعر ساحرلدھیانوی نے کہا تھا کہ ؎

طرب زاروں پہ کیا بیتی ،صنم خانوں پہ کیا گزری
دل زندہ! ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری
زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

اسی خونی روداد کو ابن کنول کے افسانہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' کے اس اقتباس میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں:

''میں دیکھ رہا ہوں، میرا گھر جل چکا ہے۔اس کی راکھ سے اب بھی دھواں اٹھ رہا ہے۔میرا باپ، میری ماں اور میری بیوی کے جسم آگ کے شعلوں کی نذر ہو چکے ہیں۔میرے بچوں کے جسم خون سے لتھڑے ہوئے ہیں''۔

(ابن کنول: بند راستے، ہم قلم پبلی کیشنز، دہلی، 2000، صفحہ:47-48)

اسی کیفیت کو ساحرلدھیانوی نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

اس شام مجھے معلوم ہوا ،جب باپ کی کھیتی چھن جائے
ممتا کے سنہرے خوابوں کی انمول نشانی بکتی ہے
اس شام مجھے معلوم ہوا ،جب بھائی جنگ میں کام آئیں
سرمائے کے قحبہ خانوں میں بہنوں کی جوانی بکتی ہے
سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

اسی افسانے کا دوسرا اقتباس ملاحظہ کریں:

''خدا کی یہ زمین ہم پر تنگ ہو چکی ہے اور آسمان سے ہمارا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ہم اپنے معصوم بچوں کو ذبح ہوتے ہوئے اور عزیزوں کے جسموں کو آگ میں جلتے ہوئے نہ دیکھ سکے اور خدا دیکھتا رہا۔ہم نے آسمان سے رحم کی بھیک مانگی،لیکن ہمارے دامن میں دہکتے ہوئے انگارے آئے ۔۔۔۔۔اب سوائے اس سمندر کے ہمارے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں۔''

(ابن کنول: بند راستے، ہم قلم پبلی کیشنز، دہلی، 2000، صفحہ:51)

اس افسانہ میں ابن کنول کے مارکسی نظریہ کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔اثر انصاری نے شاید برسوں پہلے ان کے اسی

افسانے سے متعلق کہہ دیا تھا کہ:

آدمی کہاں جائے چھوڑ کر مکاں اپنا
آتشیں بموں کی جب ہر طرف دھمک بھی ہے

دوسری مرتبہ ابن کنول سے ہماری ملاقات شعبۂ اردو، مانو کے ''داغ دہلوی: فکر وفن'' سمینار میں ہوئی۔ جس میں انہوں نے داغ دہلوی کے حوالہ سے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا تھا۔ اور اپنے ڈراما ''بزم داغ'' کے حوالے سے بھی بہت سی باتیں کی تھیں۔ سمینار کے اختتام پر ایک دن سیر حیدرآباد کے لیے متعین تھا۔ اس دن صبح سے شام تک ابن کنول سر کی شخصیت کو دیکھنے، سمجھنے اور پڑھنے کا موقع ملا۔ ہم سب نے چار مینار میں بیچ بازار چائے بھی نوش کی اور پھر مکہ مسجد کے اندر گئے۔ سر نے مجھے بلا کر نام دریافت کرتے ہوئے پوچھا کہ کس موضوع پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ میں نے بتایا کہ فضا ابن فیضی کے مجموعہ کلام ''سبزۂ معنی بیگانہ کا تنقیدی تجزیہ'' میرا موضوع ہے۔ سر بہت خوش ہوئے اور مجھے بہت سے مشورے بھی دیئے۔ پھر سر نے کہا کہ تم بالکل میری بڑی بیٹی اریبہ جیسی لگتی ہو۔ وہ بھی تمہاری طرح پرداہ کرتی ہے۔ اگر تمہیں ریسرچ کے کام میں کبھی کوئی مشکل درپیش آئے تو بلا جھجھک مجھ سے رابطہ کر سکتی ہو۔ سر کے اخلاق عظیم یہ تھے۔ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد متعدد مرتبہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سمینار اور وائیوا میں اکثر آپ تشریف لاتے۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے اور سننے کا موقع ملتا۔ ان کے انداز گفتار میں مزاح کا پہلو پنہاں ہوتا تھا۔ ہر کسی سے خوش خلق اور ملنساری سے ملتے۔ درمیان گفتگو آپ بات ہی بات میں طنزیہ جملے کہہ جاتے جو کہ مزاح کے کاٹ سے لبریز ہوتا تھا۔ ان کی تحریر ''کچھ شگفتگی کچھ شائستگی'' جو کہ انشائیہ اور خاکوں پر مشتمل ان کی شخصیت کی مکمل عکاسی ہے۔

11 رفروی 2023ء کا دن کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ صبح ہی میں علی گڑھ پہونچی تھی۔ ہمارے شعبہ میں ایک ساتھی کا وائیوا تھا۔ ابن کنول سر ہی اکسپرٹ تھے۔ وائیوا ختم ہونے کے بعد تمام اساتذۂ شعبہ جات ان کو کار تک رخصت کرنے کے لیے آئے۔ آپ بہت خوش تھے۔ علی گڑھ سے ان کو حد درجہ انسیت تھی۔ کسے پتا تھا کہ اب سے چند لمحے بعد یہ ہمارے درمیان سے رخصت ہو کر ابدی نیند سو جائیں گے۔ ''دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں''۔ شام 03:30pm جب میں نے فون دیکھا تو سرخیوں میں ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر دل کو یقین نہیں آیا۔ اگلی صبح ان کے بھائی کے گھر گئی۔ وہاں ان کی لاش دیکھ کر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ سر اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ''جانے والے کبھی نہیں آتے''۔۔۔۔ زندگی پر کس کا بس چلا ہے۔۔۔ ''نہ بس میں زندگی اس کے، نہ قابو موت پر اس کا''۔ کیوں کہ ''یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے'' اس نشاط زندگی کی بشاط حقیقت موت ہے۔۔۔۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ''زندگی موت تیری منزل ہے''۔ اس لیے کہ سکون دے نہ سکیں راحتیں زمانے کی۔ کیوں کہ ''ہر ایک سانس پر پہرا ہے بے یقینی کا''۔۔۔۔۔ زندگی اپنے آخری سہارے کی متلاشی ہوتی ہے۔۔۔۔ اور ''زندگی ڈھونڈ ہی لیتی ہے سہارا آخر''۔۔۔ نیز ہمیشہ کے لیے شمع حیات گل کر دیتی ہے۔۔۔۔۔ کیوں کہ زندگی ہر

لمحہ موت کے سانچے میں پلا کرتی ہے۔جگر مرادآبادی نے سچ کہا تھا کہ ؎

زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ
موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں

راحت اندوری نے کچھ یوں کہا تھا کہ:

موت لمحے کی صدا ،زندگی عمروں کی پکار
میں یہی سوچ کے زندہ ہوں کہ مر جانا ہے

مختصر یہ کہ ابن کنول کا سانحۂ ارتحال دبستان ادب کے ایک باب کا خاتمہ ہے۔ جسے اردو دنیا کبھی پورا نہیں کر سکتی۔ میں ندا فاضلی کی یہ نظم ان کی نذر کرتی ہوں کہ ؎

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا
تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سوکھا ہوا پتہ ہوا سے ہل کے ٹوٹا تھا
میں جو بھی دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
وہ وہی ہے
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا

☆☆☆☆☆

Mob : 9682574644 Add : Miss SHABNAM SHAMSHAD
C/O : AZHAR HUSAIN KHAN
Flat No: 4, Type-5 Staff Quarter,MANUU
Gachibowli Hyderabad Telanagana -500032

آتی رہے گی یاد ہمارے قابل ستائش استاد محترم ابن کنول

محمد جنید شکروی
نائب پرنسپل آر بی جالان انٹر کالج دربھنگہ
موبائل:9709364084
E-mail: mdjunaid1960@gmail.com

ادب اور ادب نگار تمام تہذیبی معاشرتی عوامل، سماجی وسیاسی چڑھاؤ اتار اور قوموں کی بلندی وپستی کا آئینہ دار ہوتا ہے مگر اس کی بھرپور عکاسی غیر ارادی طور پر ہوتی ہے جس کے طرز اظہار کے لئے روح بے چین ہوتی اور زندگی حرکات وسکنات میں مبتلا رہتی ہے۔

سالِ نو کی آمد تہنیتی سوغات مگر دکھی دل کے ساتھ بھی کہ سال نو کے شروع ہی عشرے میں ہمیں سمندر نما گہرے زخم دے گیا ایک تاریخ کی صبح معزز وممتاز ادیب، افسانہ نگار، خاکہ نگار شاعر، بالخصوص فکشن نگار اور استاد الاساتذہ پروفیسر ابن کنول اسم گرامی (ناصر محمود کمال صاحب) کا اچانک دہلی اور علی گڑھ شاہراہ کے درمیان اس جہاں فانی سے کوچ کر جانا یقیناً اردو دنیا کے لئے ناقابل برداشت حادثہ ہے خدائے پاک مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ہم جیسے سوگوار طالب العلم کے لئے نعم البدل سے نوازے آمین ثم آمین۔ موصوف اردو فکشن نگاری کی تاریخ کے خود زندہ وتابندہ ناموں میں سے ایک ایسا چمکتا ہوا نام ہے جن کی روشنی سے چمک ودمک گہری نگاہ نقد ونظر کو خیرہ کر رہی ہے۔ ایسے بے مثل استاد کو ہم صرف عقیدت کے پھول کے ایک لفظ سے خراج تحسین پیش خدمت کر کے حق گوئی ادا نہیں کر سکتے جس استاد محترم میں والدین جیسی اعلیٰ شفقت ومحبت ورفتگی ہو اسے جملوں کے حصار میں قید کرنا بھی کسی حال میں ممکن نہیں سب سے زیادہ تکلیف دہ صورت حال اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ صحیح بات کہنے والے درست ادب لکھنے والے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں، ایک عظیم ادب نگار میں وہ کون کون سی خوبیاں اور ترسیل علم ہونی چاہئے وہ سب کے سب اسباب موصوف میں یکجا تھی۔

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ 1985ء میں شعبہ اردو دہلی یونیورسیٹی میں استاد محترم لکچرر کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اسی سال داخلہ خاکسار کا ایم اے درجہ اول میں ہوا، اس طرح شاگردی کا شرف مجھے اول سال ہی میں نصیب ہو گیا تا حال یعنی ملک الموت کے آنے تک خط وٹیلی فون سے رابطہ کا سلسلہ قائم تھا۔

دو ترقی یافتہ مرکزی یونیورسیٹی کے ماہر فن کار 15 اکتوبر 1957ء کو بیجوئی ضلع مراد آباد کے ایک زمیندار گھر میں آنکھیں کھولیں، اپنے گاؤں کے اردو اسکول سے تعلیم حاصل کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کے زیر سایہ منٹو سرکل اسکول میں داخلہ دلوایا کیا کہ آ کے چل کر ڈاکٹر کی سند حاصل کرے مگر قدرت کو ادب نگا بنانا تھا اور وہاں سے علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کے شعبہ

اردو سے وابستہ ہوئے یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ انہوں نے ابتدا سے ایم، اے تک زیر تعلیم رہے اس وقت جناب خورشید الاسلام، خلیل الرحمن، آل احمد سرور، قاضی عبدالستار شہر یا جیسے لائق وفائق اور نامور پروفیسران کے زیر سایہ تعلیم اور ادبی نکتہ تربیت کو نکھار ہوئی وہاں سے شعبہ اردو دہلی یونیورسیٹی پی، ایچ، ڈی، وایم فل کے واسطے 1978ء میں قدم رنجہ ہوئے اور جناب تنویر احمد علوی کی محبت میں مکمل کی، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی خواجہ احمد فاروقی، قمر رئیس، شارب ردولوی گوپی چند نارنگ کلیات یافتہ شاعر مغیث الدین فریدی یوسف حسین خاں پروفیسران جیسے قابل محلقین، ناقدین، تحقیق کار سے دامن علم ورحمت کو بھری جو اس وقت شعبہ اردو دہلی سے وابستہ شخصیات تھیں، موت نے بھی ثابت کیا کہ وہ دونوں یونیورسیٹی سے بے پناہ محبت اور ماہر فنکار تھے وہ اپنی طالب العلمی درسگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی میں پی ایچ ڈی کا وایئوا (زبانی امتحان) لینے کے لئے گئے ہوئے تھے امتحان سے فارغ ہوکر واپسی دہلی کے لئے چلے درمیانی راستہ میں ان کی روح قفس عصری سے پرواز ہوگئی دوسرے دن علی گڑھ کے قبرستان میں پیوند خاک ہوئے استاد محترم ادبی فضا اور زمیندارانہ تہذیب وتمدن میں پرورش پائی ان کا بچپن شاعروں اور ادیبوں کی صحبت وجھرمٹ میں گزرا ان کے والد قومی شاعر قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی ایک کامیاب استاد شاعر تھے ان کے والد محترم کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا لاتعداد کو انہوں نے ڈاکٹر بنایا بچپن سے شاعروں کی محفل نصیب اور کہانیاں لکھنے پڑھنے کا اعلی ذوق وشوق تھا اسی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے لکھنے پڑھنے کو اوڑھنا، بچھونا بنایا ہر گوشہ فکشن اور اصناف سخن کے علاوہ تحقیقی وتنقیدی میدان عمل میں تسلسل وتواتر کے ساتھ قدم رنجہ رہ کر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

یہ الگ گفتگو ہے کہ دونوں مرکزی ادارہ کبھی شعروادب کا دبستاں ہوا کرتا تھا اب وہ رونق اور علم وادب کی گہریت کہاں اردو تہذیب ومعاشرت اور ثقافتی کا شہر خاموش دیگر نظام تعلیمی درس وتدریس تہس نہس سیاسی اقدام کے ساتھ نظر آتا ہے مگر یہ بھی حقیقت تلخ ہے کہ اردو کا جھنڈا اور معیارے تعلیم بھی یہیں کے اساتذہ کرام اور شاگردان اٹھائے ہوئے ہیں۔ دہلی جیسے مصروف شہر میں رہتے ہوئے تگ ودو اور درس وتدریسی مسائل کے تمام مشکل مراحل طے کرتے ہوئے پیچیدہ سے پیچیدہ کام والجھنوں کو نہایت نیک نیتی اور استقامت کے ساتھ انجام دیا دہلی شعبہ اردو کو ایک ایسا محنتی اور فکروفن اور اعلیٰ نظریہ رکھنے والا استاد وقلم کار ملا جو نہ صرف مذہبی رموز کے ہر گوشہ سے واقف تھا بلکہ ہندوستان قعر روح معتبر اور مستند استاد کی شکل ولیاقت زندہ وجاویداں تھا اور رہے گا وہ جدید فنکارانہ اقدام کے ساتھ ساتھ فکشن کی جمالیات بالخصوص داستان اور افسانہ کی پیچیدگی یا شفافیت کو گہرائی قعر دریا نما افکار سے سمجھا اور اس کے مطابق حکمت عملی اپنا کر پوری زندگی نوک قلم سے سنوارنے میں اذہان کھپا دیا اور اپنے افکار وخیالات کی ترسیل کے لئے ہمہ وقت عمل پیرا رہے۔

موصوف کبھی کسی شاگرد کو بے روزگار کی فوج میں نہیں بھرتی کیا بلکہ علم اور صلاحیت کی روشنی سے لبریز کر کے قلم کا نایاب سپاہی کے صف اول کی جگہ میں محفوظ کرا وسط درجہ کا کم سے کم قلم کار، مصنف اور لکچرار کے مطابق ڈھال کر چمکتا ہوا آفتاب ومہتاب بنا دیتے کیونکہ اردو زبان وادب سے انکا تعلق پیشہ ورانہ نہیں بلکہ قلبی لگاؤ ہے وہ زبان وادب سے محبت کرتے اردو کی بقا کے لئے سرگرم زندگی رہے انہوں نے اپنے مضامین میں ہر انسان کی نفع اور نقصان کے مدنظر گفتگو کی، کبھی ذاتی مفاد پرستی کو انسانی

اقدار پر حاوی نظر آنے نہیں دیا اپنی کتابوں میں چراغ سے چراغ جلانے کا کام نہیں کیا ان حقائق، درد، اور ظلماتی نظریات کو یکجا کرنے کی سعی کی ہے جواب تک پہلے منظر عام پر نہیں آ سکے تھے، جب بھی ان کا کلام قارئین مطالعہ کرتا تب معیاری اور فکر سے عاری ہوتا اس لئے ان کو عوام پسند فکشن نگاری میں شمار کیا جاتا ہے لکھاوت ان کی دل سے پڑھی اور قبول کی جاتی ہے کیونکہ وہ ہر نقطہ جو عدل و انصاف و کمزور انسانیت کے برعکس مخالف سمت میں نظر آتی بے باک انداز میں بیان کر دینا اپنا فرض عین تصور کرتے ہیں۔

گذشتہ کئی صدیوں میں جن افسانہ نگاروں کا اسم گرامی فکشن کی دنیا میں چمکتا ستارہ کے مانند اور عزت وعظمت سے پڑھا جاتا ہے ان میں استاد محترم کا نام بھی قابل احترام سے لیا جاتا، سماجی مسائل پر ان کی گہری نظر اور پکڑ تیز تھی جس کا اظہار فکر ان کی کہانیوں میں مبتلا رہتی ہے۔

شہری اور دیہاتی زندگی اور روزمرہ کے مسائل کا ہمیشہ ہمیش اظہار خیال ان کی کہانیوں میں برملا تواتر کے ساتھ اجاگر ہوتا، خاموشی کے ساتھ ادبی کاموں میں مشغول رہنا انکا شوق عظیم اور طبع آزمائی کا ہنر گہرا تھا، معاصر اردو فکشن کی توانائی آواز جن کی گونج سماج ومعاشرے کے ناگوار اور پریشان وپیچیدہ مسائل کو ہر گوشہ تک پہونچایا، خاموش مزاجی اور شرافت ان کی شخصیت کا خاصہ ہے اپنی باتوں کو مسکراتے ہوئے نرمی، آہنگی کے ساتھ پیش کرتے دوران گفتگو بحث وتکرار اور درجات درس وتدریس میں گردن کو جھٹکا دیکر الفاظ نکالتے جس سے اندازہ مہک ہوتا کہ غور وخوض اور ناپا تلہ ہوکر ترتیب اور میزان رکھتے ان کے نزدیک علم وعروض اور اردو کی ترسیل وتبلیغ اور درس تدریس ہی زندگی کا واحد مقصد رہا وہ نہ کسی سازش کا شکار ہوکر ملوث رہے اور نہ کسی گروپ میں شرکت یا تعصّبانہ اقدام اٹھایا اس لئے کامیاب روشن نما چراغ اندھیرے ہی میں روشنی پھیلائی اور گمنامی کی لو خاموشی سے جلاتے رہے صبح سے شب تک اسی شغل میں مصروف رہ کر طمانیت محسوس کرتے آج تعلیم مقصد تجارت میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا ایسے میں تنخواہ کے علاوہ کوئی معاوضہ ومعاش کا طلب گار نہیں بنے بلکہ کمزور اور ضرورت مند طالب علموں کی خاموش مدد اپنے ذرائع سے کردی، انتہا یہ بھی ہے کہ مظلوم، دردمند کچلے ہوئے نادان کو اپنے فکشن میں بہت زور شور سے قلم کی آزادی کے لئے قلم کاری کی بہت تیز جدوجہد کی آج کی معاشرہ کے لئے ان کا دلی پیغام علم بہت اہم اور ہماری زندگی میں ایسے شمع محفل کی ابھی ضرورت تھی مگر حق تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا انہوں نے فکشن کے میدان عمل میں بڑی جانفشانی اور عرق ریزی کے اصول تنقید وتحقیق کے معیار کو بلندی پر اپنی کاوشوں کو پیش کر کے اردو زبان وادب میں معتبر اور مستند مضمون نگاری کی بہترین مثال قائم کی وہ زندگی اور ضمیر کے احکام کے مطابق ہی قلم بند کیا اور ثابت کر دیا کہ دل کش ودرست وآئینہ دار ادب کو مضامین کی شکل میں قلم بند کر یہ بھی ثابت کر دیا کہ پتلی برف سیل پر چلنے جیسا ہے اور قاری کا ذہن اپنی جانب راغب کرنے میں کامیابی حاصل کی زبان پر پوری قدرت رکھتے اسلوب میں ندرت اور اظہار وخیال میں برجستگی وپختگی پر قادر ہیں اپنی زندگی کا ہر اقدام درس وتدریس کے علاوہ اردو ادب کی آبیاری میں مصروف رکھا ان کے یہاں فصاحت وبلاغت، سادگی اور سنجیدگی کا اظہار ان کی تحریر میں عمدہ ہے ان کا دائرہ قلم بندی وسیع وعریض ہے اس لئے ان کی فنکاری میں تجربات وفکر وفن میں وسعت اور خلوص وعقیدت کی تجلی رنگ کا

اظہار قابل قبول ہیں۔

موصوف کبھی اور کسی بھی موضوع پر کسی شاگرد اہل شعبہ حتی کہ ملازمین یونیورسیٹی یا سکی اہل ادارہ سے بھی برہمی یا ناراضگی اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی بات شفقت اور معصومیت سے سنا کر مخالفین کو راضی عمل کر لیا یہ ہی لازمی عنصر ہے کہ کسی سے تعلقات کشیدگی اختیار نہیں کی اور سبھوں سے اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، خوش گوار تعلقات برقرار ہی نہیں اثر ورسوخ نہایت ملائم عمل پیرا ہو کر قائم رکھا اس طرح ملنساری میں کسی کو مشکوک وشبہات کا شکار نہیں ہونے دیا ہر تعلیمی محفل میں موصوف قابل مقبول، احترام اور محبوب رہے ہیں ان کی اردو دوستی اور اردو پروری اپنی جگہ مکمل قائم ودائم ہیں کامیاب شخصیت اپنے شاگردوں اور نئی نسل ادب کے لئے مسلسل کوشاں اور جہد آزماتے رہتے تعلیمی سیرابی اور ان کی سرفرازی استاد محترم صاحب کا مقصد حیات بن چکا اور ایسی جنونی وابستگی کی لاتعداد مثالیں ہیں وہ شائق اردو ادب نواز معیار پسند اور بلند خیالاتی شخصیات کے صف اول میں گنا جاتا ہے کیونکہ ادب کو اپنا حرز جاں بنائے ہوئے خوب مطالعہ گہرائی اور گیرائی سے کرتے پورے انہماک ارتکاز اور خوب غور خوض سے پڑھتے تب جا کر اچھی طرح چھان پھٹک کے بعد حوالہ قلم کرتے ادب کے ہر رنگ وآہنگ میں درک رکھتے سبک دوشی سے قبل اور بعد گذشتہ کئی برسوں سے نوک قلم کافی رواں دواں تواتر سے چلتا رہا۔

ایک معتبر اور باصلاحیت استاد ادب نگار ہی نہیں بلکہ تنقید وتحقیق کے اعلیٰ گہرے پیڑ رکھنے کے خاص شغف رکھتے تھے اس لئے ان کی تمام تصنیفات اپنے موضوع اور بھرپور مواد کے اعتبار ومشکل کشاں سے ایک اہم اور قابل قبول اور قابل تحقیق مطالعہ ہیں پروفیسر وہمارے استاد محترم میں چند خوبیاں نہیں تھی وہ باغ وبہار شخصیت کے مالک غیر معمولی عبقری خصوصیات کے حامل خوش گفتار خوش اخلاق وسلیقہ اور خوش مزاج، زیباس ولباس اور نابغہ وقت کے اسباب دہلی سمیت پوری دنیا میں ان کے دوستوں، شاگردوں اور چاہنے والوں کی لاتعداد تھیں جس سے وہ بے پناہ محبت، شفقت اور اخلاق ونصیحت باٹتے، کلاس کے دنوں میں ان کی زبان سے خوبصورت، محنتی خیر مقدمی کلمات سن کر اور تہذیب داری دیکھ کر ہم سب حاضرین درجات حیرت کے ساتھ سمندری سوچ میں مبتلا ہوجاتے کیونکہ درجات میں گفتگو اور پڑھانے میں حد درجہ شیریں مزاج کا عنصر غالب رہتا جیسے زبان سے الفاظ نہی پھول برسا رہے ہیں ہو وہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع اور نقطہ نظر کو بحث ومباحثہ میں خوش گفتاری اور مزاحیہ پیرائے میں سند اور مثال پیش کرنے کا ملکہ جوہر رکھتے تھے۔

اس پس منظر میں موصوف صاحب کا یہ خیال جامع اور بصیرت افروز ہے کہ انسان کے اندر عرش تا فرش سب کچھ ہے صرف برہنہ آنکھ سے نظارہ کرنے کی ضرورت ہے ان کا علم وشعور اور تجربہ یہ وضاحت کرتا کہ جس آدمی کا دل روشن ہوتا وہ آگے پیچھے ہمیشہ یکساں طور پر خورشید کی طرح باعث تنویر ہوتا ہے استاد محترم ایک دور اندیش شخص تھے انہوں نے اپنی تمام زندگی تعلیمی منصوبہ بند طریقہ ولائحہ عمل مہم میں ایک مشن کی طرح گزاری۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی شخصیت بالخصوص اہل قلم کی پہچان خوشی اور رنج کے مواقع پر ہی میزان کی کسوٹی پر اتاری جاتی ہے ہندوستانی ادبیات کی اصلیت ہے کہ غالب، نظیر اکبر آبادی، پریم چند ذوق، دیا شنکر نسیم اور بھی بہت استاد ادب کو تعصبی چشمہ اتار کر مرنے کے بعد ہی اونچی نگاہ اور ان کا حق دیا گیا ہے۔

موصوف محترم صاحب کا فکشن آمد کی فکشن نگ آری ہے آورد کی نہیں جو کسی مخصوص موڈ، کاوش اور بیاض کی محتاج نہیں ہوتی ہے بلکہ بیش بہا شدت جگر واحساس کا قالب اختیار کر لیتی ہے ان کی خوبصورتی کی علامت ہے کہ شگفتہ، شائستہ، دل کش اثرات، اسلوب دھیما لہجہ دھڑکتی ہوئی علامتیں دید ومشاہدے کی صداقت قاری وسامع کو اپنی جانب متوجہ ہی نہیں کشش کر لیتا ہے انہوں نے داستان کی صداقت واہمیت سے لے کر افسانہ کی طاقت زور کو سامنے رکھ کر فکر اور پرواز تخیل پر بڑی کارآمد گفتگو ہی نہیں بحث ومباحثہ کر تنقید وتحقیق کے در اور دروازہ کھولنے کی پوری تخلیقی وضو کی جس کی تعارف ملکی واسفار امریکہ، انگلینڈ، روس اور پاکستانی یونیورسیٹی کے استادوں نے کی جہاں افسانہ نگاری ہو ناول یا مضمون کو سماجی پیغام اور ثقافتی مضبوطی ہر اعتبار سے نہایت پرکشش اور جاذب نظر بنا کر پیش کیا ان کی تمام تحریریں اردو ادب میں ثروت مند اضافہ ہی اضافہ شمار کی جائیگی خوبصورت معیاری اور معنی خیز تاثرات مضامین دل چھو لینے والے عقل وشعور کو بھی جھنجھوڑتے ہیں۔

الغرض لائق، فائق استاد محترم کی عنقری شخصیت نے ہندوستانی ادب بالخصوص فکشن کی دنیا میں تخم پاشی کا کام انجام دیا ان کی تحریروں کی تنوع اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے مادر وطن کے ہر ادبی گوشہ گوشہ کو سرسبز وشاداب اور زندہ وتابندہ ستارہ بنانا چاہتے ان کی نوک قلم کی نثر بظاہر الفاظ وتراکیب کی آمیزش سے بلند ہی نہیں بلکہ مختلف ادبیاتی زبانوں کے استعمال نے خوبصورت نما جملہ عطا کئے جو قاری کے ذہن کو جھنجھوروجکڑ کر زلف اسیر کر لیتے ہیں یہ ہی اسباب ہے کہ خود صف اول کے فکشن نگار کے ساتھ پریم چند، قرۃ العین حیدر سعادت حسن منٹو کرشن چندر، عصمت چغتائی، الیاس احمد گدی، اختر اور نیوی جیسے نامور اہل قلم سے بھی متاثر ہو کر ان کے نقش قدم پر کھڑا اترنے اور ان کی روش اختیار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

موصوف کی دو درجن سے زائد کتابوں کے علاوہ شاعری، افسانہ، ناول، تنقیدی اور تحقیق موٹو گراف کی شکل میں ملکی اور بین الاقوامی رسائل میں لاتعداد مضامین منظر عام پر آچکے ہیں، تیسری دنیا کے لوگ افسانہ 1984ء بندر استے افسانہ 2000ء ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں 1988ء تنقید وتحسین (تنقیدی مضامین) 2006ء باغ و بہار مقدمہ و متن 2008ء انتخاب سخن (شاعری کا انتخاب) داستان سے ناول تک (تنقیدی) 2001ء پہلے آپ (ڈرامہ) 2008ء تنقیدی اظہار 2015ء فسانہ عجائب (مرثیہ) 2016ء نظیر اکبر آبادی کی شاعری 2008ء ریاض دلربا (اردو کا اول ناول) تحقیق 1990ء اور داستان کی جمالیات وغیرہ وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

مذکورہ بالا پیش نظر کتابوں میں داستان کی جمالیات میں فکشن کی تقریباً تمام اصناف نثر کی ارتقا اور ان کے مصنفین کو متعارف کرانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اگر ان نثری مضامین کی خوبیوں کو صیقل کی نظر ونگاہ سے نظارہ کیا جائے تو قریب خوردہ شاہین سے آراستہ ہو کر اپنی قوم وملت کے لئے چمکتا کوہ نور ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ ہر مضامین سے عقیدت ومحبت کی خوشبو ابھرتی ہے ان کی کتابیں اعلیٰ درجہ کی زینہ زندگی کے ساتھ طلبہ شائقین تحقیق ادب کے لئے بہت مفید اور کارآمد اسفار زندگی ہے اس لئے وہ ہمیشہ مبارک اور تحسین ستائش کے مستحق ہے دنیائے اردو سب نے ان کی ادب دوستی، ادب جنون کو بہ چشم رشک دیکھا اور مؤدبانہ سلام وتعریفی کلمات پیش کیا وہ برابر ذاتی تاثر مفید مشورے بے باک اظہار خیال، حوصلہ پروری کا سلسلہ ورابطے بنائے رکھتے جن نثری اصناف کا ارتقائی جائزہ اپنی کتابوں یا مضامین میں لیا ان کے اندر تشنگی اور کمی کا احساس نہیں ہونے دیا جس کی وجہ

سے ہر باب میں آخری حروف معلوم ہوتا ہے ان کی ذاتی لائبریری جس میں کئی ہزار کتابیں ہیں جو قابل دید بھی اور شوق مطالعہ ہے۔ جہاں مختلف ہر علوم وفنون کی کتابوں کے ساتھ اردو کی کلاسیکی تہذیبی اور ثقافتی کتابیں بھی سلیقہ سے الماریوں میں دستیاب ہیں اس سے ان کی بہترین علمی اور ادبی ذوق کے ساتھ گہرے مطالعہ خوش طبعی اور ان کی دلنوازی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتابوں کے درمیان رہتے خوب مطالعہ کرتے پھر قلم کو کسی موضوع کے حوالہ کرتے۔

ان کی گرانقدر خدمات اور تخلیقی اصناف کے لئے ملک وملت ہمیشہ ہمیش احساس مند رہیگی ان خدمات واحسانات کے لئے استاد محترم کو کئی ملکی اور بین الاقوامی اعزازات وانعامات سرسید میلینیم ایوارڈ دہلی اردو فکشن 2001ء افسانہ بندر راستے پر 1979ء میں سابق نائب صدر صدر جمہوریہ کے دست مبارک، دہلی اردو اکیڈمی فکشن ایوارڈ 2008ء اتر پردیش اردو اکاڈمی بہار اردو اکاڈمی اور بنگال اردو اکاڈمی سے سرفراز کیا گیا ہے۔

انسانی زندگی کی زنجیر کتنی بھی مضبوط ہو ایک دن ٹوٹنا ہے موت کا وقت مقرر ہے آج وہ کل ہماری باری ہے مگر موت کو گلے لگانے والوں کی خوبیاں رہ جاتی ہے وہ چلا جاتا ہے اتنی دور کی وہ کبھی واپس نہیں ہوسکتا سب جانتے ہی نہیں یقین کامل بھی ہے فنا سب کا مقدر ہے لیکن کچھ موت کو گلے لگاتے ہیں تو اہل خاندان کے ساتھ ہر خویش واقارب ہر آشنا تڑپتا، بلکتا، سسکتا ہے اور دل میں رنج والم کا طوفان کھڑا کر لیتا ہے دل کے لہو آنسو بن کر جھلکتا ہے دل سے خلق خدا کی طلب گار رہوتا ہے وہ خدا کا برگزیدہ ومحبوب اور نیک بندہ تھا اور غم وافسوس کا اظہاریوں کرتے ہیں ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جیسے زمانہ، موصوف دار فانی سے دار بقاء کی جانب کوچ کر گئے ان کے ہزاروں شاگرد اور فیض یافتہ مضطرب وبے چین ہیں اپنے شریف النفس، سادہ لوح مزاج انسان مربی، مشفق قابل احترام استاد کی جدائی پر ماتم کناں ہیں۔ گردن میں ذرا جنبش دی اور اخلاص ووفا، شفقت ومحبت میں سمندر کے مانند ڈوبی مخصوص لب ولہجہ والی آواز کانوں میں دستک دی، بے لوث، بے غرض مفاد پرست اور خدا ترس استاد ہم لوگوں سے بہت دور رحمن ورحیم کی رحمتوں کی آغوش میں سو گئے۔ میرے استاد محترم ہم لوگوں کو الوداع کہہ گئے۔ مگر اپنے شاگردوں اور لواحقین کا ہجوم کے واسطے اپنے خیالات کو جس عرق ریزی سے کاغذ پر اتارا ہے۔ وہ ستارہ غالب ولہجہ وجدید اسلوب ان کی گہری فکر ان کا بے باک اظہار بیاں اور لاجواب موضوعات اردو شاعری، فکشن بالخصوص ادبی روایت کے دامن گلزار میں خوشبوں کی طرح صدیوں سے زائد عرصہ تک مہکتے اور چہکتے رہیں گے۔

فکشن کے زمین کی وہ جاوداں شمع جو خاموش ہوگئی مگر اپنی بیش قیمتی خیالات کی روشنی بکھیر دی ہے وہ صدا یادیں دلاتی رہے گی۔

☆☆☆

Md. JUNAID SAKRAVI
Vice Principal:
R.B. JALLAN INTER COLLEGE
At- Sahla, P.O.: Sonki
Dist: Darbhanga, Pin-846009

پروفیسر ابن کنول: کچھ یادیں، کچھ باتیں

ڈاکٹر افضل مصباحی
اسسٹنٹ پروفیسر و سیکشن انچارج آف اردو
ایم ایم وی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اتر پردیش، بھارت
ای میل:afzalmisbahi@gmail.com
موبائل:9810358883

''ہاں بھئی! کیا حال ہے.....؟ بچے کیسے ہیں.....؟ نیا کیا کر رہے ہیں.....؟ شعبے کے حالات کیسے ہیں.....؟'' انتہائی پیار، محبت اور اخلاص سے لبریز یہ اور اس طرح کے اور بھی بہت سے جملے سننے کو کان ترس گیا۔ اس لیے کہ یہ جملے ایک ایسے ہمدرد، مخلص، سرپرست اور خوشی وغم کے شریک استاد محترم کے ہیں؛ جو بظاہر اب اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن ان کی یادیں تر و تازہ ہیں اور وہ تا حیات ایسی ہی رہیں گی۔ ان کے مذکورہ جملوں کو محض جملے کہنا بڑی نادانی ہوگی۔ یہ جملے اکسیر کا کام کرتے تھے اور توانائی بخشتے تھے۔ تحریری سرگرمیوں میں ذرہ برابر بھی کوتاہیوں کا خدشہ ہوتے ہی فون کر کے دریافت کرتے کہ ''ارے بھئی! ان دنوں کچھ لکھ پڑھ نہیں رہے ہیں! اس سے تو بہتر تھا کہ آپ روزنامہ 'انقلاب' میں تھے، جہاں ہر ہفتے ایک کالم 'بولتی سطریں' کے نام سے نظر آجاتا تھا''..... اتنا سننے کے بعد تن من لرز جاتا اور فٹافٹ وہ تمام علمی و ادبی سرگرمیاں شمار کرانے لگ جاتا کہ ''پریم چند پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں، امریکہ کا سفرنامہ لکھ رہا ہوں، چند ریسرچ پیپرز پر تحقیقی کام چل رہا ہے، کلاسیز بھی ریگولر چل رہی ہیں اور سیکشن انچارج کا فریضہ بھی انجام دے رہا ہوں.....'' اتنا سنتے ہی خوش ہوتے، دعائیں دیتے اور کامیابی کی نیک خواہشات کا اظہار فرماتے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ان کا کوئی اکلوتا شاگرد نہیں ہوں؛ جن کو آپ اس طرح کا فون کرتے تھے، بلکہ ان تمام شاگردوں کے ساتھ آپ کا ربط وضبط ایسا ہی تھا جن کا تعلق تعلیم و تعلم اور علم وادب سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ ابن کنول کے تمام شاگرد یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ ''سر سب سے زیادہ ہمیں چاہتے تھے.....''

استاد گرامی پروفیسر ابن کنول صاحب سے میرا رشتہ دو دہائی پرانا ہے۔ دہلی یونیورسٹی سے ایم۔اے۔(اردو) کے دوران (2002ء) آپ سے پہلی ملاقات ہوئی اور استاد اور شاگرد کا رشتہ روز بروز مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ میں ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں جنہیں ابن کنول صاحب کی سرپرستی میں ایم۔فل۔ اور پی۔ ایچ۔ڈی۔ دونوں کرنے کا شرف حاصل ہے۔ ایم۔فل۔اور پی۔ایچ۔ڈی۔ کے دوران انھوں نے لکھنے کا سلیقہ جس خوش اسلوبی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ سیکھایا اور ایک ایک باریکی کی نشاندہی کرتے ہوئے مضمون نگاری کی تکنیک، مقالہ نگاری کی تکنیک، تحقیق کے اسرار و رموز، زبان و بیان کی سلاست، الفاظ کی ادائیگی کا ہنر، عبارت خوانی کی تکنیک، پروف ریڈنگ کا طریقہ اور تھیسس کی ترتیب و پیش کش وغیرہ کی مشق

کرائی؛ وہ ساری باتیں اپنے آپ ذہن نشیں ہوتی چلی گئیں۔ ابتدا سے آخر تک تمام ابواب کو سننا اور اصلاح کرتے جانا میرے لئے اس قدر مؤثر ثابت ہوا کہ آج الحمدللہ اہل علم کے مجمع میں بولنا، مقالہ پیش کرنا اور کسی موضوع پر خطاب کرنا بار خاطر نہیں ہوتا۔

پروفیسر ابن کنول میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں جو ایک اچھے استاد، ماہر ادیب، دیدہ ور قلم کار، دور بیں ناقد، کہنہ مشق تخلیق کار، تجربہ کار اسکالر اور ایک اچھے انسان میں ہونی چاہئیں۔ خواہ وہ تحریر ہو یا تقریر؛ خوبصورت اور دلکش پیرائے میں باتوں کو پیش کرنے اور موضوع کی مناسبت سے معرکۃ الآرا بحث کرنے کا وہ ہنر جانتے تھے۔ خاکہ ہو یا افسانہ، تحقیق ہو یا تنقید؛ تمام اصناف میں آپ فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیتے اور 'شگفتگی وسنجیدگی' کو برقرار رکھتے تھے۔ اپنے حریفوں کا خاکہ بھی والہانہ انداز میں انھوں نے تحریر کیا ہے؛ جو ان کے وسیع الظرف ہونے کا بین ثبوت ہے۔ وہ اپنے سینے میں ایک ہمدرد دل بھی رکھتے تھے؛ جو ہر لمحہ شاگردوں کے لئے ڈھڑکتا تھا۔ بلاتفریق وامتیاز تمام شاگردوں کی حوصلہ افزائی، رہنمائی، سرپرستی اور ہر طرح کا تعاون ان کی زندگی کے معمول کا حصہ تھا۔ شاگردوں کو ان کی صلاحیت کے مطابق روزگار دلانے کی کوشش کرتے رہنا ان کی عادت سلیمہ تھی۔ اللہ رب العزت نے جن نعمتوں سے انھیں نوازہ تھا؛ ان پر وہ پوری طرح قانع تھے۔ سینئر پروفیسر بننے کے بعد ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ اب آپ کو کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے لئے کوشش کرنی چاہئے؛ تو انھوں نے برجستہ جواب دیا، ''ارے نہیں بھئی! اللہ نے جتنا نوازہ ہے وہی میرے لئے کافی ہے۔'' اس طرح کی باتیں وہی کرسکتا ہے؛ جو صابر وشاکر ہو، قناعت پسند ہو، حرص وہوس کا شائبہ بھی جس کے اندر نہ ہو اور جو ایمانداری سے کام کرنے پر یقین رکھتا ہو۔

ایمانداری کی بات آئی ہے تو اس تعلق سے بہت سی باتیں ہیں جن کا یہاں تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک اچھا موقع ہے کہ قارئین حضرات پروفیسر ابن کنول صاحب کی ان خوبیوں سے واقف ہوں؛ جنھوں نے ان کی مقبولیت میں چار چاند لگائے۔ سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ استاذ گرامی وقت کے بہت پابند تھے۔ شدید سردی کے موسم میں بھی بلاناغہ صبح نو بجے کی کلاس کے لئے وقت پر پہنچتے۔ میں نے انھیں کبھی بھی ٹال مٹول کرتے نہیں دیکھا۔ کلاس کا وقت آتے ہی لیکچر شروع کردینا ان کی عادت سلیمہ تھی۔ اپنے فرائض منصبی کو وقت پر خوش دلی کے ساتھ انجام دینا ان کے معمول میں شامل تھا۔ طلبہ کو جو وقت دیتے؛ اس وقت شعبہ میں یا گھر پر بلاتے تو وہاں موجود رہتے۔ بہت سے قارئین اس بات سے حیرت زدہ ہوں گے کہ وقت پر کلاس لینا تو ڈیوٹی کا حصہ ہے۔ اسے کسی کی خوبی کے طور پر کیسے بیان کرسکتے ہیں؛ تو ان کے اس شبہہ کو دور کردینا ضروری ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ یونیورسٹی کے معتدبہ پروفیسر حضرات کلاس سے غائب رہنے کو اپنی خوبیوں میں شامل کرتے ہیں۔ وقت پر کلاس نہ لینا، فرائض منصبی کو پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا نہ کرنا؛ ہندوستانی یونیورسٹیز کے بہت سے اساتذہ کی ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے جس کی وجہ سے نسلیں برباد ہوجاتی ہیں۔ پروفیسر ابن کنول صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ ''ایک استاد کی شناخت کلاس روم سے بنتی ہے، جو کلاس سے غائب رہتے ہیں؛ اس کی مثال اس گدھے کی ہے جو نہ گھر کا رہتا ہے اور نہ گھاٹ کا۔'' آپ مجھے اس بات

کا ہمیشہ درس دیتے کہ ''بیٹا! کبھی کلاس سے غائب نہ رہنا! اپنے فرائض کو وقت پر ادا کرنا، ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ کام کرنا، موقع ہاتھ آنے کے باوجود پیسوں میں خرد برد نہ کرنا، مطالعے کی عادت اور مسلسل لکھتے رہنے کا ہنر قلم کار کو بہت آگے پہنچا دیتا ہے''۔

ایک مرتبہ این سی ای آر ٹی نے مجھے ایک ورکشاپ کے لئے مدعو کیا۔ میں نے اے سی سیکنڈ کا ٹکٹ لیا۔ ورکشاپ مکمل ہونے کے بعد مجھے دلی یونیورسٹی میں ایک طالب علم کے ایم۔فل۔کا وائیو لینا تھا۔ پروفیسر ابن کنول صاحب نے کہا کہ آپ ٹکٹ کی رقم این سی ای آر ٹی سے لے چکے ہوں گے؛ اس لئے یہاں سے مطالبہ مت کیجئے گا! میں نے کہا، ''میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں یہاں سے ٹکٹ کی رقم کا مطالبہ کروں گا، اس لئے کہ میں پہلے ہی یہ رقم وہاں سے وصول چکا ہوں''۔ اس کے جواب میں پروفیسر ابن کنول صاحب نے کہا کہ بہت سے ایسے پروفیسر حضرات ہیں جو ایک ہی ٹکٹ دیکھا کر رقم کئی کئی اداروں سے وصول لیتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ ایک تعلیم یافتہ انسان بھی معمولی رقم کے لئے کس حد تک گر سکتا ہے اور چھچھورے پن کا مظاہر کر سکتا ہے! ساگر یونیورسٹی واپس جا کر میں نے اپنے ایک سینئر ساتھی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ''این سی ای آر ٹی نے ایسے کئی پروفیسروں کو بلیک لسٹڈ کر رکھا ہے جنھوں نے اے سی سیکنڈ کا ٹکٹ نکال کر اسے کینسل کروا دیا اور سلیپر کلاس میں سفر کر کے اے سی سیکنڈ کلاس کا کرایہ وصول کر لیا!!!'' یہ بات میرے لئے اور بھی حیران کن تھی۔ مذکورہ دونوں واقعات کے تذکرے کا مقصد محض یہ بتانا ہے کہ پروفیسر ابن کنول صاحب اپنے شاگردوں کی تربیت کس کس طرح کیا کرتے تھے۔ ان کے دل میں یہ جذبہ تھا کہ ان کے شاگردوں کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آپ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ اخلاقیات کا درس دیا کرتے تھے۔ اس وقت طالبعوں کو اخلاقیات کا درس دینا بہت ضروری ہے۔ ایمانداری کا سبق پڑھانا اور اس سے قبل خود اس پر کاربند رہنا باوقار زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت بدعنوانی، بے ضابطگی، بے راہ روی، بدخلقی، بدخصلتی، بدزبانی اور زبان درازی جیسی برائیاں عام ہو چکی ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' سے سبکدوش ہونے کے بعد جب میں ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی، ساگر میں شعبۂ اردو و فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہو گیا تو راقم الحروف کے خلاف ایک 'سازشی ٹولہ' نے منظم طور پر شر انگیزی کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں دو کاسہ لیس صحافی، ملازمت کے لیے کوشاں ایک ریسرچ اسکالر اور ایک پروفیسر صاحب پیش پیش تھے۔ انگریزی اور اردو کے اخبارات میں بیان بازی، میری کتاب 'اردو صحافت آزادی کے بعد' میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تاریخ پیدائش کے تعلق سے مدلل بحث کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے قومی اردو کونسل نئی دہلی سے معمولی رقم جو کتاب کی اشاعت کے لئے وہاں سے ملی تھی؛ اس کی واپسی کا مطالبہ، دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے میری پی۔ایچ۔ڈی۔ ڈگری رد کرنے کا مطالبہ، ساگر یونیورسٹی میں میرے خلاف آر ٹی آئی اور نہ جانے کہاں کہاں کون کون سی شرارت کی سازش رچی گئی؛ اس کے بارے

میں صحیح علم اللہ ہی کو ہے۔معاملہ جب تک راقم الحروف سے متعلق تھا تو میں نے کسی طرح کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا؛اس لئے کہ میں پوری طرح مطمئن تھا کہ میں نے جو لکھا ہے وہ اپنی طرف سے تو لکھا نہیں ہے، بلکہ مجھ سے پہلے جن محققین نے اپنی اپنی کتابوں میں اس بحث کو شامل کیا ہے؛ان کے حوالے سے میں نے مدلل تحقیقی بحث کی ہے؛اس لئے علمی سطح پر میں معترضین کو جواب دے دوں گا۔لیکن ایک صبح 'چوتھی دنیا' کی ایک رپورٹ کا تراشا پروفیسر ابن کنول صاحب نے بھیجا، جس میں اقتدار کے نشے میں چور ایک پروفیسر صاحب نے سازش کے تحت استاذ گرامی کی تصویر لگوائی تھی اور مجھ سے متعلق معترضین کے اعتراضات کو ان کی طرف موڑنے کی ناپاک کوشش کی تھی، جس کے بعد میرے خاموش رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک تحقیقی مقالہ 'کاسہ لیسی اور تحقیق کا تصادم' تحریر کیا، جسے 'چوتھی دنیا'، روزنامہ 'ہمارا سماج' اور ماہنامہ 'جام نور' دہلی کو ارسال کیا۔'چوتھی دنیا' نے بہت سے اہم نکات کو حذف کر کے شائع کیا، جب کہ 'ہمارا سماج' اور ماہنامہ 'جام نور' نے من وعن شائع کر دیا۔اس کے لئے میں ہمارا سماج کے ایڈیٹر جناب خالد انور اور ڈاکٹر خوشتر نورانی کا شکر گزار ہوں۔اشاعت سے قبل میں نے وہ تحریر استاذ گرامی کو ارسال کی، تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور انھوں نے جس جملے کا استعمال کیا وہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ انھوں نے کہا تھا؛''جس خوش اسلوبی اور سنجیدگی کے ساتھ آپ نے مدلل جواب دیا ہے؛ وہ قابل تعریف ہے، مجھے آپ سے ایسی ہی امید تھی''۔اس کے بعد وہ سازشی ٹولہ پوری طرح سست پڑ گیا۔دوسری طرف دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو پروفیسر ابن کنول صاحب نے اطمینان بخش جواب دے دیا اور قومی اردو کونسل کو میری کتاب پر 'ص' کرنے والے معزز ماہرین تعلیمات نے میرے حق میں جواب دے دیا۔اس طرح اس سازش کا پوری طرح سر کچل گیا۔ہاں! اس کا سائڈ ایفیکٹ یہ ہوا کہ ساگر یونیورسٹی سے اردو کے تین اسسٹنٹ پروفیسر ٹرمنیٹ دئے گئے؛جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا؛البتہ جس ریسرچ اسکالر نے آر ٹی آئی داخل کی تھی ان کے بارے میں مجھے علم نہیں کہ وہ ملازمت پانے میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔اس پورے واقعہ میں پروفیسر ابن کنول صاحب کا کردار ایک محسن، سرپرست اور محب اردو کے علاوہ ایک باوقار استاذ کا تھا؛جس نے ہر موڑ پر میری مدد کی۔گرچہ ساگر یونیورسٹی نے مجھے دوبارہ تدریسی فریضہ انجام دینے کا موقع دے دیا تھا؛لیکن پرماننٹ فیکلٹی کے طور پر نہیں بلکہ گیسٹ فیکلٹی کی حیثیت سے۔قدرت کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے؛اس نے ہم تینوں ساتھیوں کو دوسری یونیورسٹیوں میں ملازمت سے سرفراز کیا۔ساگر یونیورسٹی کی ملازمت جانے کے بعد اگر سب سے زیادہ کسی کو تکلیف ہوئی تھی؛تو وہ ہمارے استاذ گرامی پروفیسر ابن کنول صاحب تھے۔انھوں نے اس نازک موڑ پر میری بے پناہ حوصلہ افزائی کی اور بھروسہ دلایا کہ جلد ہی اللہ تعالیٰ بہتر انتظام بھی فرمائے گا۔ظاہر ہے کچھ دنوں بعد میری تقرری بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہوگئی۔ یہ ان کی دعاؤں کا ثمرہ تھا۔

پروفیسر ابن کنول صاحب کی خوبیوں کو بیان کرنے کے لئے ایک دفتر ناکافی ہے۔ان شاء اللہ رفتہ رفتہ ان سے متعلق یادوں کو قلم بند کرنے کی کوشش کروں گا۔البتہ یہاں اس امر کی نشاندہی بہت ضروری ہے کہ اللہ رب العزت نے انھیں بے پناہ

صلاحیتوں سے نوازہ تھا۔ان کی افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، ان کا سفرنامہ، داستان سے افسانہ تک ان کا بیش قیمتی تحقیقی سرمایہ، فن داستان گوئی کے علاوہ سینہ بہ سینہ انھوں نے اپنے ہزاروں شاگردوں کو جو علم منتقل کیا ہے؛اس کی نظیر پیش کرنا مشکل ہے۔ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی پر منعقد ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ کسی بھی ادیب کی پہچان تخلیق سے ہوتی ہے۔ پروفیسر شمس الرحمن فاروقی ایک بڑے ناقد تھے، لیکن ان کو شہرت ان کی تخلیق 'ایک چاند تھا سر آسماں' سے ملی۔ تخلیق اور تنقید کا یہ واضح فرق مجھ جیسے نو واردوں کے لئے ایک بڑا درس ہے۔ یہی سبب ہے کہ پروفیسر ابن کنول صاحب نے آخری دنوں میں تخلیق پر پوری توجہ مبذول کر رکھی تھی۔جس کے نتیجے میں ان کے خاکوں کا مجموعہ 'کچھ شگفتگی، کچھ سنجیدگی'، ان کے سفر کی روداد 'چار کھونٹ'، ان کے افسانوں کے مجموعے 'تیسری دنیا کے لوگ'' اور 'پچاس افسانے' وغیرہ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی ہی برادری کی غیر انسانی حرکت سے آپ کبیدہ خاطر تھے۔گرچہ اپنے شاگردوں کو اس کا احساس تک نہیں ہونے دیتے تھے؛لیکن اطلاع تو مل ہی جاتی تھی۔ انھیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ اب ان کی زندگی کے مختصر ایام باقی ہیں؛اسی لئے انھوں نے کام کی رفتار بھی بڑھا دی تھی اور انتقال سے چند روز قبل عمرہ کر کے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگ آئے تھے۔اللہ رب العزت انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

☆☆☆☆

گزشتہ صدی میں قریب ستر کی دہائی تک ہماری یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کا قحط تھا۔مشکل سے ایک یا دو پروفیسر ہوئے تھے اور جو پروفیسر صدر شعبہ بن جاتا تھا اس سے نجات کے لیے اس کا انتقال ہونا یا سبکدوش ہونا ضروری تھا۔ضابطوں میں ترمیم کے بعد اس قحط سے بھی نجات ملی اور مستقل صدر یا چیئر مین سے بھی چھٹکارا نصیب ہوا اور اب تو لفظ پروفیسر کثرت استعمال کے بعد اس لفظ کی وقعت ہی نہیں رہی۔

(میں ایک پروفیسر ہوں)

زندہ رہتا ہے زمانے میں عمل اور کردار

ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی
مدیر روزنامہ قومی بھارت، نئی دہلی

''زندہ رہتا ہے زمانے میں عمل اور کردار۔ روح کا کیا ہے کسی وقت نکل جائے گی'' راقم کا یہ شعر استاد محترم پروفیسر ابن کنول صاحب کی نذر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہو رہا ہے ''ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔'' جو اس روح زمین پر آیا ہے اس کو پلٹ کر بارگاہ خداوندی میں جانا ہے۔ ''جب احمد مرسل نہ کون رہے گا'' موت پر نہ جانے کتنے اشعار موجود ہیں جن کو نقل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بہر حال ہم انسان ہیں۔ اللہ نے ایک ایسا دل دے رکھا ہے کہ بس کیا کیا جائے کہ جب کوئی اپنا اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو دل قبول کرنے کو راضی نہیں ہوتا۔ خاص طور پر جب ہنستا بولتا انسان اللہ کو پیارہ ہو جائے جیسے استاد رخصت ہوئے ہیں ۔ گزشتہ ایک مہینے سے غور و فکر کر رہا ہوں کہ استاد پر کیا لکھا جائے؟ کس عنوان سے لکھا جائے؟ کیا باتیں کی جائیں؟ پروفیسر ابن کنول کے ساتھ رشتوں پر بات کی جائے، ان کی انسان دوستی پر بات کی جائے، ایک بہترین استاد کے سلسلہ میں بات کی جائے، ایک اچھے افسانہ نگار کے طور پر بات کی جائے، ایک بہترین محقق کے طور پر بات کی جائے۔ خاکہ نگار، انشائیہ نگار کے طور پر بات کی جائے۔ کس پر بات کی جائے۔ کئی مرتبہ قلم اٹھایا لیکن رکھ دیا۔ اب بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں اس پر بات کروں کہ میں الہ آباد سے دہلی آیا کیسے؟ میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ یہ میری ماں کی دعا رہی ہے کہ جب میں گاؤں سے الہ آباد یونیورسٹی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا تو وہاں مجھ غریب کو پروفیسر علی احمد فاطمی جیسا استاد ملا اور جب الہ آباد سے دہلی آیا تو یہاں پروفیسر ابن کنول جیسا استاد نصیب ہوا۔

تو میں بات کر رہا ہوں 2003ء کی۔ ایم اے کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور اب پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس وقت میں الہ آباد میں پروفیسر علی احمد فاطمی کی سرپرستی میں چلنے والی نوجوانوں کی ادبی تنظیم قلم کار کا کنوینر تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ادبی مضامین اور تبصرے شائع ہو رہے تھے۔ ادبی نشستوں اور سمیناروں میں شرکت کرنا اور اس میں سوال اٹھانا میرا شوق بن گیا تھا۔ جس موضوع پر سمینار ہوتا تھا اس موضوع پر مطالعہ کرتا تا کہ سوال اٹھا سکوں اور کچھ موقع ملے تو کچھ کہہ سکوں۔ اس دوران پروفیسر ابن کنول صاحب الہ آباد یونیورسٹی تشریف لائے تھے، انھیں وائیوا لینا تھا۔ جب بھی کوئی مہمان آتا تھا تو قلم کار اس کے لیے ایک استقبالیہ نشست کا اہتمام کرتی تھی۔

پروفیسر فاطمی صاحب کی رہائش گاہ پر نشست کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں کئی اہم شخصیات نے شرکت کی تھی۔ اس میں پروفیسر ابن کنول صاحب نے اپنا ایک افسانہ پیش کیا۔ یہ افسانہ گجرات قتل عام 2002ء سے متاثر تھا۔ اس پر جب تبصرہ شروع ہوا تو پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، پروفیسر فاطمی صاحب سے لے کر اوپیندر ناتھ اشک کے بیٹے نیلا بھ بھائی، راہی بھائی، ڈاکٹر فخر الکریم سب نے سخت تنقید کی اور سب کا کہنا تھا کہ افسانہ لاؤڈ ہو گیا ہے۔ اس میں اٹچمنٹ پیدا ہو گیا ہے۔ اتنا اوپن اور لاؤڈ ہونا مناسب نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارے یہاں فسادات پر لکھی گئی تحریروں کو نہ جانے کیوں دوئم درجہ کا ادب تصور کیا گیا ہے۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے، عرض یہ کرنا ہے کہ نشست کی نظامت کرتے ہوئے میں نے بھی تبصرہ کیا اور سب سے الگ کیا۔ میرا خیال تھا

کہ جب ادب زندگی کا آئینہ ہے تو جو زندگی میں ہو رہا ہے اس کا بیان کیا جا رہا ہے۔ جلتے سلگتے ماحول میں اور کیا لکھا جا سکتا ہے؟ آپ لوگ کیوں چاہتے ہیں کہ افسانہ نگار بناوٹی چیزیں پیش کرے اور حقیقت سے چشم پوشی کرے۔ خیر نشست اختتام پذیر ہوئی ۔ جب ہم لوگ کھانا کھانے لگے تو پروفیسر ابن کنول صاحب میرے پاس آئے اور بولے میاں یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ایم اے ہو چکا اور اب پی ایچ ڈی میں داخلہ کی تیاری کر رہا ہوں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ دہلی یونیورسٹی کیوں نہیں چلتے؟ وہاں تمہارے لیے زیادہ اچھا رہے گا؟ یہ بات دل میں لگ گئی۔ حالانکہ سوچ رہا تھا کہ وہاں کیسے رہوں گا؟ مالی حالات بھی میرے بہت خراب تھے۔ الہ آباد میں رہنا مشکل ہو رہا تھا تو دہلی میں کیسے رہتا؟ پھر والدہ کو چھوڑ کر دہلی کیسے جاؤں گا کیونکہ والدہ بھی اب گھر میں تنہا ہی تھیں۔ ساری بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ میرا دل بولا اب یہاں سے چلنا چاہئے۔ میں دہلی یونیورسٹی پہنچ گیا۔ میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی انٹرنس اگزام دیا تھا۔

یہ بات ہے 2004ء کی جب دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر صادق صاحب صدر شعبہ تھے۔ انٹرنس اگزام میں مجھ سے تفصیل معلوم کی گئی اور کہا گیا کہ جو آپ کا پسندیدہ مضمون ہو اس پر ایک صفحہ یہیں لکھ دیجئے چنانچہ لکھنا میرے لیے کوئی مشکل عمل نہیں تھا۔ میں نے ''اعجاز حسین کے ادبی ڈرامے'' پر ایک صفحہ فوراً لکھ کر پیش کر دیا۔ دوسرے دن جب لسٹ آئی تو اس میں پہلا نام راقم کا تھا ۔ اس وقت فیس بہت کم تھی چنانچہ میں نے ایم فل میں داخلہ لے لیا اور واپس الہ آباد آ گیا تھا۔ دو تین مہینے بعد پروفیسر ابن کنول صاحب کا پروفیسر فاطمی صاحب کے پاس فون آتا ہے کہ ممتاز یونیورسٹی کیوں نہیں آتے؟ پھر استاد نے بات کرائی۔ میں نے پورا قصہ بیان کیا کہ وہاں آؤں گا تو کہاں رہوں گا؟ پھر پیسے بھی نہیں ہیں۔ اس پر ابن کنول صاحب بولے اس کی فکر مت کرو۔ تم کو یہاں بزم ادب تنظیم کا صدر بنا دیا گیا ہے، بس فوراً آ جاؤ اور اپنی ذمہ داری سنبھالو، امتحان بھی دینا ہوگا۔ کلاس نہیں کرو گے تو ایم فل کا امتحان کیسے دو گے؟ مجھے یاد ہے پروفیسر فاطمی صاحب اسٹیشن تک پہنچانے آئے تھے اور میرے جیب میں چار ہزار روپے بھی رکھ دیے تھے۔ جب میں دہلی پہنچا تو استاد نے پہلے سے ہی اپنے ریسرچ اسکالر اکمل شاداب کو بلا رکھا تھا۔ ان سے تعارف کرایا اور کہا کہ فی الحال تم اکمل کے ساتھ رہو گے، پھر انتظام ہو جائے گا۔ اس طرح میں اکمل شاداب بھائی کے ساتھ ان کے روم پر گیا جہاں کئی اور ساتھیوں سے ملاقات ہوئی اور سب بہت اچھے تھے۔ پندرہ دن کے بعد ڈاکٹر نگار عظیم کی مدد سے وہیں بٹلہ ہاؤس میں ایک چھوٹا سا کمرہ لے لیا جیسا کہ الہ آباد میں لے رکھا تھا۔ اس دوران میں ریڈیو اور دوردرشن پر بھی جانے لگا تھا اور یہ نگار عظیم اور استاد کا کرم تھا۔ ایک پروگرام کی اینکرنگ کرنے پر ایک ہزار روپے ملتے تھے اور کمرے کا کرایہ چار سو روپے تھا۔ اگر دو پروگرام بھی مہینے میں ہو گئے تو کام ہو جاتا تھا۔ خیر گاڑی چل نکلی۔

پہلے ہی دن جب میں ابن کنول صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں کا ماحول بالکل فاطمی صاحب والا تھا۔ ایسا محسوس ہی نہیں ہوا جیسے کسی پرائے گھر میں آئے ہیں۔ اندر سے میم نکلی تھیں اور بولیں ''اچھا تو یہ وہی ممتاز ہیں جن کا آپ ذکر کرتے رہتے ہیں۔'' وہ دن تھا اور 11 فروری 2023ء کا سیاہ دن، بس وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ پروفیسر ابن کنول صاحب کے انڈر میں ایم فل بھی کیا اور پی ایچ ڈی بھی کی۔ استاد کی سرپرستی میں بڑی ادبی سرگرمیاں رہیں۔ کہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ قلم کار میں ہی افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور جب پروفیسر ابن کنول صاحب کا ساتھ ملا تو اس میں نکھار پیدا ہوا۔ کئی افسانے قلم بند کیے۔ 2004ء سے لے کر ان کے انتقال تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس سے کوئی من مٹاؤ تک ہوا ہو۔ البتہ جب میں نے صحافت چھوڑ کر کل ہند

مجلس اتحادالمسلمین جوائن کر لی تھی اور ترجمان بن گیا تھا تو یہ بات استاد کو پسند نہیں آئی۔ حالانکہ ان کے اندر ملت سے محبت تھی، ملت کے لیے بڑی ہمدردی تھی اور مجھے تو موضوع بتاتے تھے کہ اس پر لکھا جانا چاہئے، اس پر بولنا چاہئے۔ لیکن وہ بولے میاں تم کو اکیڈمک لائن میں آنا چاہئے۔ اس دوران میرے دو ناول سمیت 6/کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ پہلے ناول تعاقب پر استاد نے لکھا بھی ہے اور میرا دوسرا ناول خدا گنج کو استاد نے خود پڑھا اور کہا کہ پروف کی کچھ غلطیاں ہیں اس لیے اس کو دوبارہ شائع کرانا چاہئے۔ یہ ناول لاجواب ہے ،قبرستان کے موضوع پر لکھا گیا یہ اردو کا پہلا ناول ہے اور اس سے تمہاری ذہانت کا میں قائل ہو گیا ہوں۔

معاف کیجئے گا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا لکھوں۔ میں آخر میں یہ کہوں گا کہ اب کوئی کہنے والا نہیں ہے کہ ممتاز اکیڈمک لائن میں آ جاؤ۔ فارم بھرو۔ چھوڑو سب۔ وہ شفقت، وہ پیار و محبت نہیں رہی۔ دہلی میں تنہا سا ہو گیا ہوں۔ استاد نے بھی کمال کر دیا تھا۔ گزشتہ دو تین برسوں میں انھوں نے جو خاکے، انشائیے لکھے ہیں وہ لاجواب ہیں۔ انھیں وہ اودھ اور دوسرے اخباروں میں شائع بھی کراتے رہتے تھے اور فیس بک اور یوٹیوب پر لائیو بھی کرتے تھے۔ پڑھنے کا انداز لاجواب۔ میں نے بہت پروفیسران کو دیکھا ہے جو نئی تکنیک کو اپناتے ہوئے گریز کرتے ہیں یا گھبراتے ہیں لیکن پروفیسر ابن کنول نے یوٹیوب، فیس بک اور دوسرے جو تکنیکی ذرائع ہیں ان کا بھرپور استعمال کیا۔ اپنا فیس بک اور یوٹیوب چینل بنایا اور ان پر انشائیہ اور خاکے اپنے منفرد انداز میں پیش کیے۔ استاد کی کئی اہم کتابیں شائع ہو کر نہ صرف منظر عام پر آئی ہیں بلکہ کافی مقبول بھی ہوئی ہیں۔ ''ہندوستانی تہذیب (بوستان خیال کے آئینہ میں)، یہ کتاب 1988/میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ 2003/میں ''داستان سے ناول'' تک ایک اہم فکشن پر کتاب آئی اور یہ کتاب استاد نے مجھے بھی اپنے ہاتھوں سے عنایت فرمائی تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مجھے داستانوی ادب کو سمجھنے میں کافی مدد ملی تھی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' 1984/میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا اور 1980/کے بعد افسانوی ادب میں جو نئی نسل آئی اس میں آپ کا نام پیش پیش رہا۔ یہ افسانے جدیدیت سے الگ بلکہ کسی بھی نظریہ سے الگ ہو کر اپنی راہ الگ لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ پروفیسر ابن کنول کا افسانوی مجموعہ ''بند راستے'' بھی کافی مقبول ہوا ہے۔ ''بزم داغ'' کے عنوان سے ان کے ڈراموں کا بھی مجموعہ شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ آپ نے کئی اہم کتابوں کو مرتب بھی کیا اور کہتے تھے کہ یہ کام بھی بہت اہم ہے کیونکہ اس سے نئی نسل فیضیاب ہوتی ہے، اس کو آسانی سے چیزیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ان کی تنقیدی کتاب 'تنقیدی اظہار' بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سفرنامے بھی لکھے ہیں اور اس کا مجموعہ بھی ''چار کھونٹ'' کے عنوان سے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پروفیسر ابن کنول صرف ایک مدرس نہیں تھے بلکہ وہ ایک باکمال ادیب و ناقد تھے۔ انھوں نے اردو ادب کو ایک بڑا ادبی سرمایہ دیا ہے جس کے لیے اردو دنیا انھیں ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔

جب بھی خاکوں کا ذکر ہوگا وہ یاد کیے جائیں گے، جب بھی افسانوی ادب پر بات ہوگی وہ یاد کیے جائیں گے۔ جب بھی انشائیہ پر بات ہوگی ان کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔ جب بھی سفرناموں کی بات ہوگی وہ بھی یاد کیے جائیں گے اور ان کے سفرنامے بھی موضوع بحث ہوں گے۔ جب بھی ڈراموں پر بات ہوگی تو ان کے ڈرامے بھی حوالے کا کام کریں گے۔ جب بھی داستان کی تنقید پر بات ہوگی پروفیسر ابن کنول کا نام ضرور لیا جائے گا۔ انشاءاللہ میں استاد پروفیسر ابن کنول کی ادبی خدمات پر تفصیلی مقالہ بھی جلد قلم بند کروں گا۔ اللہ استاد کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت میں اعلی مقام عطا کرے۔ آمین یارب العالمین

***

پروفیسر ابن کنول: ایک مشفق استاد کی باتیں اور یادیں

ڈاکٹر یامین انصاری

ایڈیٹر، روزنامہ انقلاب، نوئیڈا، یوپی

yameen@inquilab.com

راقم الحروف کے مضامین اور کالم کا محور سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے صرف دو مواقع ایسے آئے جب اپنے جذبات اور احساسات کو قلم بند کرنے سے نہیں روک سکا۔ پہلی بار جب مارچ ۲۰۱۴ء میں خانوادہ قادریہ بدایوں کی علمی، روحانی اور تہذیبی وراثتوں کے امین علامہ اسید الحق قادری کی بغداد میں ایک دہشت گردانہ حملے میں شہادت کی خبر ملی اور دوسرے اکتوبر ۲۰۲۰ء میں جب میرے سر سے والد گرامی کا سایہ اٹھ گیا۔ اس کے بعد ۱۱ر فروری ۲۰۲۳ء کو جب یہ خبر سنی کہ ایک مشفق اور مربی استاد پروفیسر ابن کنول (ناصر محمود کمال) بھی اچانک راہی ملک عدم ہوئے۔ یہ خبر نہ صرف میرے لئے، بلکہ ان کے رفقا اور سیکڑوں شاگردوں پر بجلی بن کر گری۔ یہ خبر ہر کسی کے لئے ناقابل یقین تھی کہ چند روز پہلے اللہ کے گھر کا دیدار کر کے آئے پروفیسر ابن کنول کو اللہ نے اپنے پاس ہی بلا لیا۔ ادبی دنیا کی فضائیں سوگوار ہیں اور گزشتہ تقریباً بیس بائیس سال پر محیط میری یادوں کی تمام کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کب استاد کا فون آئے گا اور کہیں گے کہ 'ہاں بھئی کیا حال ہیں' ۔ میں انہیں اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ دل مانتا ہے نہ یقین آتا ہے کہ ہم ایک مشفق استاد سے محروم ہو گئے۔ وہ نہ صرف ادبی محفلوں کی جان تھے، بلکہ اردو ادب کا مان بھی تھے۔ بقول شاعر ؎

فضا اداس ہے، لہجوں میں سوگواری ہے
یہ کس کے جانے پہ اہلِ زباں اُداس ہوئے

کہتے ہیں کہ آپ کو قابل قدر استاد کا ملنا کسی غنیمت سے کم نہیں ہوتا جو آپ کی چھپی صلاحیتوں کو نکھارتا ہے، آپ کی خامیوں کو خوبیوں میں بدلتا ہے، اچھے برے کی تمیز، حلال و حرام کا فرق سکھاتا ہے۔ راقم نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد جب ایم فل کے لئے دہلی یونیورسٹی کی دہلیز پر قدم رکھا تو یہاں کی درس و تدریس اور ادبی ماحول سے بالکل نابلد تھا۔ ایم فل کے مقالے کے لئے کسی نگراں کی ضرورت تھی، مگر یہاں کے اساتذہ میرے لئے اجنبی تھے۔ اس وقت یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر صادق اور پروفیسر ابن کنول وغیرہ سے میری کوئی شناسائی نہیں تھی۔ ایسے میں پروفیسر ابن کنول کی شفقت بھری نظر مجھ پر پڑی اور انھوں نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس کے بعد ان سے ایک مشفق استاد کی حیثیت سے جو تعلق قائم ہوا، وہ ہمیشہ قائم رہا۔ اس میں بدایوں کی نسبت کا بھی کافی دخل رہا۔ طالب علمی کے زمانے سے لے کر آج تک جب بھی ملاقات یا بات ہوتی تو اس میں ذرہ برابر بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے کسی استاد سے نہیں، بلکہ ایک انتہائی مشفق، مخلص اور مربی انسان سے گفتگو ہو رہی ہے۔ کتابی شکل میں میری دو کوششیں منظر عام پر آئی ہیں۔ دونوں میں ہی استاد محترم نے اپنے دعائیہ کلمات سے نوازا۔ سفرنامہ 'عراق جو میں نے دیکھا' پر 'نقطہ نگاہ' کے تحت انھوں نے لکھا 'یامین انصاری ایک تجربہ کار صحافی ہیں اور صحافی کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ انھوں نے عراق میں جن

مقامات کو دیکھا، ان کی تاریخی وتہذیبی و مذہبی اہمیت کو اپنے سفر نامے میں تفصیل سے بیان کیا۔ ان کا سفر نامہ پڑھ کر عراق کی تاریخی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔' اسی طرح میرے مضامین کے مجموعہ 'صدائے دل' میں انہوں نے لکھا کہ 'ڈاکٹر یامین انصاری کو میں تقریباً دو دہائی سے زیادہ عرصہ سے جانتا ہوں، ان کا تعلق ہندوستان کے اس شہر سے ہے جو تاریخ میں علم وفضل کے لئے ہر دور میں مشہور رہا ہے، یامین انصاری نے اپنے شہر بدایوں کی فضا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ انھیں زبان پر بھی قدرت حاصل ہے اور اس کے اظہار پر بھی۔ عاجزی، انکساری اور ایمانداری ان کے خمیر میں شامل ہے، جو ایک دیانتدار صحافی کے لئے ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے مطالعے اور مشاہدے کی وسعت کے سبب ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ''صدائے دل'' واقعی ان کے دل کی صدا ہے۔ 'صدائے دل' کے مطالعہ سے تمام جہان کا نظارہ ہوجاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اس قلمی سفر کو جاری رکھیں گے۔' ان کے یہ الفاظ میرے لئے حرف زر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک شاگرد کے لئے اپنے استاد کی جانب سے اس بڑا اور کوئی اعزاز و انعام نہیں ہوسکتا۔ ان کی شفقت کا یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ دہلی میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں سے بھی مجھے ابن کنول صاحب نے متعارف کروایا۔ دہلی اردو اکادمی، ایوان غالب اور غالب اکیڈمی جیسے اداروں کے زیر اہتمام ہونے والے ادبی جلسوں اور سمیناروں میں مقالہ نگار یا ناظم کی حیثیت سے شرکت انہی کے سبب ممکن ہوسکی۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور اردو مجلس میں ابن کنول صاحب نے ہی متعارف کروایا۔ یہ سلسلہ آج بھی بدستور جاری ہے۔ دہلی میں ادب کے حوالے سے ان کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ جنھیں ایک مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ مجھے پروفیسر ابن کنول صاحب جیسے استاد سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ اردو دنیا میں پروفیسر ابن کنول کی شناخت ایک عظیم افسانہ نگار، خاکہ نگار، محقق، اور مرتب کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے تنقید نگار کے طور پر ہوتی ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کی تقریباً تین درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اپنے اصل اور قلمی نام کی خصوصیات ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ یعنی ان کی شخصیت واقعی کنول جیسی تھی۔ پروفیسر ابن کنول نے ملک کی آزادی کے ۱۰/سال بعد ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۷ء کو مرادآباد اور بدایوں کی سرحد پر واقع ہجوئی قصبہ میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہوتے ہوئے دہلی کا سفر کیا۔ پروفیسر ابن کنول کا دہلی یونیورسٹی سے ایسا رشتہ قائم ہوا، جو تادم مرگ قائم رہا۔ وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے کئی بار سربراہ رہے۔ پی ایچ ڈی میں آپ نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نگرانی میں 'بوستان خیال کا تہذیبی ولسانی مطالعہ' کے عنوان سے تحقیقی کام کیا۔ دہلی یونیورسٹی میں آپ کو بانی شعبۂ اردو خواجہ احمد فاروقی اور مشہور ترقی پسند نقاد قمر رئیس جیسے نامور ادیبوں سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اسی طرح علی گڑھ میں بھی انہیں پروفیسر قاضی عبد الستار، ڈاکٹر منظر عباس، پروفیسر شہر یار، پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر نعیم احمد اور ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی وغیرہ جیسی اردو ادب کی قدآور ہستیوں سے کسب فیض کا موقع ملا۔ انھوں نے نسل نو کی ہمیشہ حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پروفیسر ابن کنول نے اپنے پیچھے نہ صرف بیش قیمتی علمی وادبی سرمایہ چھوڑا ہے، بلکہ اپنے شاگردوں کی شکل میں اردو کی ایک پوری نسل تیار کی ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ زندگی فانی ہے، لیکن اس سچائی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب کسی کی زندگی کا آفتاب ڈوب جاتا ہے تو اس کی یادوں کا سورج طلوع ہوجاتا ہے۔ استاد محترم کی یادیں اور باتیں اسی اجالے کی مانند ہمارے اردگرد ہیں۔ اب ہمیں ان کی انہی یادوں کے اجالوں کے ساتھ رہنا ہے۔ پروفیسر ابن کنول کل بھی دہلی کی ادبی محفلوں کی جان تھے اور آئندہ جب بھی محفلیں سجیں گی، انہیں یاد کیا جائے گا۔ ☆☆☆

پروفیسر ابن کنول: ایک بے مثال استاد، لاثانی شخصیت

ڈاکٹر محمد شمس الدین
اسسٹنٹ ڈائرکٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی اسٹڈی سنٹر، بنارس، اتر پردیش

انسان کی زندگی میں کئی اہم شخصیات کا تعلق ہوتا ہے۔ مگر اس میں استاد کی اہمیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ خصوصی طور پر اگر بہترین استاد کی شاگردی حاصل ہوجائے تو اللہ کی عظیم نعمت سے کم نہیں ہے۔ پروفیسر ابن کنول صاحب کی شخصیت ایک ایسے ہی عظیم استاد کی رہی۔ شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی میں جب وہ اپنے چیمبر میں بیٹھتے تو طلبا ان کے چیمبر میں بلا جھجک داخل ہوجاتے اور اپنے عزیز استاد سے مختلف تعلیمی و تحقیقی موضوعات پر رہنمائی کی درخواست کرتے اور استاد محترم تشفی بخش رہنمائی کرتے تھے۔ استاد محترم کا دلچسپ انداز بیاں سبھی کو بہت پسند آتا تھا، جی کرتا کہ استاد کو مزید سنتے رہیں مگر وقت کی کمی ہوجاتی تھی۔ استاد محترم کی شخصیت ایسی تھی کہ شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی کا ہر طالب علم ان سے ملنے کا خواہش مند ہوتا تھا۔ وہ سبھی طلبا سے شفقت و محبت سے پیش آتے اور انہیں زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں سمجھاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے، تنقیدی صلاحیت پیدا کرنے اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کرنے پر متوجہ کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جنھوں نے ان کی نصیحتوں پر عمل کیا اور آج زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیاب و کامران ہیں۔

استاد محترم جب جامعہ نگر سے دہلی یونی ورسٹی کے لیے نکلتے تو اگر کوئی طالب علم جانا چاہتا تو اس کو بھی کار میں بیٹھا لیتے۔ راستے میں بھی کوئی شاگرد دکھ جاتا تو اسے بھی ساتھ بیٹھا لیتے تھے۔ ایک بار میں جب میں کار میں بیٹھا تو کرتا پائجامہ پہنا ہوا تھا، استاد نے کہا آپ یونی ورسٹی جارہے ہیں ایسے میں اپنا لباس کا ضروری خیال رکھیں۔ استاد کی یہ نصیحت مجھے آج بھی یاد ہے۔ اسی طرح جب میں نے ایم فل مکمل کیا اور وائیوا کا وقت ہوا تو کئی ساتھیوں نے کہا کہ وائیوا کے وقت طالب علم کی طرف سے ہائی ٹی اور سوئیٹس کے انتظام کرنے کی روایت ہے۔ استاد محترم نے مجھے بلایا اور کہا کہ ہاں بھئی! کل کے وائیوا کی تیاری ہوگئی؟ میں نے مثبت جواب دیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ دیکھو وائیوا کی خوشی میں کوئی ایک سویٹ کھلا سکتے ہو مگر فضول خرچی مت کرنا، جو بھی پیسہ ہو، اسے ماں باپ کو دو تو انہیں بہت خوشی ہوگی۔ اسی طرح مختلف اوقات وہ نصیحت سے نوازتے تھے۔

میری کافی خواہش تھی کہ پروفیسر ابن کنول صاحب کے زیر نگرانی اپنے ایم فل کا مقالہ تحریر کروں، جسے انہوں نے بخوشی قبول فرمایا۔ تحقیقی مقالہ موضوع کے تعلق سے کافی غور و فکر کے بعد پروفیسر محمود الٰہی کی تحقیقی و تنقیدی خدمات: ایک جائزہ موضوع منتخب ہوا۔ پروفیسر محمود الٰہی شعبہ اردو، گورکھپور یونی ورسٹی کے بنیاد گزار اور اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین رہ کر کافی اہم ادبی، تحقیقی و تنقیدی خدمات انجام دیا تھا مگر ان کی خدمات کے متعلق کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ استاد محترم کے حکم پر میں نے مختلف لائبریریوں اور اداروں خصوصاً شعبہ اردو، گورکھپور یونی ورسٹی اور اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کا سفر کر کے مواد اکٹھا کیا۔

پروفیسر محمود الٰہی پر یہ پہلا تحقیقی کام تھا۔ استاد محترم نہ صرف رہنمائی کرتے تھے بلکہ اپنے شاگردوں کو زمینی سطح پر ریسرچ کیسے کی جاتی ہے، اس پر عمل بھی کراتے تھے۔

پروفیسر ابن کنول ہمیشہ طلبا کی مدد کرتے تھے۔ خصوصاً اپنے شاگردوں کا کافی خیال رکھتے تھے۔ خود فون کر کے خیریت پوچھتے اور رہنمائی کرتے۔ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے، تحقیقی اور معیاری مقالات تحریر کرنے پر توجہ دلاتے تھے۔ ڈاکٹر محمد اکمل، ڈاکٹر افضل مصباحی، ڈاکٹر عزیر احمد، ڈاکٹر محمد ارشد اور مجھے کافی شفقت سے نوازتے تھے۔ نہ صرف تعلیم بلکہ نوکری کے سلسلے میں بھی شاگردوں کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ اشتہارات کے بارے میں معلومات، فارم بھرنے کا طریقہ، انٹرویو دینے کی تکنیک بتاتے تھے۔ شاید استاد محترم کی یہی وہ رہنمائی ہے کہ آج بڑی تعداد میں ان کے شاگرد برسر روزگار ہیں۔

استاد محترم خود اعلیٰ اخلاقیات کے مالک تھے اور دوسروں کو بھی اخلاقیات کی نصیحت کرتے تھے۔ میں نے کبھی بھی، کہیں بھی ان کا نام سنا تو وہ یہ ضرور سنا کہ پروفیسر ابن کنول ایک نہایت ہی با اخلاق شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے چاہنے والے ہوں یا نہ چاہنے والے سبھی ان کے اخلاقی معاملات کے قائل ہیں۔ چھوٹوں سے شفقت و محبت سے پیش آنا، اپنے ماتحتوں سے خوشی خوشی کام لینا، اور بڑوں کی قدر کرنا انہیں بہت اچھی طرح آتا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے معاملات کا اظہار اپنی کتاب ''چار کھونٹ'' میں کیا ہے۔

پروفیسر ابن کنول اسلامی معاملات میں بھی کافی پابند عمل تھے۔ پنجگانہ نماز کی ادائیگی ہمیشہ کرتے تھے۔ جہاں کہیں سفر میں بھی رہتے تو نماز کی ادائیگی ضرور کرتے تھے۔ نماز، روزہ، حج، زکاۃ کے ساتھ انہوں نے کئی عمرہ بھی کیا۔ اللہ کی مصلحت کہ عمرہ ادا کرنے کے چند دنوں بعد ہی وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت ان کی روح پرواز کی جب وہ وضو کر کے نماز ادا کرنے جا رہے تھے۔

☆☆☆

میں نے کہانی بیان کرنے کا فن اپنے بزرگوں سے سیکھا، کہانی میرے آس پاس گھومتی تھی، کبھی میں اُسے پکڑنے کے لئے بھاگتا تھا اور کبھی وہ مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔ کوئی بھی کہانی کار خود کہانی نہیں لکھتا کہانی خود اپنے آپ کو لکھواتی ہے، کہانی کار کو قلم اٹھانے کے لئے مجبور کرتی ہے، وہ اس وقت تک کہانی کار کے دل و دماغ پر وار کرتی رہتی ہے جب تک صفحہ قرطاس پر نہیں سما جاتی۔

(میں کیوں لکھتا ہوں۔ ابن کنول)

مخلص استاد پروفیسر ابن کنول

ڈاکٹر سدھارتھ سدیپ
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ

ہندوستانی تہذیب میں استاد کی اہمیت وحیثیت مسلم ہے، استاد کو باپ کا درجہ دیا گیا ہے، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ باپ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پیدائش کا سبب بنتا ہے، دوسرے وہ جو اپنی اولاد کو کسی کی زوجیت میں دیتا ہے یعنی سسر اور تیسرا وہ جو طلبہ کی تربیت کر کے کسی لائق بناتا ہے یعنی استاد۔ استاد ہی وہ شخصیت ہے جو نہ صرف انسانیت بلکہ دنیاوی علوم بھی عطا کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ استاد کی تربیت سے ہی کسی ملک و مذہب اور بہتر سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ جس سماج میں استاد کا احترام ہوتا ہے اس کی ترقی ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے اور جو سماج استاد کا احترام چھوڑ دیتا ہے، اس کا زوال بھی کوئی نہیں روک سکتا ہے، مگر یہ ضروری ہے کہ استاد، استاد کہلانے کا حقدار ہو۔ غور کرنے والی بات یہ کہ ہندوستان میں دونوں طرح کے استاد موجود ہیں۔ کچھ لوگ استاد تو بن جاتے ہیں لیکن استادوں جیسا کردار نہیں رکھتے اور کئی طرح کی تفریق کے قائل ہوتے ہیں۔ مجھے اپنی زندگی میں بھی دونوں طرح کے اساتذہ سے سابقہ پڑا ہے، لیکن افسوس کہ ایسے استاد کم ہی نظر آئے جو صحیح معنوں میں استاد کہلانے کے لائق رہے ہوں۔ پر جو اچھے تھے ان کی رہنمائی ہی کی بدولت آج یہ سب بیان کر پا رہا ہوں۔ اس لیے ان سب لائق و فائق اساتذہ کا شکریہ تو بنتا ہے۔ جن اساتذہ سے میں نے کچھ سیکھا ہے ان میں ایک اہم نام پروفیسر ابن کنول کا بھی ہے، جو استادیت کی کئی خوبیوں سے لبریز تھے۔

دہلی یونیورسٹی میں ایم فل کے لئے میرا داخلہ جولائی 2011 میں ہوا تھا تب سے ستمبر 2020 تک میں شعبہ سے منسلک رہا۔ اس درمیان کئی اچھے برے لمحات سے دو چار ہونا پڑا۔ جب میں نے شعبۂ اردو میں داخلہ لیا تھا تو اس وقت پروفیسر ابن کنول ایک سینئر استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ مکمل کرنے کے بعد شعبۂ اردو سے میں بھی 2019 میں درس و تدریس سے وابستہ ہوا۔ دہلی میں قیام کے دوران پروفیسر ابن کنول سے جب بھی ملاقات ہوتی بڑے خوش دلی سے ملتے اور مسکراتے ہوئے حال چال دریافت کرتے۔ چلتے پھرتے جب کبھی ملاقات ہو جاتی، آداب و تسلیم کرنے پر فوراً رک کر جواب دیتے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ تمام طالب علموں سے ایسے ہی پیش آتے تھے۔ ان سے ملاقات کرنا راحت بھرا پل ہوتا تھا۔ ان سے مل کر اپنے پن کا احساس ہوتا تھا۔ اس لیے ان کے لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ" پروفیسر ابن کنول طالب علموں کے لیے کنول جیسے تھے جو ہمیشہ سکون بھرا احساس دے جاتے تھے۔" ہندوستان میں ایسے استادوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو تعصب، ذات، مذہب اور سماج کے لئے ہزاروں تیر لئے پھرتے ہیں۔ جن سے مل کر ایک طالب علم کچھ سیکھنے کے

بجائے خوف زدہ رہنے لگتا ہے۔ پروفیسر ابن کنول ان اساتذہ کی فہرست میں شامل نہیں تھے جن سے کوئی طالب علم دور بھاگتا ہو ۔ بلکہ" ان کی پوری شخصیت ہی کنول کی طرح کومل تھی" جو نہ صرف طالب علموں کو اپنی طرف مائل کرتی تھی بلکہ ان کی شخصیت ہم جیسوں کے لیے مشعل راہ ہے اور جو ادبی تربیت میں ذوق کا کام کرتی ہے۔ ایسے اساتذہ ہمیشہ اپنے طالب علموں کے درمیان زندہ وجاوید رہتے ہیں۔

مارچ 2021 میں" داستان کی جمالیات" پر خطبہ دینے کے لئے شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی میں آپ کی تشریف آوری ہوئی۔ مجھے شعبۂ اردو میں دیکھ کر پروفیسر ابن کنول صاحب بہت خوش ہوئے نیز میری محنت اور ایمانداری کی تعریف کر کے ایک بار پھر میرا حوصلہ بڑھایا۔

پروگرام کے اختتام پر شعبۂ اردو کے طلبہ پروفیسر ابن کنول کے ساتھ بطور یادگار چند تصاویر لینا چاہتے تھے مگر جھجھک اور لحاظ کی وجہ سے ان سے کہہ نہیں پا رہے تھے۔ طلبہ نے مجھ سے کہا کہ ہم لوگ سر کے ساتھ کچھ تصویریں لینا چاہتے ہیں لیکن کہنے کی جسارت نہیں کر پا رہے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول یونیورسٹی کے اساتذہ کے درمیان گھرے ہوئے تھے اور ان سے باتیں کر رہے تھے۔ ابن کنول صاحب نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کے میری جانب قدم بڑھا دیا، میں نے موقع کی نزاکت دیکھ کر فوراً ہی عرض کیا کہ سر یہ ہمارے طلبہ ہیں اور آپ کے ساتھ تصویر لینا چاہتے ہیں۔ تو وہ بڑے شوق سے مسکراتے ہوئے بچّوں سے مخاطب ہوئے اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ بچّوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سدھارتھ سر ہم لوگوں کے استاد ہیں تو پھر انہوں نے بڑے تپاک سے کہا تب تو میں آپ لوگوں کا دادا استاد ہوں اور پھر دوستانہ لہجے میں بچوں سے بہت ساری باتیں کیں اور کچھ مفید مشوروں کے ساتھ ڈھیر ساری دعائیں بھی دیں۔ شعبے کے طلبہ جو تھوڑی دیر پہلے جھجھک محسوس کر رہے تھے اب ان سے بے تکلف ہو کر بالکل گھل مل گئے تھے۔ بچّوں کے ساتھ خوب ساری تصویریں کھنچوانے کے بعد دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے ہم سب سے رخصت ہوئے۔ کون جانتا تھا کہ سر کی یہ رخصتی آخری رخصتی ثابت ہوگی۔

☆☆☆

بظاہر ایک کہانی کار اپنی تسکین کے لئے کہانی لکھتا ہے، لیکن اصلاً صرف اپنے لئے نہیں سب کے لئے کہانی لکھتا ہے، جس طرح ایک ماں پہلے اپنے بچے کو دیکھ کر بار بار خوش ہوتی ہے پھر سب کے سامنے پیش کر کے مسرّت محسوس کرتی ہے۔ میں جب کہانی لکھتا ہوں تو لکھنے کے بعد بار بار پڑھ کر پہلے اپنے اندر کے طوفان کو شانت کرتا ہوں پھر دوسروں کے سامنے بیان کر کے تسکین پاتا ہوں۔

(میں کیوں لکھتا ہوں۔ ابن کنول)

ابن کنول کی کہانیوں میں داستانوی اثرات

ڈاکٹر محمد ارشد ندوی
اسسٹنٹ پروفیسر (ایڈہاک)،شعبۂ اردو،
دیال سنگھ کالج،(دہلی یونیورسٹی)
لودھی روڈ،نئی دہلی ۳

آٹھویں دہائی میں جن افسانہ نگاروں نے ایک نئی راہ اختیار کی ان میں ابن کنول کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ابن کنول (ناصر محمود کمال) نے ۱۹۷۰ء کے بعد لکھنا شروع کیا اور چند برسوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ان کی افسانہ نگاری کو علی گڑھ کے ادبی ماحول اور معروف فکشن نگار قاضی عبدالستار کی سرپرستی نے جلا بخشی۔زمانہ طالب علمی ہی میں ان کے افسانے اردو کے معتبر رسائل میں شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ان کے دو افسانوی مجموعے ''تیسری دنیا کے لوگ'' اور ''بندر راستے'' ہیں،گزشتہ چھ دہائیوں میں ابن کنول کی ساٹھ سے زیادہ کہانیاں ملک و بیرون ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں۔ابن کنول اپنی افسانہ نگاری کی ابتداء کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ!

> ''دراصل شاعری ہو یا افسانہ دونوں ہی انسانی احساسات کا اظہار ہیں،میں نے افسانے کو اپنے مزاج سے زیادہ قریب پایا،کبھی کبھی شعر یا نظمیں بھی لکھیں لیکن باقاعدہ کبھی شاعری نہیں کی۔طالب علمی ہی کے زمانے سے اردو کے مختلف رسائل میں افسانے چھپنا شروع ہو گئے تھے،شاعر،عصری ادب،آہنگ جیسے رسائل میں اشاعت سے میرا کافی حوصلہ بڑھا اور اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جو ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں ان میں اکثر میں بھی افسانے سنایا کرتا تھا''
>
> (ماہنامہ ماہ نو فروری ۲۰۰۷ء۔صفحہ ۲۳)

ابن کنول کے افسانوں میں عہد حاضر کے پیچیدہ اور گنجلک مسائل کے مضمرات کی عکاسی بیحد نمایاں ہے۔غالباً اسی وجہ سے ان کا ہر افسانہ انسانی زندگی کی مختلف پہلوؤں کی جیتی جاگتی تصویر کا غماز ہے۔کمال امتیاز یہ کہ ان کے افسانے قصہ گوئی اور داستانوی اسلوب سے مزین ہیں۔ایک انٹرویو میں وہ خود کہتے ہیں کہ:

> ''اردو کی سبھی معروف داستانوں کا مطالعہ کیا ہے۔داستانوں کے ذریعہ میں نے کہانی بیان کرنے کا ہنر سیکھا ہے،داستانوں کی طرح کہانی میں کہانی پیدا کر کے میں افسانے کا پلاٹ تیار کرتا ہوں ،اکثر لوگ کہتے ہیں کہ انتظار حسین سے متاثر ہوکر یہ انداز اختیار کیا ہے،ایسا نہیں ہے،میں نے براہ

راست داستانوں کا اثر قبول کیا ہے، داستانوی انداز میں لکھنا متروک نہیں، آج کا لکھنے والا سو فیصد اسی انداز کو نہیں اپنا تا بلکہ معاصرانہ جدت سے ہم آہنگ ہے، اس کے موضوعات اور مسائل آج کے ہیں، اس کی تخلیق عصری تقاضوں سے مالا مال ہے، داستانوی بیانیہ اسلوب میں لکھنا اتنا آسان نہیں ہے، آج کے بہت سے فکشن نگار داستانوی انداز بیان کو اختیار کئے ہوئے ہیں''

(سہ ماہی جمنا تٹ، ہریانہ اردو اکادمی، اپریل ۲۰۰۳ء۔ص ۳۳)

یہاں انتظار حسین کا تذکرہ ابن کنول کے عجز بیان کا مصداق ہے، دراصل پروفیسر ابن کنول کی ادبی زندگی کا پر پیچ واقعہ داستانوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ خاطر نشان رہے کہ ابن کنول داستانوں کے معتبر ناقد و محقق تھے۔ ابن کنول کے افسانوں کا اچھوتا پن اور تکنیک کا راز، اسی مطالعہ داستان میں مضمر ہے۔ افسانوں میں نئی تازگی پیدا ہوگئی ہے ساتھ ہی ساتھ ان کی بے قرارانہ عصری آگہی نے قاری سے درد کا ایک رشتہ بھی قائم کر لیا ہے۔ ابن کنول کے افسانے عصری اضطراب اور انسانی صدمات کے پیچ وخم کے غماز ہیں۔ ان کی مطالعۂ داستان کا ہی اعجاز ہے کہ ان کی کہانیوں میں روز مرّہ کے معمولی یا غیر معمولی حالات و واقعات، پر آشوب سیاسی بدنظمیاں، مکروفریب کی جعل سازیاں، آئے دن تہذیبی وثقافتی حادثات کا بیان، ان کی آپ بیتی جگ بیتی میں تبدیل ہوگئی ہے۔ قاری کی اپنی کہانی بن جاتی ہے۔ اور وہ کہانی کا ایک کردار بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افسانوں میں تمثیلی اسلوب (Allegorical) قاری کی زندگی کا اسلوب بن جاتا ہے۔ بلاشبہ ابن کنول کے افسانوں کا خاصہ بھی یہی ہے کہ ان کی کہانیاں سچ بولتی ہیں، ''بند راستے'' میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں اس عالمِ آب وگل میں ابن آدم کے افعال واعمال کو دیکھ کر جو کچھ محسوس کرتا ہوں قلمبند کر دیتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میرا قاری بھی اس درد اور احساس کے دریا سے گزرے کہ جس سے میں گزر رہا ہوں''

زمانۂ طالب علمی سے ہی افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔ ۱۹۸۰ء تک آتے آتے اردو کو اس کی محبوب متاع گمشدہ یعنی افسانہ واپس کر دیا۔ افسانہ کی یہ واپسی ان کے وسیع مطالعۂ داستان پر دال ہے۔ سچ ہے کہ ہندوستان کی تہذیبی میراث داستانوں کے فسانوں میں کہیں گم تھی جس کی تلاش وجستجو ابن کنول جیسے تخلیق کاروں کی زندگی کا عام وطیرہ بن گیا۔

ابن کنول کا پہلا افسانوی مجموعہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' نویں دہائی میں منظر عام پر آیا۔ ابن کنول نے اپنے اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں داستانوی اسلوب ومحرکات کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنایا ہے جو منفرد و نایاب اندازِ بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے تمام افسانہ نگاروں میں ممتاز نظر آتے ہیں، پروفیسر قمر رئیس ابن کنول کے افسانوں سے بجا طور پر متاثر ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے ابن کنول کے افسانوں کی اس امتیازی جہت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ:

''اردو میں افسانہ کی اس بحالی میں بعض ممتاز ادیبوں کے علاوہ آٹھویں دہائی کے جن نوعمر اور نو

جوان ادیبوں کا نمایاں حصہ رہا ہے ان میں ڈاکٹر ابن کنول کا نام اہمیت رکھتا ہے، انہوں نے اردو کی داستانوں کے تہذیبی کردار پر ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے، اس لئے اردو افسانہ کی روایت کا شعور وہ اپنے ہم سنوں سے کچھ زیادہ ہی رکھتے ہیں۔ انہوں نے متعدد کہانیوں میں تکنیک کے تجربے کئے ہیں ان میں داستانی اثرات کے شناخت آسانی سے کی جاسکتی ہے''

ابن کنول کے افسانوں میں بیسویں صدی کے حالات وکوائف کا ذکر اس انداز میں ملتا ہے جیسے قاری اسی عہد میں موجود ہو اور بعینہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہو۔ ان کے افسانوں میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے عناصر کارفرما ہیں۔ انسان کی داخلی زندگی اور زندگی کے نفسیاتی مظاہر کی سچی عکاسی، ابن کنول کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ اس خصوصیت کی بازیافت کا وسیلہ ان کا داستانوی انداز بیان ہے۔ ان کی کہانیاں موجودہ عہد اور ان مسائل سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ اس میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جیتی جاگتی تصویریں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

پہلا افسانوی مجموعہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' کا پہلا افسانہ ''پہلا آدمی'' جس کا موضوع بغاوت پر مبنی ہے، حاکم وقت کی نافرمانی میں رضائے الٰہی کے جواز متمنی ہے۔ عوامی زندگی کا وہ آخری آدمی لباس زیب تن نہ کرنے کی پاداش میں جرم کا مرتکب قرار پاتا ہے، اس کے بدلے ان کو تخت دار پر چڑھانے کا حکم دیا جاتا ہے لیکن وہ تخت دار پر چڑھنے سے قبل ''مراۃ الغیب'' کے ذریعے حقیقت کو عیاں اور بادشاہ کو راہ راست پر لانے کی سعی کرتا ہے لیکن بادشاہ کی لاابالی پن کی وجہ سے اس کی محنت رائیگاں جاتی ہے اور اس کو تخت دار پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''اس نے مراۃ الغیب کو سب کے روبرو رکھ دیا اور اس آئینہ میں کہ جو حقیقت بیان کرتا تھا، ان سب لباس پہننے والوں کے ننگے اور بدنما جسم نظر آئے اور وہ جو سب کی نظروں میں برہنہ تھا، آئینہ میں لباس زرنگار پہنے ہوئے دکھائی دیا، بادشاہ نے عالم غفلت میں کہا، تو جادوگر ہے .... تو جھوٹا ہے ... فریبی ہے... لے جاؤ اسے قید خانے میں ڈالدو، اسے دار پر کھینچوادو۔'' (صفحہ:۱۵)

اس افسانے کی بنیادی خوبی لباس ہے۔ ایک معمولی چیز اور روزمرہ کے استعمال میں آنے والی شئے، ہر عام وخواص لباس سے آگاہ ہے لیکن افسانہ ''پہلا آدمی'' میں لباس علامت کے پیکر میں ڈھل کر ہمہ گیر اور عالم گیر معنویت کو آشکار کرتا ہے۔

''پہلا آدمی'' کی طرح ''جیت کس کی اور ہار کس کی'' افسانے میں بھی ظالم بادشاہ کی وجہ سے یوسف کی ازدواجی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ اس افسانے میں جنگ سے ہونے والے نتائج کو پیش کیا گیا ہے یعنی جنگ منفی اثرات مرتب کرتی ہے یا مثبت۔ ظاہر ہے کہ منفی، لیکن جنگ کے مضر بلکہ ناقابل بیان صدموں اور خون آشام منظروں کو بیانیہ ساختوں میں ڈھالنا کوئی معمولی بات نہیں جو پروفیسر ابن کنول کے تخلیقی قلم میں عام رنگ ہے۔

افسانہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' دنیا میں اقلیت پر ہونے والے مظالم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس افسانے میں بڑی

طاقتیں اپنے سے کمزور کو کس طرح زیر کرتی ہیں اور ان پر طرح طرح کے مظالم و مصائب کا پہاڑ توڑتی ہیں۔ان بڑی طاقتوں کی زد میں ہندوستان، پاکستان، افغانستان، عراق، فلسطین وغیرہ اہم ممالک ہیں۔جنہوں نے ان کی بالادستی کو قبول نہ کرنے کی صورت میں ان کے مظالم کے شکار ہوئے اور آج بھی کئی اہم ممالک ان سے حراساں ہیں، جس کے نتیجے میں ہلاکت، تباہی ،ہجرت، لامکانی و دیگر مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔''تیسری دنیا کے لوگ'' میں ابن کنول نے انہی مسائل کی زندہ کہانیاں تخلیق کی ہیں نیز ہندوستانی تہذیب وثقافت کو اپنے بیانیے میں، اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قضا اور قدر کے پیچیدہ فلسفیانہ مسائل جو بعض محققین کے نزدیک آج بھی مسئلہ لاینحل کی مثال ہیں۔ابن کنول کے بیانیوں میں زندہ دل کی صورت میں موجود ہیں۔جو قومیں بغیر حرکت وعمل کے صلہ خواہش مند ہیں، تقدیر پر انحصار کرتی ہیں، اور کامیابی نہ ملنے کی صورت میں خودکشی کے رجحان میں مبتلا ہوجاتی ہیں، ان کے لئے ایک نسخۂ کیمیا ہے یہ افسانہ۔غزوہ بدر کی انوکھی مثال، کمزور ترین انسانوں میں امید کی کرن، حوصلہ، ہمت اور جوانمردی پیدا کرنے کی کوشش محیر العقول افسانہ ہے یہ، آپ بھی اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''یہ زمین تم لوگوں کے لئے بنائی گئی لیکن تم نے اسے بانٹ لیا، تم نے اس زمیں پر خونریزی کی، شر پھیلایا، کیا اب بھی تم خدا سے امید کرتے ہو کہ وہ تمہاری مدد کرے گا، اس نے تمہیں زمین پر خودمختار بنایا، پھر وہ کیوں تمہاری مدد کرے،

''اپنے اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ہم خودکشی کر رہے ہیں۔

''لیکن خودکشی کرنا زندگی سے فرار ہے اور زندگی سے فرار کم ہمتی اور بزدلی ہے، کیا تم بزدل ہو؟ پیرو مرشد نے استفسار کیا

''نہیں: لیکن ہم مجبور ہیں''

''مجبوری کم ہمتی کا دوسرا نام ہے، جاؤ اپنا حق مانگو، یہ زمین تم سب کے لئے ہے!

''لیکن ہم تعداد میں کم ہیں اور بے یار و مددگار ہیں''

''تم تین سو تیرہ سے زیادہ ہو، کیا تم تین سو تیرہ کی فتح کے بارے میں نہیں جانتے، وہ سب بھی بے یار و مددگار تھے'' (تیسری دنیا کے لوگ: صفحہ: ۲۲)

عہد عتیق سے لیکر عہد جدید تک ہر انسان اپنے عزیز و اقارب کو ترک کر کے اور وطن عزیز کو خیرباد کہہ کے ذریعۂ معاش کی تگ و دو میں دور دراز علاقوں کا سفر کرتا ہے۔پہلے شام ہونے سے پہلے ہی گھر لوٹ جایا کرتے تھے اور اب حالات بدل چکے ہیں سانجھ ڈھلے گھر واپسی کے بجائے مہینوں اور سالوں میں گھر لوٹتے ہیں، جس سے ان کی ازدواجی زندگی میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔اسی وجہ سے بیوی کا یہ اندیشہ ظاہر کرنا کہ ''شام ہونے سے پہلے لوٹ آنا کہ میرا حال بھی بلقیس کا سا نہ ہو'' اور دادی کا یہ فرمان کہ ''واپسی میں اتنی دیر نہ لگانا کہ یاقوت کی طرح پچھتانا نہ پڑے'' جیسے آئے دن میاں بیوی کے مابین ہونے والے

حالات وواقعات کوابن کنول نے ''شام ہونے سے پہلے'' افسانے میں بیحد موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

اسی طرح ''آخری کوشش' بندراستے، تیسری لاش'' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جس میں آزادی وطن، تقسیم ملک اور فرقہ وارانہ فسادات، جیسے نازک وحساس موضوعات کوابن کنول نے اپنے ان افسانوں کی بنت میں تکنیکی اور فنی چابکدستی کا مظاہرہ پیش کیا ہے۔ان افسانوں کے علاوہ ''چھوٹی آپا، داؤدخان، واپسی، اشرف المخلوقات، دوسرا پاگل، فورتھ کلاس، سراب'' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جس میں زندگی کے تلخ تجربوں کو جادوئی حقیقت نگاری (Magical Realism) کی تکنیکی وسیلے سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔غالباً جادوئی حقیقت نگاری کا یہ طلسم، مطالعۂ داستان کے فیضان کے مرہون منت ہے۔اس جادونگری میں ہندوستانی معاشرے میں مغربی تہذیب کا بڑھتا رجحان اوران سے حد سے بڑھی ہوئی گرویدگی ہر ذمہ دار شہری کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

ابن کنول کا دردمند دل جادوئی شناخت کا قائل ہے۔لہذا ان کی افسانوی بنت میں یہ فیشن زدہ کلچر ایک نوع کے طنز کے ساتھ ماہیئت قلب یعنی تزکیہ (Purgation) سے ہمکنار ہے، جوارسطو کے Catharsis کو مطلوب ہے، ساتھ ہی ساتھ ان افسانوں میں انسانی درد وکسک، جبر وتشدد، احساس کمتری، عدم تحفظ اوران عام زندگی پر ڈھائے جانے والے مظالم کے مناظر قصہ گوئی کی صورت میں پیش ہے کہ قاری بھی اپنے آپ کو اس دردخود کو شامل محسوس کرتا ہے۔اس طرح وہ تمام افسانوی عناصر جو افسانوں کو حیات دوام بخشے، قاری میں تجسس پیدا کرے اوران کے دلوں کو مسخر کرے۔ابن کنول کی افسانہ نگاری کا فنّی طریق کار ہے، اوراسی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس بجا طور پر تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''دوسرے نوجوان ادیبوں کی طرح ابن کنول کا مسئلہ بھی آج کی ۔۔ان کے اپنے عہد کی وہ پیچیدہ زندگی ہے جو کربناک محرومیوں، بے چینیوں، جبر وتشدد اور عدم تحفظ کے آسیبی احساس سے اندر اندر سلگ رہی ہے۔جو بہشت کی آرزو میں تگ ودو کرتی جہنم کے دہانے پر آ کھڑی ہوئی ہے ۔لیکن ابن کنول اس صورت حال سے ہراساں اور مایوس نہیں ہیں'' (تیسری دنیا کے لوگ)

جہاں تک دوسرے افسانوی مجموعہ ''بندراستے'' کا تعلق ہے تو اس میں چھبیس افسانے ہیں۔ ہر افسانہ اپنے آپ میں جداگانہ حیثیت کا مالک ہے۔ان افسانوں میں زیادہ تر ملک کے سیاسی منظر نامہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔یہ افسانے بابری مسجد اور گجرات کا سانحہ فاجعہ اور دور حاضر میں دہشت گردی، مہنگائی، بدعنوانی، عصمت دری جیسے مسائل کی مصوری پیش کرتے ہیں جہاں کوئی ابہام نہیں بلکہ نہایت ہی خوبصورت اور صاف ستھرے انداز میں مسائل پیش ہیں۔ یہ وہ افسانے ہیں جو قاری کے ذہنوں کو بیدار ہی نہیں بلکہ ان میں جوش وولولہ، حرکت وعمل کی تحریک، نئی سوچ کے محرک ہیں۔ پروفیسر عبدالحق اس کتاب کے حوالہ سے ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''وہ اچھے اور معتبر افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں، ''بندراستے'' کے افسانوں میں فن کی

فسوں کار تکنیک اور مثبت فکر کا اوج وعروج کہانی کی روایت میں چراغ رہ گذر کے طور پر تسلیم کیا گیا ۔ان میں فن کے استقبال اور اضافے کی بڑی وسعت پائی گئی .... ان کی کہانیوں میں اقدار کی ارجمندی نے مجھے طمانیت بخشی ہے،ان کے افسانے اس لئے بھی دل کشی رکھتے ہیں کہ وہ قصہ اور کہانی کے لطف خاص سے بھرپور ہیں،کہانی جب قصہ پن سے خالی ہوکر نظریہ سازی یا فلسفہ طرازی کی بات کرتی ہے تو قاری پر تکدر طاری ہوتا ہے ۔ڈاکٹر ابن کنول نے اساطیری اسالیب بیان کی تجدید کو آگے بڑھا کر اپنی پہچان پیش کی ہے۔'' (داستان سے ناول تک۔صفحہ ۷)

اس طرح ہندوستان کے افسانوی منظرنامے پر ابن کنول نے واضح دستخط کئے ہیں اور ان کی یہ دستخط ان کی شناخت کی مصداق ہے۔''بندراستے'' کے کئی افسانوں میں داستانوی اسلوب سے انحراف کرتے ہوئے نئے اسلوب وجدید تکنیک کا استعمال کیا ہے ۔موجودہ سیاسی نظام کی خرابیاں اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے سماجی مسائل اور خانگی الجھنیں اس مجموعے میں شامل افسانوں کی متحرک موضوعی تصویریں ہیں ۔ڈاکٹر فہیم اعظمی ''بندراستے'' کے تبصرہ میں اس کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''''بندراستے'' کے چھبیس افسانوں میں سے زیادہ تر برصغیر ہندو پاکستان کے حالیہ معاشرے کا نہایت ہی صاف ستھرا آئینہ ہیں ۔ان افسانوں کی ساخت میں جن عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے وہ ہیں عقیدتی ،سیاسی ،سماجی اور کسی حد تک نفسیاتی ، جہاں تک سیاسی عوامل کا تعلق ہے ،ان میں حکمرانوں کی منافقت ،عوام کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنے کے ڈپلومیسی ،جمہوریت کا منفی پہلو ،حکمرانوں کے بہروپ ان افسانوں میں دکھائی دیتے ہیں'' (ماہنامہ صریر ،کراچی ،اگست: ۲۰۰۲ء)

''بندراستے'' کا پہلا افسانہ ''ہمارا تمہارا خدا بادشاہ'' یہ افسانہ سیاسی بدحالیوں کے خلاف ایک آواز احتجاج ہے ۔''ایک شب کا فاصلہ'' میں جنگ وجدال کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہونے کی جانب اشارہ ہے تو ساتھ ہی ساتھ یہ افسانہ ہندوستان میں لگی ایمرجنسی کی یاد تازہ کرتا ہے۔''وارث'' ایک بیحد انوکھا افسانہ ہے جس میں حاکم وقت ،ایماندار ،سپہ سالار ،اور انتظامی امور سے واقف کار کے بجائے ایسے جانشیں کا انتخاب کرتا ہے جو شر پسندی کا شاطر ہوتا کہ ملک میں انتشار پھیلا سکے ۔''صرف ایک شب کا فاصلہ'' میں چند اصحاب جو جمہور پسند اقدار کے امین ہیں لیکن جمہوری نظام کی خواہش اور اس کے اظہار کے جرم کی پاداش میں ظلم کے شکار ہوتے ہیں اور کہف میں پناہ لیتے ہیں ،اس افسانے میں قاری ماضی میں حال ومستقبل کا منظر دیکھتا ہے ،سیاسی ملکی نظام خودمختاری اور شہنشاہیت کے جبر واستحصال سے اصحاب کہف کا وجود ہوا اور یہی منظر ہندوستانی سیاسی نظام کی اس ابتری کی جانب اشارہ ہے جس میں جمہوریت کی آڑ میں عوام وخواص کا استحصال کیا جاتا ہے اور انہیں ان

کے بنیادی حقوق تک سے محروم کیا جا تا ہے۔ابن کنول کی کہانیاں ہندوستان کی سیاسی بدنظمیوں اور سماجی بداعمالیوں کا بے باک بیانیہ ہے۔

ابن کنول کی تخلیق ہمارے عہد کے ان تمام حقائق کو پیش کرتی ہیں جسے عالمی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔عصری حسّیت وآگہی کے منظر نامے ان کی ادبی ریاست کی رعیت ہے۔اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں موضوعات کی کمی کا احساس نہیں ہوتا وہ جو کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں اسے افسانوی تخلیق کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں، یہی ان کی سب سے بڑی خو بی ہے۔ان کے موضوعات میں تنوع پایا جا تا ہے لیکن انسان کی شر پسندی جو دراصل قابیل کا ہی ایک روپ ہے اور یہ روپ انسانی معاشرہ کے لئے بیحد خطرناک اور مضر ہے۔عصر رواں کا قابیل ابن کنول کا خاص موضوع ہے،اس موضوع کے تحت وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ:

''ویسے میرے افسانوں میں انسان کی شر پسندی زیادہ نمایاں ہے،آج کا آدمی شر پسند نظر آتا ہے،دنیا میں ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے،آدمی آدمی کا دشمن ہے،آج دنیا میں قابیل کی نسل کی حکومت ہے،قابیل دنیا کا پہلا قاتل ہے،آج ہر جانب ہابیل کا قتل ہو رہا ہے،خدا نے یہ زمین سب کے لئے بنائی لیکن انسان نے اس کو بانٹ لیا ہے اور اس کے لئے ہر جگہ خونریزی ہو رہی ہے۔فسادات ہو رہے ہیں،آدمی کی درندگی میرا خاص موضوع ہے۔''(ماہنامہ ماہ نور،فروری ۲۰۰۷ء:ص ۲۴)

اس اقتباس کے تناظر میں ابن کنول کے افسانوں''پہلا آدمی،خوف،ایک ہی راستہ،لکڑ بگھا زندہ ہے،ابن آدم''وغیرہ کو دیکھیں تو ان میں انسان کی شر پسندی،زیادتیوں کی زندہ مثالیں موجود ہیں جو قاری کو باور کراتی ہیں کہ آج ملک میں دہشت گردی،ظلم وزیادتی،قتل وغارت گری،اور ارباب اقتدار کا گھناؤنا کھیل نیز نفرت وعداوت کی جماعتیں ہر چہار جانب زہر گھو لتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔''ابن آدم'' کا یہ اقتباس دیکھیں:

''اُف یہ بے دردی کے مظاہرے کب تک آنکھیں دیکھتی رہیں گی،کان سنتے رہیں گے۔

جب تک آدمی اس زمین پر موجود ہے''دوسرے نے جواب دیا

''آخر جذبہ انسانیت کہاں ناپید ہو گیا''

''جذبہ انسانیت کبھی تھا ہی نہیں،انسان کوئی مخلوق نہیں،یہ صرف ہمارے ذہنوں کا تشکیل دیا ہوا ایک تخیلی نام ہے،یہاں تو صرف ابن وَدم کی حکومت ہے،ہابیل قتل کیا جا تا رہے گا،قابیل ہمیشہ زندہ رہے گا،کیا تم نے کوئی انسان دیکھا ہے؟'' (ابن آدم:ص ۹۹)

''ایک ہی راستہ''اور''خواب'' بھی انسانی بربریت،دل سوز مناظر،نسوانی چیخ وپکار،عصمت دری کے ہزاروں واقعات

کا عکاس ہے، جیسے کہ یہ مناظر اس عالم آب وگل کا معمول ہے، تخلیق کار کی گرفت میں عہد حاضر کے چھوٹے اور بڑے واقعات تو ہیں ہی بالخصوص گجرات وکشمیر کے سلسلہ وار حادثات تخلیقی ذہن بیقرار ومضطرب کرتی ہے اور ابن کنول کی بے چین روح کا بیانیہ قصہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ابن کنول کی بیقراریوں کا ایک منظر آپ بی ملاحظہ کیجیے:

''اے خدا آگاہ میں اس دنیائے فانی میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ نا قابل برداشت ہے، میرے اندر غصے کی ایک آگ پھیلی ہوئی ہے، غصہ آنا فطری بات ہے لیکن اس دور کے انسان کو برائی دیکھ کر بھی غصہ نہیں آتا،

''ہر چیز کی زیادتی احساس کو مار دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان برائی کو پہچانتے ہوئے بھی بُرا محسوس نہیں کرتا۔تم کیوں پریشان ہوتے ہو،تم بھی بے حس ہوجاؤ۔تمہاری پریشانی دور ہوجائے گی '' یہ مشورہ دیتے وقت بزرگ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا اور کہا ''نہیں.... میں ایسا نہیں کرسکتا، میں برائی ختم کرنا چاہتا ہوں، اے پیرومرشد مجھے ایک ایسی غیبی قوت چاہیئے جس سے میں برائی ختم کردوں، کیا آپ میری مدد کرسکتے ہیں ؟''

''تم کس کس برائی کو ختم کروگے'' (ایک ہی راستہ:ص ۸۵)

''بند راستے'' افسانہ تقسیم ہند اور ہجرت کے حالات وکوائف کے المیاتی مناظر کی دل نواز پیشکش ہے جسے بعض ناقدین نے ابن کنول کی رومانیت سے تعبیر کیا ہے بلاشبہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، اس افسانے میں خالد نامی کردار جب پاکستان سے اپنے آبائی وطن ہندوستان آتا ہے تو یہاں کے دل سوز مناظر دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اور ایک مولوی صاحب سے یہاں کے حالات دریافت کرتا ہے:

''بیٹا وقت کے ہاتھوں سب کچھ لٹ گیا، گاؤں تو پہلے ہی نکل چکے تھے، جو کچھ جائیداد بچی وہ مقدموں کی نذر ہوگئی، تمہارے چچا میاں حویلی نیلام کر کے شہر چلے گئے، بیٹا بڑی بری حالت ہوگئی ہے، جب سے تم لوگ گئے ہو، محلے کے کچھ لوگ میرے آگے بھیک کی طرح کھانا ڈال دیتے ہیں، نہ جانے خدا کب اٹھائے گا، مولوی صاحب نے آنکھوں کی نمی کو رومال سے خشک کیا۔'' (بند راستے:ص ۱۳۸)

ابن کنول کے اسلامی تاریخ سے دلچسپی اور وابستگی نے افسانوی کینوس کو مزید وسعت وعلویت سے ہمکنار کیا ہے۔انہوں نے اپنے بیانیوں ''سویٹ ہوم، آنکھوں کی سوئیاں'' کے ذریعے عہد جدید کے بڑے شہروں میں مکانات کی قلت، دن بدن کرایہ کے مکانوں میں اضافہ اور زمینی جنگ کے تنازع کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، غربت اور متوسط طبقہ کے لئے کوئی مکان نہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ''کنیا دان''، ''مجرم کون''، میں لڑکیوں کی شادی میں آنے والی دشواریوں اور اولاد کی والدین کے تئیں ہمدردی اور ان کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنے کا نام ''کینسر وارڈ'' نامی افسانے کے ذریعے اور ''کچے گھڑے'' میں ایک ایسے المیہ کی جانب اشارہ ہے جو ہندوستان کی تقسیم کے بعد زمینداروں اور تعلقہ داروں

کے عروج سے زوال کے جانب آنا، اور اسی طرح ''ہستک چھیپ'' میں طبقاتی کشمکش، مندر و مسجد کے جھگڑے، بھید بھاؤ کی المناک داستان داستانوی اسلوب میں پیش ہے اور اس میں ہندوستانی معاشرہ کی برائیوں کے جانب بڑی صفائی اور ہنرمندی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ افسانوں کے تجزیوں سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ابن کنول انسانی نفسیات کا درک وشعور رکھتے ہیں، ان کے پاس صرف ایک دردمند اور انسان دوست دل ہی نہیں بلکہ حقیقت کو پہچاننے والی نظر اور بیان کرنے والا قلم بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے ذریعئے زندگی کے حقائق کو پیش کرتے ہیں جس سے ان کی کہانیوں میں کئی کہانیاں جنم لیتی ہیں لیکن یہ ضمنی کہانیاں اپنے اصل قصے سے مربوط ہوتی ہیں، گھریلو حالات زندگی، ہند اسلامی تہذیب سے بے التفاتی اور مغربی تہذیب وتمدن سے دل آویزی، عورتوں کے مسائل، دہشت گردی، بے روزگاری، انسانی رشتوں کی پامالی اور ان کے مابین تفرقہ بازی، نفرتوں کی بوچھار، قتل وغارت گری اور فطرت انسانی کا داخلی ہیجان ان سب موضوعات کا ابن کنول نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، ان کے افسانوں میں بصیرت ہے اور ایک واضح وزن ہے، یہ وزن داستان گوئی کے راستے میں اسلامی تہذیب و تاریخ کی شمولیت ہے جو ان کی قصہ گوئی کا حصہ ہے، اس کے ذریعے انہوں نے پند ونصائح کا راستہ بھی نکالا، جس طرح اہم ناول نگاروں جیسے ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، علامہ راشدالخیری اور پریم چند وغیرہ نے اپنی قصہ گوئی کے ذریعۂ اصلاح وتزکیہ کی راہ نکالی اسی طرح ابن کنول نے بھی اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرے میں اصلاح وتزکیہ کی راہ دریافت کی، اسلامی تعلیمات کا عمرانی وتہذیبی مطالعہ جو عدل اجتماعی، مساوات باہمی اور آزادئ کل کا حامی ہے، ابن کنول کے رگ وپے میں پیوست ہے۔ معاشی، تہذیبی، سیاسی ہر سطح پر پاکوصاف اور بے لاگ فراست کا مظاہرہ، اشتراکی ذہنوں کی بھی ایک شناخت تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ اس تنقیدی کشاکش نے ابن کنول کو ہر انصاف پسند معاشرہ کا رکنِ خاص ہونے کا امتیاز و شرف بخشا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کا خیال متذکرہ بالا اصول زندگی کا ترجمان ہے، موصوف کی بیش قیمت آرا پر اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا، پروفیسر وہاب اشرفی فرماتے ہیں:

> ''ابن کنول اشتراکی ذہن رکھتے ہیں، ترقی پسندی کل بھی ان کی جولان گاہ تھی اور آج بھی ہے۔ شعر ہو یا افسانہ یا مضمون ان کی تحریروں میں عالمی صورت واقعہ کی پرچھائی ملتی ہے، وہ مقامی مسائل اور احوال کی بھی وسیع تناظر میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں، استحصال کے طور اور انداز کی انہیں خبر ہے، نتیجے میں وہ ایسی ہی نگارشات پیش کرتے ہیں جن میں آج صورتیں نمایاں ہیں..... اس امر سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ معاملات کو وسیع تناظر میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔'' (تاریخ ادب اردو، جلد سوم: ص ۱۳۷۳)

☆☆☆

DR. MD ARSHAD NADVI
ASSISTANT PROFESSOR (AD-HOC),DEPARTMENT OF URDU
DYAL SINGH COLLEGE (M)(UNIVERSITY OF DELHI)
LODHI ROAD, NEW DELHI-03
MOB:9213307499
Mail. arshaddu786@gmail.com

ابن کنول کی افسانہ نگاری

(خانہ بدوش کے حوالے سے)

ڈاکٹر عمران احمد

لکچرر، ڈسٹرکٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ

ضلع شراوستی، اتر پردیش۔

دور حاضر کے اہم افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ابن کنول کا ہے جنھوں نے اپنے علمی و ادبی کاوشوں کے ذریعہ نہ صرف اپنے نام کو زندہ رکھا بلکہ وہ اپنے معاصرین میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ابن کنول کا اصل نام ناصر محمود کمال تھا۔ آپ کی پیدائش 15 اکتوبر 1957ء ضلع مرادآباد میں ہوئی۔والد محترم کا نام قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوں تھا۔ابن کنول کی ابتدائی تعلیم کا آغاز 1962ء میں بدایوں کے ایک اردو میڈیم اسلامیہ اسکول سے ہوئی۔ 1978ء میں ایم۔اے۔اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔1979ء میں دہلی یونیورسٹی سے ایم۔فل۔اور 1984ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔آپ کا تحقیقی موضوع ''بوستان خیال کا تہذیبی اور لسانی مطالعہ'' اور تحقیقی نگراں ڈاکٹر تنویر احمد علوی تھے۔ابن کنول نے 1987ء میں اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات کی۔آپ کی شریک حیات کا نام صبیح ساغر ہے، جن سے چار بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔1990ء میں لکچرر کی حیثیت سے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے۔1998ء میں آپ ریڈر کے طور پر مقرر ہوئے۔2005ء میں شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے عہد سنبھالا۔جنوری 2006ء میں بحیثیت پروفیسر کے طور پر تقرر عمل میں آیا۔ابن کنول بیک وقت ایک محقق، نقاد اور افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔انھوں نے اپنے ادبی دور میں متعدد کتابیں تحریر کی ہیں جن میں ان کی تحقیقی وتنقیدی اور افسانوی مجموعے شامل ہیں۔'تیسری دنیا کے لوگ'، 'بند راستے'، 'پچاس افسانے' اور افسانوی مجموعہ 'خانہ بدوش' اہم ہیں۔ابن کنول کو ان کے ادبی خدمات کے لئے کئی سرکاری انجمنوں نے انعامات سے نوازا ہے۔11 فروری 2023ء کو عہد حاضر کا ایک اہم افسانہ نگار اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

ابن کنول کا افسانوی مجموعہ 'خانہ بدوش' جس کی اشاعت 2014ء میں ہوئی۔اس مجموعے میں کل 23 افسانے شامل ہیں۔مجموعہ کے بیشتر افسانے فرقہ وارانہ فسادات، سیاست، شہری زندگی کے مسائل، ہندستانی مسلمان، جاگیردارانہ ماحول اور دیہی زندگی کے مسائل کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہیں۔پہلا افسانہ 'تیسری لاش' ہے جو فرقہ وارانہ فسادات کی عکاسی کرتا ہے۔افسانہ نگار نے اپنے اردگرد کے مسائل، زمانے کے واقعات وحادثات کو اپنے تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔وہ جو کچھ دیکھتا، سوچتا اور سمجھتا ہے اسے غور وفکر کرنے کے بعد اپنے مشاہدات وتجربات کو الفاظ میں پیرو کر پیش کر دیتا ہے۔ہندستان میں ہندو

مسلم اور دوسرے مذاہب کے لوگ صدیوں سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کی مثالیں پیش کی جاتی تھی۔لوگ اپنے مفادات کے لئے اب اس پیار ومحبت کوختم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کوطول دے کر فرقہ وارانہ فسادات کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر فساد میں انسان پر حیوان غالب نظر آتا ہے۔کسی بھی فرقہ وارانہ فسادات میں سب سے زیادہ عورتیں اور معصوم بچے خوں میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔

اقتباس ملاحظہ ہو۔۔

''پتا جی---- پتا جی----- ہم---- برقعہ میں چھپ کر جا------ لیکن----- لیکن کسی
ظالم نے----- ہمیں زخمی کر دیا۔آپ------ آپ کہیں چھپ جایئے ----- ورنہ
-----ورنہ---- ''(خانہ بدوش،ص20)

درج بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح انسان حیوان بن کر معاشرے کے تانے بانے کوخراب کر کے خوف ہراس کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔لوگ بدلے کی آگ میں اپنوکو ہی جینے کا حق چھین لیتے ہیں۔سیاسی جماعتیں اپنے ووٹ کے حصول کے لئے نفرتی بیان بیازی کرتے ہیں جس سے اس طرح کے لوگوں کو شہ ملتا ہے۔موجودہ دور میں اس طرح کے واردات میں اضافہ دیکھنے کوملا ہے۔

عہد حاضر کے افسانہ نگاروں میں ابن کنول کا نام نمایاں طور پر لیا جا سکتا ہے جن کے افسانوں میں ملک ومعاشرے میں پھیلی بدامنی جیسے مسائل سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔افسانہ''آخری کوشش''،''خانہ بدوش''اور''نیا درندہ''جوتقسیم ملک اور فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی ہے۔دونوں جب ملتے تو اس طرح بغلگیر ہوتے جیسے برسوں کے بچھڑے بھائی مل رہے ہیں۔عید کی سوئیاں مل کر کھاتے اور ہولی کے رنگوں میں دونوں اپنے کپڑے اس طرح رنگ لیتے کہ دونوں کو امتیاز کر پانا دشوار ہو جاتا تھا کہ کون ہندو اور کون مسلم۔تقسیم ملک کی آگ جب لگی تو بڑے بڑے ہندو خاندان اپنی کوٹھیوں کو چھوڑ کر ہندستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے تو دوسری طرف ہندستان کے مسلمان اپنے گھروں کو چھوڑ کر پاکستان جا رہے تھے۔لوٹ مار قتل غارت گری کا بول بالا تھا۔لوگ ایک دوسرے سے ڈرتے تھے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔۔

''سالے بھاگ گئے؟''
''ابے یار اس کے ہاں دو لونڈیئے بھی تو تھی''
''جائیں گے کہاں بھاگ کر''(خانہ بدوش،ص32

اس اقتباس سے یہ پتا چلتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں لڑکیوں اور عورتوں کے آنچل کو اڑائے جاتے ہیں۔ ہر فسادات میں کچھ اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جو صرف لوٹ مار کے ساتھ ساتھ لڑکیوں سے بدسلوکی کرتے نظر آتے ہیں۔تقسیم ملک کے وقت اس طرح کے واقعات دونوں جانب دیکھنے کو ملتی ہے۔ایسے واقعات ملک کے مختلف علاقوں اور خاص کر گجرات

فسادات میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

جس طرح انسان کی سوچ وفکر الگ الگ ہوتی ہے اسی طرح اس کے موضوعات بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔اسی طرح ابن کنول نے بھی دوسرے افسانہ نگاروں سے ہٹ کر اپنے لئے ایک الگ نئی راہ چنی اور گاؤں سے شہر آنے والے لوگوں کے حالات کی عکاسی کی ہے۔افسانہ ''فورتھ کلاس''، ''سراب'' جس میں انھوں نے شہری اور قصباتی زندگی کی عکاسی کی ہے۔گاؤں قصبوں میں آمدنی نہ ہونے کی وجہ لوگ شہروں کی طرف رخ کرتے ہیں۔آج بھی گاؤں اور قصبوں سے ایک بڑی تعداد شہروں میں جا کر روزی روٹی کے لئے پیسہ کماتے ہیں۔شہروں کی بڑی بڑی عمارتوں کی چمک دمک میں ان کا خون پسینہ نظر آتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''تم ناہیں جانت ایں بڑا ہوٹل ہمر سے ہاتھوں سے بنو ہے۔ہم نے رات دن کھون پسینہ ایک کیئو ہے تب یہ آسمان تک پہنچو ہے۔اب ہم اسے دیکھت ہیں اور کھوس ہوت ہیں کہ ہمرے ہاتھوں نے کتنا بڑا کام کیو ہے۔'' (خانہ بدوش،ص74)

مذکورہ اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ گاؤں قصبوں سے ایک بڑی تعداد شہروں میں رہ کر مختلف کام کرتے ہیں۔شہروں کی صاف صفائی، بڑی بڑی عمارتوں کو کھڑا کرنے اور اسے عوامی توجہ کا مرکز بنانے میں خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں۔شہروں میں یہ لوگ بہت سی مصیبتوں کا سامنا صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ان کا گھر پریوار آرام سے زندگی گزار سکے۔

ابن کنول کی افسانہ نگاری کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عصری زندگی کے مسائل اور حقائق کو اپنے افسانوں میں منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔افسانہ ''اجتہاد'' میں ابن کنول نے موجودہ دور کی منظر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔عہد حاضر میں ٹی وی، شوسل میڈیا، پرنٹ میڈیا کے ذریعہ مسلمانوں کی غلط شبیہ پیش کر کے نفرت پھیلا کر گنگا جمنی تہذیب کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔مسلمانوں کے تہذیب وتمدن، کاروبار، رہن سہن، شادی بیاہ، لباس اور کھانے پینے کی چیزوں کو لے کر کبھی مذہبی تنظیمیں، کبھی سیاسی جماعتیں نقصان پہنچانے کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔انسان کی سرپسندی اور حکمرانوں کی منافقت عوام کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنے کی ڈپلومیسی، جمہوریت کی منفی پہلو اس افسانے میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔۔

> ''ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے پر شور مچایا جا رہا ہے۔۔۔کثیر الاولاد ہونے پر بدنام کیا جا رہا ہے۔میں کہتا ہوں سروے کرا کے دیکھئے اس شہر میں کتنے لاکھ مسلمان رہتے ہیں۔۔کیا آپ کسی کو جانتے ہیں جس کی چار بیویاں ہیں۔۔۔چار تو دور کی بات، دو نہیں ملیں گی۔۔۔اور گاؤں دیہات میں جا کر دیکھئے، غیر مسلموں کے کتنے بچے ہیں۔۔یہ صرف مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ ہے۔'' (خانہ بدوش،ص160)

مذکورہ اقتباس کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کو بدنام کرنے کی طرح طرح کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ملک کے ادارے اور سیاسی جماعتیں بھی حقیقت سے واقف ہیں لیکن ملک میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو حقیقت سے نہ واقف بھی ہیں۔ وہ حقیقت کو سمجھنے یا جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے بلکہ سر پسندوں کی باتوں کو حقیقت تسلیم کرتے ہوئے مسلمانوں کو بدنام کرتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ چل رہا ہے۔ ابن کنول کے اس افسانے میں موجودہ عہد اور انسانی زندگی کے مسائل کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ابن کنول کے افسانوں کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی کہ انھوں نے مغربی تہذیب کی تفرقہ بازی، نفرت، قتل غارت گری جیسے موضوعات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ افسانہ ''مٹی کی گڑیا'' جس میں عالمی سطح پر ہونے والے ظلم وستم کے شکار مظلوم مسلمانوں کی منظر کشی کی ہے۔ پوری دنیا میں دہشت گردی کے نام پر کئی ملکوں کو جنگ میں جھونک دیا گیا جس میں لاکھوں مسلمانوں کو موت کی نیند سلا دی گئی اور لاکھوں کو اپنا گھر بار چھوڑ کر پناہ گزیں کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔ برصغیر سے لے کر خلیجی ملکوں اور افریکن دیش کو تار تار کیا جا چکا ہے۔ فلسطین پر کئی دیہایوں سے ظلم وستم کئے جارہیں۔ ارض مقدس کو روز بے حرمتی کر کے بے قصور بچوں اور عورتوں کو مارا جارہا ہے، اور لاکھوں کی تعداد میں جیلوں میں بند ہیں، جس عالم انسان اپنی آنکھیں بند کیئے ہوئے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔۔

> ''جب کوئی خود حملہ ہوتا ہے تو ہمارے بھائی مارے جاتے ہیں اور جب فوج کی گولیاں چلتی ہیں، تو ہمارے بھائی مارے جاتے ہیں۔ نقصان تو ہر حال میں ہمارا ہے۔ خدا جانے کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ تعاون اور عدم تعاون دونوں ہی حالات میں موت کا سامنا ہے۔ یہی حال رہا تو بھاکے مرجائیں گے۔(خانہ بدوش، ص 141)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے عالمی سطح پر جتنے بھی خودکش حملے ہوئے ہیں وہ سب مسلم ملکوں میں ہوئے ہیں جس میں بیشتر مسلمانوں نے اپنی بیش قیمتی جانوں کا نظرانہ پیش کیا ہے۔ پاکستان، افغانستان، شام، عراق، لیبیا اور ارض فلسطین جیسے ملکوں میں لاکھوں مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا ہے۔ مغربی طاقتوں کے ذریعہ یہ سلسلہ بدستور اب بھی جاری ہے۔

ابن کنول کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے موجودہ عہد اور انسانی مسائل کے جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ انھوں نے گھریلوں حالات وواقعات، ہندستانی تہذیب اور مغربی تہذیب کی تفرقہ بازی، نفرت، قتل وغارت گری پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ'' گھر جلا کر'' اور'' خدشہ'' ملک میں نفرتی سیاست پر مبنی ہے۔ غریب کی جھگی جھوپڑیوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ سیاسی لوگ عوام کی زمینوں پر قابض ہونے کی طرح طرح کوششیں کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔۔

> ''یہ سب زمین خالی کرانے کا چکر ہے۔ یہ امین سیٹھ دولت رام کی ہے۔ سنا ہے اس نے کسی بلڈر کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔''

''میں نے تو سنا ہے کہ اس میں کوئی راجنیتک چال ہے۔الیکشن ہونے والا ہے۔''

'' آگ لگا کر مدد کر کے ہر پارٹی ہمدردی اور ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔''(خانہ بدوش،ص105)

مذکورہ اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عہد حاضر میں بڑے بڑے کارپوریٹ گھرانوں سے ہی سیاسی پارٹیاں چلتی ہیں۔وہی پارٹیاں برسرے اقتدارم میں آنے کے بعدان کوفائدہ پہچانے کا کام کرتی ہیں۔اپنے سیاسی فائدے کے لئے پہلے لوگوں کولڑانے اوران کی جھگی جھوپڑیوں کوجلا کران کی مدد کرکے ووٹ بیک کی سیاست ہورہی ہے۔ملک کی گنگا جمنی تہذیب کوتار تار کیا جارہا ہے۔جوکبھی ایک دوسرے کے تہواروں اورسکھ دکھ میں ساتھ ساتھ رہتے تھے ایک دوسرے کے مذاہب کا احترام کرتے تھے،لیکن گزرتے وقت کے ساتھ وہ پیارومحبت اب نفرت میں تبدیل ہورہی ہے جولمحہ فکر ہے۔

ابن کنول کی افسانہ نگاری کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے معاشرے میں پائے جانے والی برائیوں کو موضوع بنایا ہے۔افسانہ نگار نے اپنے اردگرد کے ماحول پرنظرڈالتے ہیں تو ہر جگہ خاص کرمسلم محلوں میں جس برائی کومحسوس کیا ہے انہی کوافسانہ''اشراف المخلوقات'' کے ذریعہ بتانے کی کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے گھریلوں حالات،لڑائی جھگڑا،مار پیٹ،شراب،جوا تاش،وغیرہ پرروشنی ڈالی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔۔

''ابے ناولٹی والی فلم دیکھ-----انگریجی پھلم ہے----مزہ آجائے گا''

''آجکل جمّن کے یاں کے ٹھّرے میں نشہ نہیں آرہا ہے۔''

''سالا پانی بہت ملاتا ہے۔''(خانہ بدوش،ص65)

مذکورہ اقتباس کے ذریعہ سے افسانہ نگار نے معاشرتی برائیوں پرروشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔موجودہ عہد میں مسلم معاشرے میں تعلیم سے دوری تشویش کا باعث ہے۔لاعلمی اور بے روزگاری کی وجہ سے بہت سے نوجوان مختلف بری عادتوں میں ملوث ہیں۔شراب ،جوا ،تاش کھیلنا، گانجا پینا، دن بھر محلوں کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر بے وجہ بحث ومباحث کرنا،فلمیں دیکھنا،اور یہ سب کرنے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے جس کی بنا پر چوری جیسی بری عادتوں میں ملوث ہوتے ہیں۔

ابن کنول نے اپنے افسانوں کے ذریعہ اسلامی روایات کومتعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔اس کے لئے انھوں نے کبھی ماضی کا توکبھی حال کا سہارا لیا ہے۔بیشتر افسانے میں اسلامی روایت اوراس کی تاریخ سے استعفادہ کرتے ہوئے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں انھوں نے افسانہ'' کی مرے قتل کے بعد'' میں بدلتے گھریلوں حالات،رہن سہن،اسلامی تہذیب وتمدن پرگفتگو کی ہے۔ایک وقت تھا جب مسلم معاشرے میں اسلامی تعلیمات پرزوردیا جاتا تھا،معاشرے کے لوگ اپنی تہذیب کے دھاگے میں بندھے نظر آتے تھے۔ایک دوسرے کوعزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔چھوٹے بڑوں کی عزت کرتے تھے۔شریعت کے مطابق زندگی گزارنے پرزور دیا جاتا تھا۔مگر بدلتے وقت اور مغربی تہذیب نے معاشرے کے نوجوانوں کواسلامی تعلیمات سے دور کردیا ہے۔آج کل نوجوان کھانے پینے،کپڑے،اوررہن سہن کومغرب کی طرززندگی گزارنے کواپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو۔۔

''اے میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ لڑکیوں کو برقع پہناؤ۔لیکن میری کون سنتا ہے۔لڑکیاں ہیں کہ اُڑنکا۔سر کھولے، بال بکھرے، پینٹیں پہنے،لڑکوں کی طرح بازاروں میں گھومتی پھرتی ہیں۔نہ جانے کا وقت پتہ، نہ آنے کا''

''ابا کو تو بس کمانے کی لت لگی ہے، اولاد کیا گل کھلا رہی ہے کچھ پتہ نہیں۔ ہمارے زمانے میں تو لڑکیوں کو زور سے بولنے بھی نہیں دیا جاتا تھا کہ غیر مرد آواز سنے گے۔''

(خانہ بدوش،ص135)

درج بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ہم اپنی جڑوں سے دور ہوتے جارہے ہیں۔عہد حاضر میں ہم ترقی کے نام پر مغربی تہذیب کو اپنا رہے ہیں۔ہم اسلامی تعلیمات اور شرعت سے کوسوں دور ہو رہے ہیں۔آج ہمارے معاشرے کے لڑکے اور لڑکیاں مختلف برائی اور بے حیائی میں ملوث ہیں۔ بے پردگی کا بول بالا ہے۔معاشرے اور خاندان کی عزتیں داغدار ہو رہی ہیں۔آج بھی معاشرے میں ایسی کتنی لڑکیاں ہیں جو جہیز اور دوسرے وجوہات کی وجہ سے شادی کے بغیر گھر بیٹھی ہیں۔اس کے علاوہ ابن کنول کی افسانوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جاگیردارانہ نظام، مڈل کلاس اور نچلے طبقے کے مسائل پر بھی گفتگو کی ہے۔افسانہ'' واپسی'' انھوں نے زمینداری اور ان کے یہاں کر رہے مزدوروں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ہمارے معاشرے میں پہلے بڑے بڑے زمیندار ہوتے تھے جو اپنے یہاں مزدوروں کو غلام کی طرح رکھتے تھے۔ان سے سالوں سال دن رات کام لیا جاتا تھا، بدلے میں انہیں مختصر کھانے پینے کی چیزیں دی جاتی تھی۔ان لوگوں کی پوری عمر اپنے مالکوں کے یہاں کام کرتے کرتے ختم ہوجاتی تھی۔

دور جدید کے افسانہ نگاروں کے یہاں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔اس دور کے افسانہ نگاروں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کہانیاں پیش کی ہیں۔ابن کنول نے اپنے اردگرد جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا انہیں موضوع بنا کر پیش کر دیا۔انھوں نے معاشرتی تبدیلی، مٹتی تہذیب، اخلاقی قدروں کا فقدان، فرقہ وارانہ فسادات، دیہاتی زندگی، مڈل کلاس اور نچلے طبقے کے مسائل سے روشناس کرایا ہے۔ان کے افسانے ادب عالیہ کی یاد دلاتے ہیں جن میں داستان، حکایت اور قصّے کے اثرات موجود ہیں۔یہ وہ تمام موضوعات ہیں جو ابن کنول کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ابن کنول نے اپنے افسانوں میں سادہ، سلیس اور عام فہم زبان کے ساتھ ساتھ حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔انھوں نے شمالی ہند میں بولی جانے والی زبان اور بولیوں کا استعمال کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ افسانے کے مطالعہ کے وقت قاری کو آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔ابن کنول کا انداز بیان دلچسپ اور دل میں اثر کرنے والا ہے۔ان کی کہانیاں مختصر ہوتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے جملوں کا استعمال ابن کنول کی افسانوی خصوصیات میں نمایاں اور اہم ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں البتہ بیشتر افسانوں میں اقلیتی کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابن کنول اپنے عہد کے افسانہ نگاروں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے افسانے ادبی دنیا میں نمایاں خصوصیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔اس لئے اس عہد کے افسانہ نگاروں کا جب ذکر ہوگا، ابن کنول کا نام نمایاں طور پر شمار کیا جائے گا۔

****

افسانہ ''پہلا آدمی'' ایک تجزیہ

عبید الرحمن نصیر
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی (۱۱۰۰۰۷)
Email:-Abaid9001@gmail.com
Mob:-7889634099

پروفیسر ابن کنول اردو ادب کی بیشتر اصناف مثلاً خاکہ نگاری، سفرنامہ نگاری، انشائیہ نگاری اردو شاعری اور تحقیق وتنقید کے ساتھ ساتھ اردو افسانہ نگاری میں بلند پایہ مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنی چھیاسٹھ سالہ زندگی میں ابتدائی حصول تعلیم کے بعد جامعیات کا رخ کیا جہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انیس سو پچاسی سے دہلی یونیورسٹی میں بطور مدرس اپنے فرائض انجام دینے لگے۔جامعہ دہلی میں ہی سال ۲۰۰۶ء میں وہ پروفیسر بنے اور ۲۰۲۱ء میں سینئر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔اس دوران وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں تین مرتبہ صدر شعبہ بھی رہے۔ پروفیسر ابن کنول نے ۳۱ اکتوبر ۲۰۲۲ء کو دہلی یونیورسٹی میں اپنی ملازمت کے ایام مکمل کیے اور ۱۱ فروری ۲۰۲۳ء بروز ہفتہ دن کے تقریباً ڈھائی بجے اس دار فانی کو الوداع کہا اور تیسری دنیا کے مسافر ہو گئے۔ پروفیسر ابن کنول کی اچانک موت سے ان کے اہل خانہ پر کیا گزری اس کا اندازہ لگانا تو ناممکن ہے البتہ ان کے متعلقین، ساتھیوں اور طالب علموں کو میں نے کئی دنوں تک عالم یاس اور سکتے کی حالت میں دیکھا۔بہرحال موت تو ہر ذی روح کو آنی ہے اور ہر فرد گزرتے ایام کے ساتھ اپنی موت کے قریب تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ پروفیسر ابن کنول کی وفات کے بعد ۱۴ فروری ۲۰۲۳ء بروز منگل شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جہاں صدر شعبہ اردو پروفیسر نجمہ رحمانی کے ہمراہ شعبہ اور دیگر شعبہ جات کے اساتذہ کے علاوہ غیر تدریسی عملہ اور طلباء سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے۔ ہر آنکھ پرنم تھی اور ہر دل اشکبار۔تعزیت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اساتذہ اور مرحوم پروفیسر ابن کنول کی زیر نگرانی تحقیق کرنے والے ایک اسکالر کو اپنے تاثرات پیش کرنے کا موقع دیا گیا لیکن موت کے غم سے سب نڈھال تھے اور ان تمام کی حالت ناقابل دید تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا سب کے کلیجے پھٹے جاتے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول کی یاد میں ملک کی کئی جامعیات اور دیگر ادبی اداروں نے تعزیتی پروگرام منعقد کرائے جہاں ان کی حیات اور ادبی خدمات کو یاد کرتے ہوئے انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پروفیسر ابن کنول ہم سب کو داغ مفارقت دے کر خالق حقیقی سے جا ملے لیکن انہوں نے ہم سب کے لیے وہ ادبی سرمایہ چھوڑا ہے جو ہمارے ذہنوں کو ہمیشہ تازگی بخشے گا اور انھیں اردو ادب میں زندہ وتابندہ رکھے گا۔

پروفیسر ابن کنول نے اردو نثر میں وسیع ذخیرہ چھوڑا ہے۔ان کی حیات اور ادبی خدمات کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ دنوں میں بھی لکھا جاتا رہے گا۔اردو نثر کی تقریباً تمام اصناف پر انہوں نے طبع آزمائی کی اور خود کو ایک بہترین افسانہ نگار کے طور پر متعارف کرایا۔دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ۱۹۷۹ء میں ایم فل کے دوران ہی انہوں نے افسانہ نگاری میں طبع آزمائی شروع کر دی تھی اور ۱۹۸۴ء میں پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'تیسری دنیا کے لوگ' بھی شائع

ہوا جس کا انتساب انہوں نے اپنی امی اور والد محترم کنول ڈبائیوی کے نام کیا۔اس افسانوی مجموعے میں پروفیسر ابن کنول کے پندرہ افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں میں موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے اور سماج میں پنپنے والی ہر برائی کا تذکرہ ملتا ہے۔انہوں نے بڑی بے باکی سے ذات پات،طبقاتی کشمکش اور فرقہ پرستی کے خلاف آواز بلند کی۔افسانوی مجموعہ 'تیسری دنیا کے لوگ' کے حرف آغاز میں ابن کنول لکھتے ہیں۔

''ایک طرف اگر نئی ضروریات کا ہجوم خوفناک اژدہوں کی طرح منہ کھولے زبانیں لپلپا رہا ہے اور خوف زدہ آدمی سمٹتے سمٹتے اپنے وجود کو کھو رہا ہے،تو دوسری جانب ذات پات طبقات اور فرقہ مذہب کی چمکتی ہوئی قبائیں زیب جسم کیے بھیڑیے اپنے جبڑوں سے ٹپکتا لہو چاٹ رہے ہیں۔۔۔۔جو تخلیق کار اس بھیانک منظر کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں،کیا وہ اس سے بھی زیادہ بھیانک جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔''؟ا؎

پروفیسر ابن کنول اردو افسانہ نگاری میں منفرد لب و لہجے کے مالک تھے اور ان کے افسانوں پر داستانوی رنگ کے گہرے اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں داستانوی کرداروں کو پیش کیا ہے اور وحدت تاثر کی ایک ایسی فضا قائم کی ہے جس سے قاری کا ذہن کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا اور وہ کہانی مکمل پڑھے بنا نہیں رہ پاتا۔پروفیسر ابن کنول کو قدرت نے بچپن سے ہی تخلیقیت کے ہنر سے نوازا تھا اور وقت کے ساتھ حاصل کی گئی تعلیم اور روزمرہ حالات و مشاہدات نے ان کے اس ہنر کو مزید نکھارا۔وہ اپنے افسانوں کی بالکل شروعاتی سطور میں ہی قاری پر وحدت تاثر کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔اپنے پہلے افسانوی مجموعہ کے پہلے افسانہ 'پہلا آدمی' کی شروعات وہ اس طرح کرتے ہیں۔

''اور جب بادشاہ نے سفر سے مراجعت کی۔دارالخلافہ میں پہنچ کر اس نے اپنے وزیر اعظم کو حکم دیا کہ کل دن کے پہلے پہر میں ہم دربار عام کریں گے، شہر میں اعلان کرا دیا جائے۔تمام خلائق شہر دیوان عام میں جمع ہوں،،حکم شاہی برفتار برق شہر کے ایک ایک گوشے میں پھیلا دیا گیا۔روز فردہ تمام مرد و زن، پیر و جوان،خرد و کلاں اس طرح اپنے چہروں پر بے تابیاں لیے دیوان عام میں اکٹھے ہوئے جیسے غیب سے کوئی معجزہ ظہور میں آنے والا ہو۔ہر نظر میں ایک ہی سوال تھا کہ آج بادشاہ ایسا کیا اعلان کرے گا جس کے لئے زچہ و بچہ کو بھی دربار میں حاضر ہونے کا حکم ہوا ہے۔وزیر اعظم نے جو تخت شاہی کے قریب استادہ تھا،ایک گہری نظر اس مجمع پر ڈالی اور با آواز بلند پوچھا۔،کیا ابھی کوئی اور باقی ہے جو دربار میں حاضر نہیں ہوا۔''۲؎

اس افسانے میں پروفیسر ابن کنول نے مراۃ الغیب کے ذریعے ان لوگوں کو حقیقت سے آشنا کیا ہے جو اپنی صدیوں سے چلی آ رہی روایات اور آداب و اقدار کو بھول کر غیروں کی تقلید میں مگن ہو جاتے ہیں،ان کے ہی طریقہ کار اپنا لیتے ہیں اور جو اس بھیڑ

کے ساتھ نہیں چلتا اسے حقیر، کمتر اور دقیانوس قسم کا آدمی سمجھا جاتا ہے۔ اپنی تہذیب وتمدن اور روایات کا پاسدار انسان سودیشی اور بائیکاٹ تحریک کا حامی ہوتا ہے۔ اسے غیروں کی تقلید سے کوفت محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے ملک وسماج کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک کردار، پہلا آدمی، میں ہے جسے بادشاہ نے 'شاہ بہروپ' کے دیے ہوئے تحفے میں سے اس کے جسم کی پیائش کے مطابق لباس پہننے کے لئے دیا۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس شخص نے لباس زیب تن کیا لیکن اس کے شعور نے اس غیر ملکی لبادے کو قبول
نہ کیا اور اسے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ ابن کنول نے افسانے میں اس منظر کو یوں بیان کیا ہے۔

''اس نے بھی اس پوشاک کو اپنے جسم پر پہنا۔ تھوڑی دیر تک وہ ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے لباس کے سنہری تاروں کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔ لیکن اچانک اسے محسوس ہوا جیسے وہ لباس تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس کا بدن پھول رہا ہے۔ وہ گھبرایا۔ لیکن لباس لمحہ بہ لمحہ سکڑتا گیا اور آہستہ آہستہ گناہ گار کی قبر کی طرح تنگ ہو گیا۔ اسے لگا جیسے چند لمحوں کے بعد اس کی دونوں جانب کی پسلیاں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح آپس میں بھینچ جائیں گی۔ اور اسی خوف کے سبب اس نے اپنے بدن پر چڑھے ہوئے لباس کو ہاتھوں سے نوچنا شروع کر دیا۔'' ۳؎

افسانہ، پہلا آدمی، میں متذکرہ آدمی کی بہروپ لبادے میں ہوئی حالت وکیفیت کا تذکرہ کرنے کے بعد ان لوگوں کا احوال سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جو اندھی تقلید کے قائل ہیں اور اپنی تہذیب وتمدن سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ قومی اقدار کا پاسباں آدمی جب اپنے بدن پر چڑھے بہروپ کپڑے کو نوچتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ ملک کے ماندہ افراد نے بھی اس کی طرح غیروں کے کپڑے کو جسم سے اتار پھینکا ہوگا لیکن معاملہ دیدا اس سے بالکل مختلف تھا جس کا تذکرہ افسانے میں کچھ اس طرح کیا گیا ہے۔

''وہ شہر کی سڑک پر آیا لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہر شخص اس اجنبی لباس کو پہن کر فخر محسوس کر رہا تھا اور جب لوگوں کی نگاہیں اس کے برہنہ جسم پر پڑیں تو سب ہنسنے لگے۔۔۔۔ اور اس نے محسوس کیا کہ وہ سب اسے پاگل سمجھ رہے ہیں۔'' ۴؎

بادشاہ کے حکم شاہی کو تسلیم نہ کرنے پر اسے جلاوطن کر دیا گیا۔ اس غریب الوطنی کے عالم میں بھی وہ پرسکون تھا۔ بقول پروفیسر ابن کنول ''اسے سکون حاصل تھا ان لوگوں سے زیادہ جنہوں نے لباس پہن کر اپنی ہیئت تبدیل کر لی تھی''۔ پروفیسر ابن کنول نے یہاں داستانوی رنگ میں افسانے کو ایسا رخ دیا ہے جس سے قاری کو یہ گماں ہوتا ہے کہ وہ کوئی داستان پڑھ رہا ہے اور اسے میر امن کی ''باغ وبہار'' کے قصے یاد آنے لگتے ہیں۔ اس افسانے میں بھی جلاوطن آدمی صحرا بہ صحرا بھٹکتا ہوا کہیں دور ایک دراز العمر صوفی بزرگ سے جا ملتا ہے اور اپنا قصہ کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

’’اے خدا آگاہ! میں جلاوطن کر دیا گیا اس سبب سے کہ میں نے وہ لباس نہیں پہنا جو ایک غیر قوم نے ہمارے بادشاہ کو تحفے میں دیا تھا۔ کہ وہ لباس میرے بدن پر گنہگار کی قبر کی طرح تنگ ہو گیا تھا۔ اے پیرومرشد کیا میں گنہگار ہوں؟۔ چند لمحے بعد بزرگ کی پلکوں کو جنبش ہوئی۔ انھوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔۔۔اور پھر حضرت نے اسے ایک آئینہ دیا جس کا نام مرات الغیب تھا اور جس میں ہر چیز کا حقیقی روپ نظر آتا تھا۔۔۔اس نے دریافت کیا۔ اے مخزن اسرار الٰہی! اس آئینہ کا کیا مصرف ہے؟ حضرت نے فرمایا جا اور اسے اپنی قوم کے روبرو رکھ شاید وہ خود کو پہچان کر راہ راست پر آجائے۔،،

۵ ؎

اس درویشانہ محفل کے اختتام پہ وہ آدمی مراۃ الغیب لیے اپنے شہر کی طرف لوٹتا ہے اور بعض لوگوں میں نمایاں تبدیلی محسوس کرتا ہے جو اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ اس آدمی کی حکم عدولی سے خفا نہیں ہوا بلکہ اسے ایک موقع دیا تا کہ وہ ثابت کر سکے کہ دیگر ماندہ لوگوں کے افعال غلط ہیں اور وہ صحیح راہ پر ہے۔ اس نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے مراۃ الغیب کو سب کے سامنے رکھ دیا۔ افسانہ پہلا آدمی میں یہ منظر کچھ اس طرح بیان ہوا ہے۔

’’اس نے مراۃ الغیب کو سب کے روبرو رکھ دیا۔ اور اس آئینہ میں کہ جو حقیقت بیان کرتا تھا سب لباس پہننے والوں کے ننگے اور بدنما جسم نظر آئے اور وہ جو سب کی نظروں میں برہنہ تھا۔ آئینہ میں لباس زرنگار پہنے ہوئے دکھائی دیا۔،،۶ ؎

دراصل انسان کی اصل شناخت اس کی حق گوئی اور تہذیبی پاسداری ہے۔ حق گو انسان بلاخوف وخطر اپنے ملک وملت کی رہبری اور رہنمائی کر سکتا ہے اور سماج کو اصلاحی فکر دے سکتا ہے۔ پروفیسر ابن کنول کے تمام تر افسانے اصلاحی ہیں اور سماج کے آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ہر ذی شعور قاری کے لیے اصلاحی پہلوؤں کو نمایاں رکھا ہے اور اپنی دوراندیشی نیز تخیلاّنہ گہرائی کو عام فہم الفاظ میں پیش کیا ہے اور افسانہ ’پہلا آدمی‘ عصری آگاہی کی ہی ایک کڑی ہے۔

حوالہ جات:۔

۱۔’’تیسری دنیا کے لوگ‘‘ حرف آغاز از ابن کنول، جمال پرنٹنگ پریس دہلی جون ۱۹۸۴ءصفحہ ۸۔
۲۔’’پہلا آدمی‘‘ از ابن کنول مشمولہ تیسری دنیا کے لوگ جمال پرنٹنگ پریس دہلی جون ۱۹۸۴ءص ۹۔
۳۔ایضاً ص ۱۲۔ ۴۔ایضاً ص ۱۲۔
۵۔ایضاً ص ۱۴۔ ۶۔ایضاً ص ۱۵۔

☆☆☆☆

ابن کنول کا افسانہ ''بند راستے'' کا تنقیدی مطالعہ

وجے کمار

ریسرچ اسکالر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی، جموں وکشمیر)

7889315716/dharvijay1994@gmail.com

ابن کنول کا اصلی نام ناصر محمود کمال تھا۔اردو ادب کی دُنیا میں ابن کنول کے نام سے مشہور ہوئے۔اُن کے والد کا نام قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی تھا جو اپنے عہد کے نامور شاعر تھے۔ابن کنول ۱۵۔اکتوبر ۱۹۵۷ء کو بھجوئی ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے اور ۱۱ فروری ۲۰۲۳ء کو جہاں فانی سے کوچ کیا۔اُن کی پرورش علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب سے اُن کا لگاؤ بچپن سے تھا۔

ابن کنول بیک وقت ایک اچھے افسانہ نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار، ڈراما نویس، محقق، نقاد اور شاعر تھے۔اُن کے ادبی ذوق وشوق کو فروغ دینے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ادبی فضا کا اہم رول رہا ہے۔ایم۔اے کی تعلیم کے دوران ہی ''انجمن اردوئے معلیٰ'' کے سکریٹری رہے اور اُسی دوران اپنے ادبی سفر کا آغاز شعر گوئی سے کیا اور ساتھ میں افسانے بھی لکھنے لگے۔ ۱۹۷۴ء میں اُن کا پہلا باقاعدہ افسانہ ''اپنے ملے اجنبی کی طرح'' رسالہ آفتابِ سحر میں شائع ہوا تھا۔ابن کنول کی بہت سی تخلیقات اور تصنیفات اب تک شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں افسانوی مجموعے تیسری دنیا کے لوگ، ۱۹۸۴ء، بند راستے ۲۰۰۰ء اور پچاس افسانے ۲۰۱۴ء اہم ہیں۔خاکوں کا مجموعہ ''کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی'' ۲۰۲۰ء، انشائیوں کا مجموعہ ''بساط نشاطِ دل'' ۲۰۲۱ء، ڈراموں کا مجموعہ ''بزم داغ'' ۲۰۲۰ء، سفر ناموں کا مجموعہ ''چار گھونٹ'' ۲۰۲۲ء۔اہمیت رکھتے ہیں۔ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے بہت سی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ناول ''ریاض دلربا'' کو مرتب کر کے شائع کرنا اُن کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ مانا جاتا ہے جسے انھوں نے اردو کا پہلا ناول بھی قرار دیا ہے۔جبکہ عصر حاضر کے بہت سے ناقدین اور محققین نے اس کو فن کے اعتبار سے ناول ماننے سے ہی انکار کیا ہے۔

زیرِ نظر مضمون ابن کنول کے افسانہ ''بند راستے'' پر مرکوز ہے۔بند راستے کے نام سے اُن کا ایک افسانوی مجموعہ بھی ہے۔جو ۲۰۰۰ء میں ہم قلم پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوا تھا۔اس مجموعے میں کل چھبیس (26) افسانے شامل ہیں۔ابن کنول کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر فسادات، تقسیم ملک کا کرب، ہندو مسلم کا تفرقہ، مشترکہ تہذیب اور کہیں کہیں ہندوستانی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے ساتھ ساتھ توہم پرستی اور مذہب کی اندھی تقلید پر بھی افسانے دیکھنے کو ملتے ہیں۔اُن کے بیشتر افسانے حقیقت نگاری کے بالکل قریب پائے جاتے ہیں۔برصغیر کے مسائل پر اُن کی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ اُن کی تخلیقات میں بھی برصغیر میں ہونے والی ہر ردوبدل کی جھلک کسی نہ کسی روپ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

افسانہ ''بند راستے'' کا موضوع دو پیار کرنے والوں کی کہانی ہے۔جو ہجرت کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور پھر اُن کے دلوں کے راستے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔یہاں تک کہ ہیرو اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے پاکستان سے ہندوستان بھی آ جاتا ہے مگر یہاں یاس اور نا اُمیدی کے سوا اس کو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔افسانہ ''بند راستے'' کا پلاٹ کچھ یوں ہے

۔خالد اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو رحیم گڑھ کا رہنے والا ہوتا ہے۔مگر ماں کے انتقال کے بعد اپنے والد کے ساتھ لاہور چلا جاتا ہے۔کچھ عرصہ کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی ہے اور تمام سرحدی راستے بند کر دیے جاتے ہیں۔خالد اپنے مقرر کئے گئے وقت پر ہندوستان نہیں پہنچ پاتا ہے اور اُس کی محبوبہ شازیہ کی شادی ایک ادھیڑ عمر کے شخص سے کر دی جاتی ہے۔جب سرکار کی طرف سے ہندوستان اور پاکستان کا راستہ کھولنے کا اعلان کیا جاتا ہے تو خالد پہلا کام یہی کرتا ہے کہ وہ ہندوستان جانے کے لئے ویزا منظور کروالیتا ہے۔جب لاہور سے ہندوستان کے لئے روانہ ہوتا ہے تو اُسے اپنا بچپن یاد آنے لگتا ہے۔یہاں مصنف نے فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا ہے۔اُسے یاد آتا ہے کہ کس طرح سے اُس کی خالہ بی ایک روز سیکھر پور سے رحیم گڑھ آتی ہے اور اُس کے ساتھ پھول جیسی لڑکی شازیہ بھی تھی۔جس کے ساتھ پہلی ہی نظر میں اُس کو پیار ہو گیا تھا۔ بقول مصنف، وقت آگے بڑھا معصوم کلیوں نے چٹکنا شروع کیا۔یہاں تک کہ خالد کی ماں اور شازیہ کی ماں نے رشتہ بھی مقرر کر لیا صرف خالد کا باپ اس رشتے کے خلاف تھا۔وہ اس لئے خلاف تھا کیونکہ شازیہ کا باپ اُس کے خلاف الیکشن میں کھڑا ہوا تھا ۔حالانکہ لوگوں کے سمجھانے پر بعد میں اُس نے خالد کے باپ کی ہی حمائت کی تھی مگر رنجش برقرار رہی۔دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ خالد کا باپ اُس کو اپنے برابر کا زمیندار نہیں مانتا تھا۔کچھ ہی عرصہ بعد خالد کی ماں کا انتقال ہو گیا اور خالد کا باپ اُس کو اپنے ساتھ لاہور لے گیا تا کہ مملکت اسلامیہ میں وہ امن، سکون اور آزادی سے اپنی زندگی بسر کریں مگر ہوا کچھ اُلٹا جس کا اُن کو گمان تک نہ تھا۔خالد پاکستان جانے سے پہلے اپنی خالہ بی اور محبوبہ شازیہ سے ملنے ضرور گیا تھا اور اُن کو یقین دلایا تھا کہ وہ جلد واپس لوٹے گا اور شازیہ سے ہی شادی کرے گا۔جب خالد لاہور سے رحیم گڑھ اسٹیشن پر پہنچا اور وہاں رکشے والے سے رحیم گڑھ پہنچانے کو بولا ایک نے تو جگہ کا نام جاننے تک سے انکار کر دیا اور چچا قاضی محمد حسین کی ڈیوڑھی کا نام سن کر بتایا کہ

> ''ہماری سمجھ میں نہیں آیا صاحب کون قاضی محمود حسین؟ کس محلے میں رہتے ہیں۔'' اُس نے ناامید ہو کر دوسرے رکشے والے کو کسی طرح راضی کیا جس نے اُسے اپنے گھر کے قریب پہنچا دیا۔''وہ اپنی حویلی کو پہچان گیا تھا۔خوش خوش دل کی تیز دھڑکن کے ساتھ وہ اندر کی طرف بڑھا۔لیکن راستے میں ایک آدمی نے روک کر پوچھا'' کس سے ملنا ہے بابو جی؟۔اُس نے پوچھنے والے کو تعجب سے دیکھا۔ارے کون ہو تم پوچھنے والے؟ یہ میرا گھر ہے چچا، میاں کہاں ہیں؟۔کہاں سے آئے صاحب! کون چچا میاں؟ کس کا گھر؟ یہ تو لالہ کشوری لال کا گودام ہے''۔(بندر راستے۔ص۔۱۳۷)

اس اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ لوگ تقسیم کے وقت ہجرت کر کے دوسرے ملک اپنے روشن مستقبل کی اُمید لے کر گئے تو تھے ۔کچھ تو وہاں پہنچ ہی نہیں پائے، جو پہنچے بھی وہ بھی واپس نہیں آسکے یا آنے ہی نہیں دیا جانے لگا۔اگر کچھ لوگ آ بھی گئے تو اپنی جدی وراثت اور جنم بھومی پر حق جتانے سے وہ محروم ہو گئے تھے۔وہاں دوسرے لوگ اُن کی جائیداد پر قابض ہو گئے تھے ۔اپنے ہی گھر میں خود کو اجنبی پا کر خالد ایک گلی سے نکل کر ایک پُرانی مسجد کے صحن میں داخل ہوا وہاں پر موجود نابینا مولوی سے ملاقات کی جس سے اُس نے بچپن میں قرآن سیکھا تھا۔مولوی نے خالد کو بتایا کہ اُس کے چچا محمود حسین نے اپنا گھر نیلام کیا ہے اور اب شہر میں بس گیا ہے نابینا مولوی سے بات چیت کے دوران خالد نے اُسے بتایا کہ

> ''مولوی صاحب میں تو کہیں کا نہیں رہا۔پاکستان میں یہاں سے گئے ہوئے مسلمانوں کی بڑی بُری حالت

ہے۔نوکری بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔یہاں بھی سب کچھ لُٹ گیا۔'' (بندراستے۔ص۔۱۳۸)

مولوی صاحب سے رخصت لینے کے بعد خالد شازیہ کے گاؤں سکھیر پور جاتا ہے۔وہاں اپنی خالہ بی سے ملاقات کرتا ہے۔خالہ اپنی بہن کی آخری نشانی کو گلے سے لگاتی ہے اور جذباتی ہوکر اس سے لپٹ کر رونے لگتی ہے۔باتوں باتوں میں ہی شازیہ کا ذکر چھڑ جاتا ہے۔شازیہ خالد کا نام سنتے ہی رسوئی گھر سے باہر نکل کر میلے کچلے کپڑوں کو جھاڑ کر اپنے بچپن کے محبوب کے دیدار کے لئے بناوٹی مسکان بنا کر خالد کے سامنے حاضر ہوجاتی ہے۔خالد اسے سچی محبت کی یقین دہائی دلانا چاہتا ہے مگر سب بے سود۔

''شازیہ تم خاموش کیوں ہو۔میں اب بھی تمہارا ہوں۔صرف تمہارا۔میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''تم نے بہت دیر کردی خالد! شازیہ نے اُس کے ہاتھوں کو الگ کرتے ہوئے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا اور چہرے کو ہاتھوں میں چُھپا کر باورچی خانے کے گندے دھویں میں گھس گئی۔'' (بندراستے۔ص۔۱۴۱۔۱۴۰)

جب خالد نے مُڑ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کا شخص گھر میں داخل ہورہا تھا۔بچے اُسے دیکھتے ہی ابو، ابو، کی آواز لگا کر اُس کی طرف دوڑنے لگے۔خالد دیکھتا ہی رہ گیا۔اُسے لگا جیسے ہندوستان اور پاکستان کے راستے ایک بار پھر سے ہمیشہ کے لئے بند ہوگئے اور وہ پاکستان میں اپنے گھر گیا۔

افسانہ اس پُرسوز انجام پر پہنچ کر قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔اس افسانے میں مصنف نے مہاجرین اور شرنارتھیوں کی ذہنی کیفیات اور نفسیاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔کس طرح سے انسان اپنے ہی گھر میں اپنے رشتہ داروں اور یار دوستوں کے لئے اجنبی ہوجاتا ہے۔جس جگہ پر اُس کا بچپن بیتا ہو، جہاں اُس کی پرورش ہوئی ہو وہاں ہی دو منٹ بھی رکنے نہیں دیا جاتا۔جس بھی گلی سے گزرتا ہے ہر شخص شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے کہ کہیں کوئی جاسوس تو نہیں ہے۔اس سے بڑھ کر اور کیا بدنصیبی ہوسکتی ہے کس طرح دو پیار کرنے والوں کی محبت ہجرت کی بھنیٹ چڑھ گئی اور اُن کے ملنے کے راستے ہمیشہ کے لئے بند ہوگئے۔وہ دل جو ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے دھڑکا کرتے تھے سرحدی تناؤ نے دونوں کو ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا۔ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود لوگ ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں پاتے ہیں۔کس طرح ایک سرحدی لکیر نے لوگوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کر کے رکھا۔

یہ افسانہ فن کے لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔اس افسانے میں پیش کئے گئے مناظر ٹی وی سکرین کی طرح قاری کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہوجاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابن کنول کو منظر کشی میں کتنی مہارت حاصل تھی۔افسانہ بندراستے میں عام فہم اور سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔مبالغہ اور غلو سے بڑی حد تک احتیاط برتی گئی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ افسانہ حقیت نگاری کے قریب نظر آتا ہے۔اس افسانہ کے ذریعے ہجرت کے مضر اثرات کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔یہ افسانہ ختم ہونے کے بعد بھی قاری کے ذہن میں سفر جاری رکھتا ہے اور یہی ایک کامیاب افسانے کی پہچان ہے۔

Vijay kumar
Research Scholar
Department of urdu University of Jammu 180006(j$k)
Ph no 7889315716
Email.dharvijay1994@gmail.com

****

بساط نشاط دل: ایک جائزہ

پروفیسر فاروق بخشی
سابق صدر شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Mob.: 9829808782
Email Id : dr.farooqbakhshi@gmail.com

بساط نشاط دل عصر حاضر کے معروف افسانہ نگار ابن کنول کے ہیں انشائیوں پر مشتمل ان کا تازہ ترین ادبی کارنامہ ہے۔ ابن کنول کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے تھے اور ان کا نام آٹھویں دہائی میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں درج ہو چکا تھا۔ جنہوں نے افسانہ کی بھٹکتی ہوئی روح کو پھر سے افسانوی ادب کے قالب میں سمونے کا کارنامہ انجام دیا تھا ورنہ اردو کہانی تو راستے سے بھٹک چکی تھی۔ افسانوی نثر کی ڈگر سے ہٹ کر ابن کنول نے غیر افسانوی نثر کے کوچے میں قدم رکھا تو یہاں بھی انواع واقسام کے پھول کھلا کر اس کوچے کو بھی گل وگلزار بنا دیا۔ دراصل کرونا کی وباء نے پچھلے دوسالوں میں عالم انسانی پر جو قہر ڈھایا ہے اور عصر حاضر کے انسانوں کی نفسیات کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کی مثال ماضی قریب میں نظر نہیں آتی۔ فنکار جو نسبتاً عام لوگوں سے زیادہ باشعور ہوتا ہے اور انسانی زندگی کے چال چلن پر گہری نظر رکھتا ہے اور اپنے عصر کے مسائل ومصائب کو بیان کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ کیسے تماشائی بنا رہ سکتا ہے؟ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں ابن کنول نے افسانوی نثر کا دامن چھوڑ کر غیر افسانوی نثر کا دامن کیوں تھاما؟ یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہوسکتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے انسان اپنی شخصیت کے اظہار اور اپنے مزاج کی افتاد کو بیان کرنے کا راستہ تلاش کر ہی لیتا ہے اور مجھے یہ لکھتے ہوئے بے انتہا مسرت ہو رہی ہے کہ پروفیسر ابن کنول نے غیر افسانوی نثر میں خود کو تلاش کر لیا ہے۔ خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری غیر افسانوی نثر کی دو ممتاز اصناف ہیں۔ بھیانک وباء کے دور میں جب لوگ حیران و پریشان اپنوں کی ناگہانی اموات کا منظر بے بسی سے دیکھ رہے تھے ابن کنول خاموشی سے اپنی تخلیقی دنیا میں مگن تھے۔ خاکوں کا مجموعہ منظر عام پر آیا تو بہت سوں کی بھنویں تن گئیں۔ مگر ابن کنول جو اپنی صاف گوئی کے لیے خاصے بدنام ہیں اپنی بے خوفی اور بے باکی پر ڈٹے رہے۔ ان کے خاکوں کا معیار کیا ہے اور وہ ادبی تاریخ کی کس منزل تک پہونچے ہیں اس کا فیصلہ تو وقت پر چھوڑتے ہیں۔

بساط نشاط دل جو غیر افسانوی نثر کی سب سے مقبول صنف انشائیہ سے منسوب ہے اور ابن کنول کے تحریر کردہ ہیں انشائیوں پر مشتمل ہے۔ انشائیہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی تخلیق کرنے کے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے عام طور پر Light Essay Personal Essay کی اصطلاح مستعمل ہے۔ Essay (مضمون) کو انشائیہ کا ہم معنی سمجھا جاتا رہا۔ یہاں ہمارا مقصد اس تفریق کی وضاحت نہیں ہے اور نہ یہ ثابت کرنا کہ انشائیہ اردو کی ایک جدید صنف ادب ہے۔ ہاں اس

امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ عصر حاضر کا اردو انشائیہ زبان و بیان اور اظہار کی سطح پر بہت سی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اب اس کی دنیا محض اخلاقیات اور پند و نصائح کے موضوعات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس نے غزل کے موضوعات کی طرح اپنا دامن کشادہ کر لیا ہے اور اب دنیا جہان کے موضوعات انشائیہ کے دامن میں سمٹ آئے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر معاصر اردو انشائیہ صنفی امتیازات کی تفسیر و تشریح کس طرح بیان کی جائے۔ معروف انشائیہ نگار اور نقاد وزیر آغا نے ایک سوال انشائیہ کیا ہے؟ کے جواب میں کہا تھا کہ انشائیہ کیا نہیں ہے؟ جواب بہت مختصر سا ہے مگر اس جواب میں انشائیہ کی کل کائنات سمٹ آئی ہے۔ اسی لیے انشائیہ کو ایک جامع صنف ادب کہا گیا ہے۔ اس کے موضوعات کی وسعت اور تنوع کو دیکھتے ہوئے اسے دیگر غیر افسانوی اصناف سے بہ آسانی ممتاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب تخلیق کار کی تخلیقی قوت اس کا مطالعہ اور مشاہدہ اسے کہاں پہونچاتا ہے اس کا انحصار تخلیق کار کی ذہنی اپج اور اس کی فکری بساط پر ہے۔ بساط نشاط دل جیسا کہ کہا گیا ابن کنول کے بیس انشائیوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کے عنوان کی اگر کوئی اہمیت ہوتی ہے تو ابن کنول نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت بڑے رمز اور ایمائیت سے کر دی ہے۔ بساط نشاط دل کی ترکیب غالب کے نسبتاً غیر معروف شعر سے مستعار ہے۔

باغ شگفت تیرا، بساط نشاط دل
ابر بہار غم کدہ کس کے دماغ کا

شعر کی تشریح یہاں میرا کام نہیں ہے۔ مگر ابن کنول نے اس شعر کے وسیلے سے اپنے انشائیوں اور انشائیہ نگاری کی بھر پور تعریف بھی بیان کر دی ہے اور موضوعات اور اپنے مطمح نظر کی صراحت بھی۔ ویسے تو کتاب کے پیش لفظ میں بھی انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اور انشائیہ کی تعریف کے ساتھ اس کے اوصاف بھی بیان کر دیئے تھے۔

ملاحظہ کریں:

> انشائیہ کوئی علمی یا ادبی مضمون نہیں ہوتا بلکہ انشائیہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ علمی و ادبی یا سیاسی و سماجی مسائل کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ پڑھنے والا محظوظ ہو اور تحریر سے لطف اٹھائے۔

وہ مزید کہتے ہیں:

> انشائیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر انشائیہ نگار اپنی تحریر کو مشکل اور خشک انداز میں پیش کرے گا تو انبساطی مقصد فوت ہو جائے گا اور وہ ایک خشک مضمون ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے انشائیہ میں الفاظ کی نشست و برخاست اور عبارت کی سادگی سے مزاح پیدا کیا جاتا ہے"۔

مذکورہ بالا اقتباسات نے ان کے نقاد کی بہت سی مشکلیں آسان کر دی ہیں۔ ان کے نقاد کو ڈاکٹر اختر اورینوی کی طرف

دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔جنھوں نے انشائیہ کو فلسفیت اور رنگینی کا مجموعہ قرار دیا تھا۔ جے پی مورٹن نے بھی انشائیہ کو نثر کا ایک ایسا ٹکڑا قرار دیا تھا جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔عبدالماجد دریا آبادی نے حسن انشا کو انشائیے کی امتیازی خصوصیت قرار دیا تھا۔گویا وزیر آغا کے لفظوں میں انشائیہ جزیرہ کا وہ پھول ہے جو سب کا مرکز نگاہ ہوتا ہے۔ڈاکٹر آدم شیخ انشائیہ کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> انشائیہ ایک ایسی جامع اور فکر انگیز تحریر ہوتی ہے جس میں مصنف بے تکلفی اور شگفتگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔اس میں براہ راست تبلیغ یا تشہیر کی گنجائش نہیں ہوتی۔انشائیہ چند الفاظ کا بھی ہوسکتا ہے اور طویل بھی۔کائنات و ماوراء کی حقیر ترین یا اعلیٰ سے اعلی شے بھی اس کا موضوع بن سکتی ہے۔ یہ سنجیدہ، مزاحیہ یا طنزیہ ہوسکتا ہے۔انشائیہ کے لیے لازمی بنیادی خصوصیت اس کی بے تکلف اور شگفتہ فضا ہے۔ جو تحریر کو دل نشیں اور قابل قبول بنا دیتی ہے۔(انشائیہ ڈاکٹر آدم شیخ صفحہ نمبر: 32)

ڈاکٹر آدم شیخ نے بڑے جامع انداز میں انشائیہ کی تعریف اور مکمل طور پر اس کی تخلیقی جہات کا احاطہ کرلیا ہے۔اس سے قبل کہ ابن کنول کے انشائیوں پر مفصل تجزیاتی گفتگو کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیئے اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا سے بہتر کس کی رائے ہوسکتی ہے، جو انشائیہ کے نقاد بھی ہیں اور معروف انشائیہ نگار بھی:

> انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد گھر پہونچتا ہے۔ چست اور تنگ سا لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ موڑھے پر نیم دراز ہوکر اور حقے کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہوجاتا ہے، انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے اور اس کے تحت انشائیہ کا خالق نہ صرف رسمی طریق کار کے بجائے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرتا ہے۔ بلکہ غیر شخصی موضوعات پر نقد و تبصرے سے کام لینے کے بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی ردعمل کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔

(انشائیہ کے خدوخال از وزیر آغا صفحہ نمبر:10)

مذکورہ بالا سطور میں انشائیہ اور انشائیہ نگار کی واضح تصویر ذہن میں آگئیں کہ ایک اچھا انشائیہ کن صفات کا حامل ہوتا

ہے اور ایک اچھے انشائیہ نگار کو انشائیہ لکھتے وقت کن باتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ان صفات وتصورات کی روشنی میں ابن کنول کے انشائیے کس معیار تک پہونچے ہیں اس کا جائزہ پیش خدمت ہے۔

جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں عرض کی گئی تھی بساط نشاط دل میں 20 انشائیے شامل ہیں اور تقریباً ہر انشائیہ اپنے موضوع کی مناسبت اور انداز پیش کش کی بدولت ایک انفرادیت کا حامل ہے۔ مثلاً مجموعہ کا پہلا انشائیہ میں ایک پروفیسر ہوں ہمارے عصر کی ایسی کڑوی کسیلی حقیقتوں سے روشناس کراتا ہے کہ ایک پورے سسٹم کی نقاب کشائی ہو جاتی ہے۔ مجھے انشائیہ کو پڑھتے ہوئے ہمارے تعلیمی نظام کے پرخچے اڑتے ہوئے نظر آئے۔ ابن کنول کے لہجے کی سادگی اور ان کے گہرے مزاحیہ اور طنزیاتی شعور نے اسے اور ابھی دھار دے دی ہے۔ ملاحظہ کریں:

> گزشتہ صدی میں پروفیسر شپ کے مرتبے تک پہونچنا بہت مشکل عمل سمجھا جاتا تھا۔ ہر ایک کو یہ خطاب یا اعزاز نہیں حاصل ہوتا تھا۔ دراصل اس زمانے میں پروفیسر شپ کے لیے لیاقت اور اہلیت دیکھی جاتی تھی۔ اس وجہ سے بعض ایسی شخصیات بھی پروفیسر ہوگئیں جن کے پاس پی ایچ۔ڈی کی سند بھی نہیں تھی۔

اس ذیل میں مزید ملاحظہ فرمائیں:

> گزشتہ صدی میں قریب ستر کی دہائی تک ہماری یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کا قحط تھا۔ مشکل سے ایک یا دو پروفیسر ہوئے تھے اور جو پروفیسر صدر شعبہ بن جاتا تھا اس سے نجات کے لیے اس کا انتقال ہونا یا سبکدوش ہونا ضروری تھا۔ ضابطوں میں ترمیم کے بعد اس قحط سے بھی نجات ملی اور مستقل صدر یا چیئر مین سے بھی چھٹکارا نصیب ہوا اور اب تو لفظ پروفیسر کثرت استعمال کے بعد اس لفظ کی وقعت ہی نہیں رہی۔"

مذکورہ انشائیہ پڑھتے وقت رضا نقوی واہی کی نظم" پروفیسر" بے ساختہ یاد آئی مگر مجھے کہنے دیجیئے کہ رضا نقوی واہی کے یہاں مزاح کو ابھارنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ جب کہ ابن کنول نے طنز ومزاح کے مشترکہ خمیر سے اپنے انشائیے کا مرکب تیار کیا ہے۔

مجموعہ کا دوسرا انشایہ میں صحافی بنا چاہتا تھا" عصر حاضر میں صحافت کے بدلتے ہوئے منظر نامے کا طنزیاتی محاسبہ ہے۔ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا تک کا سفر صحافت نے کیسے طے کیا ہے اس کی تصویر ہمیں ابن کنول کے اس انشائیے میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ زبان کا تخلیقی استعمال اور کاٹ دار جملوں کا بیان دیکھتے ہی بنتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

> اندازہ ہوا کہ اب اس پیشے میں صحافت کم اور تجارت زیادہ شامل ہوگئی۔"
>
> بڑے ہوکر مجھے معلوم ہوا کہ لوگ اپنے آپ سے کتنے ہی بے خبر کیوں نہ ہوں دوسروں

کی خبر جاننے کے لیے مضطرب رہتے ہیں"۔

اس مجموعے کے کچھ انشائیے بے ساختہ دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوں گے ایسی توقع مجھے ہے۔ مثلاً علی گڑھ کا جغرافیہ ابن کنول کا ایسا ہی انشائیہ ہے۔ مسلم یونیورٹی کی بدولت علی گڑھ کل عالم میں ایک ایسی حیثیت رکھتا ہے جس کی قدر و قیمت سے ہم سب واقف ہیں۔ ابن کنول کی تمام تعلیم اسکول تا یونیورسٹی علی گڑھ میں ہوئی ہے۔ بھلا پھر ان سے بہتر علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی کو کون سمجھ سکتا ہے۔ ان کے یہ جملے ان کے مزاحیہ اسلوب کے نمائندہ ہیں:

> علی گڑھ کے مشہور ہونے کی اگر کوئی وجہ ہے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ورنہ تالے، مچھر اور مکھیاں تو اور شہروں میں بھی مل جاتے ہیں۔"
>
> یہاں ہر ادبی قبیلے کے اساتذہ موجود ہیں۔ مثلاً رومانوی مزاج رکھنے والے بھی ہیں اور ترقی پسندی کو فروغ دینے والے بھی بعض جدیدیت کے علم بردار بھی تھے، مابعد جدید اس وقت تک علی گڑھ میں داخل نہیں ہوا تھا۔"
>
> علی گڑھ ایسا دشت جنوں ہے کہ جس کے گوشے گوشے سے دیوانوں اور وفا کے پروانوں کے لیے جوئے حیات ابلتی ہوئی نظر آتی ہے۔"

کووڈ 19 اور لاک ڈاؤن دونوں انشائیے اپنے موضوع اور مواد کی بدولت بہت یادگار ہوئے ہیں۔ اس وبا نے انسانوں پر جیسا قہر ڈھایا ہے اس کے دل دوز مناظر ابن کنول اپنے ہلکے پھلکے انداز نگارش اور لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ وہ بقول مشتاق احمد یوسفی درد کم نہیں، درد کی تکلیف کو کم کر دیتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

> دراصل چین سے دنیا میں بہت کم لوگ خوش ہیں۔ ملک بہت بڑا ہے لیکن آدمی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہونے کی وجہ سے بھیڑ بھی وہاں بہت ہوگئی ہے۔
>
> چین کی عادت ہے کہ اپنی کوئی چیز بھی اپنے ملک تک نہیں رکھتا، پوری دنیا میں برآمد کرتا ہے، بس اس نے کورونا وائرس کی بھی برآمد شروع کر دی۔ پہلے برآمد کی ہوئی اشیاء سستی تھیں اب کورونا مفت کر دیا۔
>
> ہماری ہر حکومت کسی نہ کسی بندی پر ضرور توجہ دیتی ہے جو براہ راست بندوں کو متاثر کرتی ہے۔"

لاک ڈاؤن کی مزید صورت حال سے آپ بھی لطف اندوز ہوں:

> حالت یہ ہوگئی کہ کوئی اپنے ہی گھر میں پھنسا کوئی غیر کے گھر میں پھنسا کسی کو میکے میں

رہنے کا موقع مل گیا، کوئی سسرال میں پھنس گیا، کوئی عیادت کو گیا، پرسے کے بعد اوٹا،
کوئی تین دن کے ہنی مون کے لیے گیا، چار مہینے کا چلہ لگا کر واپس آیا۔
وہی ناراور چوری کے مابعد جدید طریقے عصر حاضر کی علمی وادبی صورت حال پر بھر پور تبصرے ہیں۔
سمیناروں اور مشاعروں کے علمی اور ادبی سے زیادہ غیر علمی اور ادبی فائدے زیادہ
ہیں۔
"ارے بھئی چوروں نے لوگوں کو کنگال کیا لیکن ہماری زبان کو مالا مال کیا۔"
میرے خیال میں تو ادبی چوریوں کو جائز قرار دینا چاہئے۔ اب آپ کے کلام میں میر،
غالب، یا اقبال وغیرہ کے خیال آجاتے ہیں تو اس میں آپ کی کیا غلطی ہے۔"

ابن کنول کے انشائیہ نگاری کا ایک بہت بڑا وصف ان کے انشائیوں کا موضوعاتی تنوع ہے۔ موضوعاتی بوقلمونی نے ان کے انشائیوں کو بے انتہا کارآمد اور ابن کنول کو عہد ساز انشائیہ نگار بنا دیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے انشائیوں کے حوالے سے بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ان کے انشائیوں کی فضا بے انتہا خوشگوار ہوتی ہے۔ ابتدا تا آخر تک ان کا انشائیہ اپنے قاری پر ایک تاثر چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ قنوطیت سے ان کے انشائیے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کا بنیادی مقصد اپنے قارئین کو مسرت وانبساط کی فراہمی کرنا ہے۔ جو ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے جس میں وہ صد فیصد کامیاب نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مزاج کی خصوصیت ہے کہ وہ خود خوش رہتے ہیں اور اپنے دل میں دوسروں کو خوش دیکھنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ ان کا اظہار بیان فطری ہوتا ہے۔ جسے انشائیہ نگاری کا بنیادی وصف مانا گیا ہے۔

اس کتاب میں شامل ہیں انشائیوں میں کئی انشائیے مثلاً علی گڑھ کا جغرافیہ فیس بک سے واٹس ایپ تک بہو کی تلاش میرے نزدیک اردو انشائیہ نگاری کی تاریخ میں یادگار سمجھے جائیں گے۔ بلا شبہ ابن کنول کے یہ انشائیے اردو انشائیہ نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ حاصل کریں گے۔

☆☆☆

پروفیسر ابنِ کنول بحیثیت خاکہ نگار

(کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی کی روشنی میں)

ڈاکٹر محمد سراج اللہ تیمی

ایم آئی ٹی ٹی بی ایڈ کالج، پھلواری شریف، پٹنہ

موبائل:9199726661، ای میل:serajullahtaimi@gmail.com

اردو ادب کی نثری اصناف میں خاکہ نگاری ایک اہم صنف ہے۔اس میں قلم کار و فنکار کسی شخص کا حلیہ وشبیہ، رنگ و روپ، گفتار و کردار، چال وڈھال، نشست و برخاست، نقل وحرکت اور حیات وخدمات کا نقشہ نہایت خوبصورتی، شگفتگی اور ادبی پیرایہ اسلوب میں کھینچتا ہے جس سے قارئین کو متعلقہ شخص کی زندگی یا شخصیت کھلی کتاب معلوم پڑتی ہے، بالفاظ دیگر وہ شخص قارئین کے روبرو چلتا پھرتا اور حاضر و ناظر محسوس ہوتا ہے۔اردو زبان وادب میں پہلے پہل بیسویں صدی میں اس صنف کا ورود مسعود ہوا۔ یوں تو اس کے ابتدائی نقوش ہمیں مولانا محمد حسین آزاد کی معرکۃ الآرا تصنیف "آب حیات" (1880) میں ملتے ہیں، مگر ارباب اردو زبان وادب نے مرزا فرحت اللہ بیگ کو اس کا موجد قرار دیا ہے۔ میں بھی اسی کا قائل ہوں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" (1927) لکھ کر اس صنف کو نہ صرف جلا بخشی، بلکہ باضابطہ اس کو فن کی حیثیت بھی دلائی۔ بعد میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، آغا حیدر، شاہد احمد دہلوی، سردار دیوان سنگھ مفتون، جوش ملیح آبادی، خواجہ محمد شفیع، مالک رام، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، سید اعجاز حسین، کنہیا لال کپور، شورش کاشمیری، فکر تونسوی، قرۃ العین حید، انتظار حسین، مجتبیٰ حسین، علی جواد زیدی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چند، ظ انصاری اور بلونت سنگھ وغیرہم نے اردو میں خاکہ نگاری کی روایت کو عروج وارتقاء کے مدارج طے کرانے اور فروغ دینے میں کلیدی کردار نبھائے۔ اس سلسلۃ الذھب کی تازہ کڑی میں پروفیسر ابنِ کنول، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی کا نام جڑ گیا ہے۔انہوں نے بیش قیمتی پچیس خاکے قلمبند کر کے انہیں "کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی" کے نام سے 2020 میں لاک ڈاؤن کے دوران شائع کرایا اور اردو خاکوں کے ذخیرۂ کتب میں اضافہ کیا۔اس کتاب کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہو رہی ہے، قارئین ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں اور اسے اردو خاکوں کا قطب مینار قرار دے رہے ہیں۔ بنظر غائر و بالاستیعاب مطالعہ کے بعد میں بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بلاشبہ یہ کتاب اردو خاکوں کا قطب مینار ہے۔ نیز پروفیسر ابنِ کنول جس طرح بحیثیت محقق، ناقد، افسانہ نگار اور انشائیہ نگار اردو دنیا میں بلند مقام ومرتبہ رکھتے ہیں، اسی طرح بحیثیت خاکہ نگار اب انہوں نے اپنی ظفر یابی کا علم نصب کر کے اپنا قد کافی اونچا کر لیا ہے۔

معاصر اردو ادب میں ابنِ کنول کی کئی حیثیت ہے۔ وہ ممتاز ناقد، محقق، افسانہ نگار، انشا پرداز کی حیثیت سے ادبی دنیا

میں معروف ومقبول اور میری چند پسندیدہ ادبی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ بلاشبہ وہ عبقری، عسکری، شش جہت، نابغہ روزگار، نایاب، کمیاب، لعل وگہر اور لؤلؤ ومرجان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی علمیت، قابلیت، صلاحیت، استعداد، شعور وادراک اور تبحر علمی کا ہر چہار جانب شہرہ وغلغلہ ہے۔ ان کے اندر بذلہ سنجی، خوش طبعی، سنجیدگی اور شگفتگی کا دریا متموج ہے۔ وہ پیکر خلوص ومحبت، مجسمہ اخلاق وکردار، مصدر فضل وکمال اور مرجع خلائق ہیں۔ یوں کہا جائے کہ وہ اسم بامسمّٰی یعنی ناصر محمود کمال ہیں۔ جس کسی سے ایک بار مل لیتے ہیں یا جو کوئی ان سے ایک بار مل لیتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔ تقریباً پانچ دہائیوں سے وہ اردو زبان وادب کے فروغ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ چونکہ پاک پروردگار نے انہیں علمی، لسانی وقلمی بے پناہ صلاحیتوں سے مالا مال کر رکھا ہے، چنانچہ اب تک مختلف اصناف میں متعدد تحقیقی، تنقیدی، علمی وادبی مضامین قلمبند کر چکے ہیں۔ ان کے افسانے قارئین کو حظ بہم پہنچا رہے ہیں۔ اب تک اپنی بیش قیمتی 28 کتابیں اردو دنیا کو عطا کر چکے ہیں جن میں "تیسری دنیا کے لوگ" (افسانے) 1984، "بندر راستے" (افسانے) 2000، "ہندستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں" 1988، "ریاض دلربا" (تحقیق) 1990، "آؤ اردو سیکھیں" (قاعدہ) 1993، "داستان سے ناول تک" (تنقید) 2001، "انتخاب سخن" (اردو شاعری کا انتخاب) 2005، "منتخب غزلیات" 2005، "اصناف پارینہ" (قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ) 2005، "منتخب نظمیں" 2005، "تنقید وتحسین" (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2006، "تحقیق وتدوین" (ترتیب) 2007، "میر امن" (مونوگراف) 2007، "باغ وبہار" (مقدمہ ومتن) 2008، "پہلے آپ" (ڈرامہ) 2008، "نظیر اکبرآبادی کی شاعری" 2008، "مضراب" (کنول ڈبائیوی کا کلیات مع مقدمہ) 2010، "اردو افسانہ" (افسانوی تنقید) 2011، "پچاس افسانے" (افسانوی مجموعہ) 2014 "تنقیدی اظہار" (تنقید) 2015، "فسانہ عجائب" (مرتبہ) 2016، "اردو لوک ناٹک روایت اور اسالیب" (ڈبائیوی) مرتبہ, 2014، "اھل الکھف" (افسانے) عربی مترجم: احمد قاضی، مصر، 2018، "اردو شاعری" (تنقید) 2019، "داستان کی جمالیات" 2020، بساط نشاط دل (انشائیے) اور تبریک (تقاریظ) شامل ہیں۔ ان تالیفات وتصنیفات کی فہرست میں اب ایک نئی تصنیف خاکوں کا مجموعہ "کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی" کا اضافہ ہوا ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ ذیل میں اس کتاب کا مختصر مطالعہ پیش کیا جاتا ہے جس کی روشنی میں پروفیسر ابنِ کنول کی خاکہ نگاری کی انفرادیت اور بلند قدوقامت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب "کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی" میں پچیس خاکے شامل ہیں جو ان کے بعض مربین، معلمین، مشفقین، محبین، منسلکین اور چند ادبی وعلمی شخصیات سے متعلق ہیں، مثلاً ماسٹر منشی چھٹن، پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، عنوان چشتی، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، قرت العین حیدر، محمد عتیق صدیقی، محمد زماں آزردہ، اے رحمن، علی احمد فاطمی، پیغام آفاقی، اسلم حنیف، جلال انجم، فاروق بخشی، ارتضی کریم، شمس تبریزی، خواجہ محمد اکرام الدین اور پروفیسر محمد کاظم، نعیم انیس وغیرہم۔

فاضل خاکہ نگار نے کتاب کے آغاز میں اپنے حلفیہ جملوں سے بڑی بے باکی اور نہایت خوبصورتی کے ساتھ قارئین کی توجہ اپنی اور کتاب کی جانب مرتکز کرنے کی سعی کی ہے جو ان کا خاصہ بھی ہے، ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ لگائیں:

"جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ یقین کریں یا نہ کریں، آپ کو اختیار ہے"۔ (ص:4)

خاکہ نگار پروفیسر ابنِ کنول کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے عالمی وباء کورونا وائرس اور ملک گیر لاک ڈاؤن کے دوران اس کتاب کو 2020 میں زیور طباعت سے آراستہ کیا تھا اور قارئین کے درمیان پیش کیا تھا۔ قارئین نے بھی اس کی اہمیت، معنویت اور ادبیت کے سبب اس کی خوب خوب پذیرائی کی تھی۔ پذیرائی کا یہ سلسلہ جاری ہے اور امید ہے مستقبل بعید تک جاری رہے گا۔ انہوں نے لاک ڈاؤن کا منظر، پس منظر، پیش منظر، لاک ڈاؤن کے سبب ملک کے بدلتے حالات اور لوگوں کی مشکلات کا تذکرہ "معذرت

نامہ" عنوان کے ضمن میں جس طرح داستانوی اور افسانوی، مگر حقیقت پر مبنی پیرایۂ اسلوب میں کیا ہے، اس سے ان کا منفرد لب ولہجہ مترشح ہوتا ہے جو قارئین کے دلوں کو چھو جاتا ہے اور اس کی قرأت پر انہیں مجبور کر دیتا ہے، دعویٰ بلا دلیل کا میں قائل نہیں، اس لیے تمہید بعنوان "معذرت نامہ" کی ابتدائی چند سطور ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ لگائیں کہ اس کا آغاز کس دلکش پیرایۂ اسلوب میں کیا ہے:

"اور پھر حاکم وقت نے اعلان کیا:

اے لوگو! ہم سب ایک آسمانی آفت میں گرفتار ہیں اور اس سے نجات کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے فاصلہ بنا کر رکھیں۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ سردست جو شخص بھی جس مقام پر ہے ٹھہر جائے، خود کو گھروں میں قید کر لے، تاکہ ہم اس آفت ناگہانی سے محفوظ رہ سکیں۔"

اور اس اعلان کے ساتھ پورے ملک میں سناٹا چھا گیا، تمام بازار اور گھر کے دروازے بند ہو گئے، سڑکوں پر ویرانی چھا گئی، محلوں میں وحشت برسنے لگی، ہر شخص حیران و پریشان تھا کہ اب کیا ہوگا؟ کیوں پوری دنیا عذاب میں مبتلا ہوگئی ہے؟ کیوں ہم اپنے عزیز واقرباء سے بھی دور ہو گئے ہیں؟ کیوں موت ہم سب کے سروں پر منڈلا رہی ہے؟ کیا قیامت کی آمد ہے؟ کیا خدا کی طرف سے ہم سب کو محتاط کرنے کا کوئی طریقہ ہے؟ کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ گھروں میں قید افراد بھی اپنوں کو ہی شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے اور قریب آنے سے کترا رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ان قیدیوں پر کیا گزرتی ہوگی جو قید خانوں میں بند ہیں۔ ان کے پاس تو نہ کوئی اپنا ہوتا ہے، نہ روشنی ہوتی ہے اور نہ ہوا۔ میں سوچ رہا تھا ان پرندوں کے بارے میں جو پنجروں میں قید ہیں، سب کچھ ہے، آزادی نہیں ہے۔ مجھے اقبال کی "پرندے کی فریاد" یاد آئی جس پر

پرندہ کہتا ہے:

آزاد مجھ کو کردے او قید کرنے والے
میں بے زبان ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

لیکن یہ نظر بندی یا قید ہماری اپنی اور اپنے عزیزوں کی حفاظت کے لیے تھی"(ص:8-7)

کتاب کا پہلا خاکہ منشی چھٹن کا ہے جو ابنِ کنول کی ابتدائی تعلیم کے استاد ہیں۔انہوں نے اس کے ضمن میں اسکول کے کئی اساتذہ مثلاً منشی حاجی صفدر علی، منشی ہادی علی اور ماسٹر منشی چھٹن کی خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے کہ قارئین کو پڑھتے وقت بڑا لطف آتا ہے اور ان سبھی کے خاکے ان کے اذہان وقلوب پر منقش ہوجاتے ہیں۔اس خاکہ میں انہوں نے اتر پردیش کے قصبہ "گنور" کا جغرافیہ، اس کی تاریخی حیثیت اور وہاں اردو میڈیم اسکول میں اپنے داخلے کی دلچسپ داستان بھی بیان کی ہے۔ساتھ ہی ایک سطر میں اس اسکول سے نکل کر دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر بننے تک کی پلاننگ کا انکشاف بھی بڑی چابکدستی سے کیا ہے:

"1962 میں یہ سوچ کر ہمیں اس اردو میڈیم اسلامیہ اسکول میں داخلہ کرایا کہ بڑے ہوکر انہیں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر ہونا ہے۔"(ص:13)

انہوں نے اس میں اپنی شادی کا تذکرہ بھی بڑی خوبصورتی سے کیا ہے:

" پہلی کلاس میں ہمارے کلاس ٹیچر منشی حاجی صفدر علی تھے بعد میں جن کی پوتی ہماری شریک حیات بن گئی"۔(ص15)

انہوں نے اس عنوان کے تحت اپنے کئی اسکولی ساتھیوں مثلاً عبدالمقیت، وکیع الدین، انور خورشید، انیس احمد وغیرہم سے وابستہ یادوں کو بھی الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، ان کے خاکے کھینچے ہیں اور اخیر میں اپنے استاد منشی چھٹن کو بہت ہی جذباتی انداز میں یاد کیا ہے۔رقم طراز ہیں:

"دہلی آئے ہوئے چار دہائیوں سے زیادہ وقت گزر گیا لیکن چھٹن منشی جی کا چہرہ اور ان کی باتیں اب بھی یاد ہیں۔سنا ہے بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔میرے ذہن میں وہ اب بھی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ ان کی وہی صورت اور وہی مشفقانہ باتیں مجھے یاد دلاتی رہتی ہیں۔انسان بچھڑ جاتا ہے لیکن اس کا کردار اسے زندہ رکھتا ہے۔چھٹن منشی ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔"(ص:16)

کتاب میں دوسرا خاکہ بعنوان "سنٹوسرکل" ہے۔اس میں انہوں نے سرسید احمد خان کے ذریعہ 1875 میں اس اسکول کے قیام، وہاں سے جنرل ایوب خان، لیاقت علی، طلعت محمود، حامد انصاری، عرفان حبیب، سعید جعفری، جاوید اختر، مشیر الحسن، منصور علی خان پٹودی، احمد علی، ظفر اقبال اور عبدالرحیم قدوائی جیسی نامور ومقتدر شخصیات کی اسکولنگ اور حصول علم کا تذکرہ کیا

ہے۔ان مقتدر شخصیات کی فہرست میں اپنا نام نامی اسم گرامی بھی شمار کیا ہے۔اپنے حوالے سے کئی انکشافات بھی کئے ہیں،مثلاً:

"ہم پہلے دن بہت بن سنور کر خاکی پینٹ اور سفید قمیص پہن کر اسکول پہنچے۔ہم نے اپنی کتابیں پلاسٹک کے ایک خوبصورت سے تھیلے میں رکھی تھی جسے دیکھ کر کچھ سنیئر طالب علموں نے طنز کیا: کیوں پاٹنر! کیا سبزی لینے بازار جارہے ہو؟ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے دن ہم نے اسے بدل دیا۔"(ص:19)

اس میں انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں سینئروں اور جونیئروں کے درمیان حد فاصل کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ایک دوسرے کی عزت واحترام ملحوظِ رکھتے ہوئے سنیئرٹی کو مجروح نہیں ہونے دینے پر بھی مہر ثبت کی ہے۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"علی گڑھ میں سینئر جونیئر کی تفریق بہت ہے۔ہر سینئر جونیئر پر برتری حاصل کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے اور جونیئر سینئر کا ادب کرتا ہے۔وہ دنیا کے کسی ملک میں ہوں اپنی سنیئرٹی کے احساس کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔"(ص19)

اس خاکے میں ابنِ کنول نے اپنے کئی احباب اور اساتذہ کا ذکر جمیل کیا ہے،مثلاً صغیر احمد صدیقی،افضال احمد صدیقی، مولانا عبدالقیوم،ظہیر احمد،خالدہ میڈم،قدسیہ میڈم وغیرہم،ان سب کے بھی خدوخال پیش کئے ہیں۔انہوں نے اے ایم یو کی خوشگوار فضا،علمی ماحول،طلباء واساتذہ کے درمیان پائیدار تعلقات کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ساتھ ہی "منٹوسرکل" میں گزارے اپنے پانچ سالوں کو اپنے لیے بے حد عزیز قرار دیا ہے۔اس خاکے کا تتمہ مندرجہ ذیل یادگار و تاریخی پیراگراف پر کیا ہے:

"اب میری شناخت ناصر محمود کے بجائے پروفیسر ابنِ کنول کے طور پر ہونے لگی ہے۔لیکن سچ یہ ہے کہ میں اب بھی اپنے آپ کو ناصر محمود کی شکل میں منٹوسرکل کی گھاس کے میدانوں میں دوڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔اسی کا نام اسکول ہے جہاں بچپن بچپن ہوتا ہے۔جس طرح بچپن میں یاد کی ہوئی نماز ہمیشہ یاد رہتی ہے اسی طرح اسکول میں گزرا وقت کبھی دل سے محو نہیں ہوتا اور پھر منٹوسرکل جیسا اسکول جو ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ایک تہذیبی مرکز ہے جو سرسید کا خواب ہے اور ہم اس کی تعبیر ہیں۔"(ص20)

کتاب میں ایک خاکہ "داستان گو قاضی عبدالستار" کے عنوان سے ہے۔اس میں ابنِ کنول نے اپنے استاد قاضی عبدالستار صاحب کی علمی جلالت،رعب ودبدبہ،اردو زبان وادب،بالخصوص افسانہ نگاری کے میدان میں ان کی عظمت ورفعت، بلند قد وقامت،ملک میں منعقد سمیناروں وکانفرنسوں میں ان کی شرکت اور ان سے اپنے گہرے مراسم پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ان کی شخصیت اور کارناموں کے مختلف گوشوں کو اس طرح وا کیا ہے کہ وہ قارئین کو کھلی کتاب معلوم پڑتے ہیں۔اس میں ایک خاکہ پروفیسر قمر رئیس کے حوالے سے بھی شامل ہے جس میں ان سے پہلی ملاقات کا واقعہ بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔پہلی ملاقات میں ہی وہ کس طرح ان کا گرویدہ ہوگئے اور پھر دونوں کے درمیان استادی وشاگردی کا رشتہ کیسے ہمیشہ کے لیے قائم واستوار ہوگیا اس کو بھی طشت از بام کیا ہے۔اس ضمن میں دہلی یونیورسٹی کے اپنے بعض ساتھیوں اور اساتذہ کا

بھی ذکر خیر کیا ہے، جن میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، فضل الحق، شمیم نکہت، تنویر احمد علوی، پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر عتیق اللہ وغیرہم شامل ہیں۔ اس کے تحت دہلی کی آب وہوا، تہذیب وثقافت، وہاں کے ٹریفک نظام، بسوں میں سفر کی مشکلات، بٹلہ ہاؤس میں قیام، کالندی کنج پارک میں پروفیسر قمر رئیس کے ساتھ مارننگ اینڈ ایوینگ واکنگ، قمر رئیس کے حسن وجمال، اخلاق وکردار، ان کی ادبی حیثیت، بلند قد وقامت، ان کی تالیفی، تصنیفی اور ادبی خدمات وغیرہ سے متعلق بھی خوب خامہ فرسائی کی ہے۔ ساتھ ہی اپنی ترقی کا سہرا ان ہی کے سر باندھ کر ایک فرماں بردار شاگرد ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"میرے دل میں ان کے لیے آج تک عزت واحترام ہے۔ میرے اس مقام تک پہنچنے کا وہی ذریعہ بنے تھے۔ دہلی اور دہلی سے باہر اردو ادب اور ادیبوں میں قمر صاحب کی وجہ سے بھی بہت عزت ملی۔ بڑے آدمی کے ساتھ رہنے والے کو بھی لوگ بڑا سمجھ لیتے ہیں۔" (ص53)

ابنِ کنول نے اپنے استاد پروفیسر قمر رئیس کی شباہت ووجاہت اور ان کے حسن وجمال کو "حسن یوسف" سے تشبیہ دیا ہے، البتہ اس یوسف سے نہیں جس کی خوبصورتی کے حوالے سے مشہور ہے کہ اللہ نے چاند کی نصف خوبصورتی انہیں عطا کی تھی اور باقی نصف کو پوری دنیا کے انسانوں میں تقسیم کر دیا بلکہ ابنِ کنول نے قمر رئیس کو اس یوسف سے تشبیہ دی ہے جو بھارتی فلموں میں لیجنڈ اداکار وشہنشاہ جذبات کے آداب والقاب اور دلیپ کمار کے نام سے مشہور تھا، جس نے بالی ووڈ پر کئی دہائیوں تک حکمرانی و بادشاہت کی، جو کروڑوں نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن تھا، بہر حال! پروفیسر ابنِ کنول پروفیسر قمر رئیس کو دلیپ کمار جیسی خوبصورت و پرکشش شخصیت کا مالک بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"قمر صاحب کی شخصیت بہت پرکشش تھی۔ دلیپ کمار کی طرح خوبصورت پٹھان تھے۔ دراز قد، نکھرتا رنگ، چمکدار مسکراتی آنکھیں، پیشانی پر لہراتے سیاہ بال جنہیں تھوڑی تھوڑی دیر میں انگلیوں سے اوپر کرتے، خاموش رہتے تو صوفیانہ استغراق، بولتے تو بلبل کی سی چہچہاہٹ۔" (ص:41)

اردو زبان وادب کی قدیم تاریخ ہے کہ معاصرین کے درمیان کسی نہ کسی بات کو لے کر چشمک کی دیواریں اٹھی رہتی ہیں، بلکہ تلوار کھچی رہتی ہے اور ہر کوئی ایک دوسرے کی گردن زدنی کے لیے شمشیر بکف ہوتا ہے۔ انشا و مصحفی اور انیس ودبیر کی چشمک جگ ظاہر ہے۔ اسی طرح پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے درمیان معرکہ آرائی سے دنیا واقف ہے۔ ابن کنول نے ان دونوں کے درمیان ہمہ وقت جنگ چھڑی رہنے کے باوجود ان کے تعلقات کو ہندو پاک جیسے تعلقات سے تشبیہ دی ہے اور خود کو قمری کیمپ کا سپاہی قرار دیا ہے، رقمطراز ہیں:۔

"اس زمانے میں اردو کی دو معروف شخصیات پر دہلی کی ادبی سرگرمیوں کا انحصار تھا۔ ایک پروفیسر قمر رئیس اور دوسرے پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ دونوں اپنے زمانے کے انشا و مصحفی یا انیس ودبیر تھے۔ اس

زمانے کے بزرگ اور نوجوان ادیب وشاعرانیسیوں اور دبیریوں کی طرح تقسیم تھے۔ہم قمری گروہ کے سپاہیوں میں شمار ہوتے تھے۔علی گڑھ میں قاضی عبدالستار کے آدمی کہلاتے تھے، یہاں ان کے دوست قمر رئیس کے کہلائے گئے۔قمر صاحب اور نارنگ صاحب کے پاس عہدے بھی تھے، قلم بھی اور قلمکار بھی تھے۔نظریاتی اختلافات تھے۔خوب مورچہ بندی ہوتی تھی۔کبھی کبھی مصلحتاً Ceasefire کی بھی نوبت آجاتی تھی لیکن وہ ہند و پاک جیسے ہی تعلقات تھے۔ Ceasefire کی خلاف ورزی اپنی جگہ تھی۔"(ص:48-47)

پروفیسر ابنِ کنول افسانہ نگار اور خاکہ نگار کے ساتھ ساتھ نقاد بھی ہیں اور نقاد بھی کوئی" لکیر کا فقیر" نہیں اور نا ہی وہ" من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کا قائل ہیں، وہ تو" جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا" پر ہمہ وقت کار بند رہتے ہیں، اس سے ایک انچ آگے بڑھتے ہیں اور نا ہی پیچھے ہٹتے ہیں۔استاد قمر رئیس سے حد درجہ عقیدت ومحبت کے باوجود ان کی لامذہبیت ودین بیزاری سے نقاب کشائی بڑی بے باکی سے کی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"صوم وصلوۃ سے وہ دور تھے۔۔۔۔۔سنا ہے قمر صاحب نوجوانی میں ایسے نہیں تھے یعنی جب شاہجہاں پور میں تھے تو نماز بھی پڑھتے تھے اور کبھی کبھی اذان بھی دیتے تھے لیکن جب جوان ہو کر لکھنؤ آئے تو پڑھے لکھوں کی صحبت میں بگڑ گئے۔"(ص:42-41)

اس کتاب میں ایک خاکہ " گوپی چند نارنگ " کے عنوان سے ہے۔اس میں فاضل مصنف نے پروفیسر گوپی چند نارنگ سے اپنے تعلقات، ان کی نیرنگی شخصیت وعظمت، علمیت وقابلیت، فضائل وکمالات اور گراں قدر ادبی خدمات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔انہوں نے اس ضمن میں بھی دہلی اور علی گڑھ میں اردو ادباء، بالخصوص پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر نارنگ اور پروفیسر عنوان چشتی کے درمیان مخاصمت اور ان کی گروہ بندیوں کا جم کر بھانڈا پھوڑا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"جب اسکول سے نکل کر علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں آئے تو اردو اور اردو والوں کی سیاست کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی اور 1978 میں دہلی آکر تو اردو کا پارلیمنٹ ہی دیکھ لیا۔یہاں تو آزادانہ حکومتیں قائم تھیں۔کہیں پانی پت کا میدان تھا، کہیں پلاسی کی جنگ تھی، کہیں بکسر کی لڑائی۔"(ص:69)

ابنِ کنول چونکہ ہمیشہ سے حلیم و بردبار اور دور اندیش ونکتہ رس رہے ہیں، اختلاف وانتشار سے اپنے دامن کو شروع سے محفوظ رکھا ہے۔ وہ چونکہ طلباء کے بہت بہی خواہ ہیں اور اپنے شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح مانتے ہیں اور اساتذہ کے اختلافات کو طلباء کے لیے باعث خسارہ سمجھتے ہیں۔اساتذہ کی گروہ بندی سے وہ کیسے نبرد آزما ہوئے اور کیسے حکمت ومصلحت کے حصار میں خود کو محصور کیا اس کا بخوبی اندازہ ان کے اس قول لین سے لگایا جا سکتا ہے:

"ہمارے لیے بڑی مشکل تھی۔ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر۔ابا نے کہا تھا تینوں کا

احترام کرنا، حالات کہہ رہے تھے کسی ایک کا ہو جاؤ۔ ہم ٹھہرے صلح کل پر چلنے والے آدمی۔ یعنی کل سے صلح رکھو۔ نظریہ اپنا رکھو۔ نہ کاہو سے بیر رکھو، نہ کاہو سے دشمنی۔ اساتذہ کے اختلافات میں اکثر طلباء کا نقصان ہوتا ہے"۔ (ص:69)

فاضل خاکہ نگار نے معروف صوفی شاعر عنوان چشتی کا بھی خاکہ بڑی خوش اسلوبی سے تحریر کیا ہے۔ ان سے اپنے والد بزرگوار کنول ڈبائیوی کے خوشگوار تعلقات، ان کے نام کے ساتھ "چشتی" لفظ کے لاحقہ کی وضاحت، ان سے اپنی پہلی ملاقات، بالمشافہہ ان سے علمی مذاکرہ اور ان کی حیات و خدمات وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ معروف افسانہ نگار و ناول نگار حیات اللہ انصاری کا بھی خاکہ عالمانہ انداز میں لکھا ہے۔ ان کی حیات و خدمات کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے افسانہ " آخری کوشش" اور ناول "لہو کے پھول" کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان سے اپنی ملاقات کا یادگار واقعہ قلمبند کیا ہے۔ ان کی شباہت و وجاہت اور جسامت و قدامت کو لال بہادر شاستری سے تشبیہ دی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں 1985 میں "ریسرچ سائنٹیسٹ" کی حیثیت سے اپنی تدریسی خدمات کے آغاز کا تذکرہ بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ لفظ "سائنٹیسٹ" کی وضاحت بہت ہی مزاحیہ انداز میں کی ہے۔ قارئین اسے پڑھ کر محظوظ تو ہوتے ہی ہیں، فرطِ مسرت سے جھوم بھی اٹھتے ہیں کہ اردو زبان و ادب کو پروفیسر ابنِ کنول کی شکل میں کنہیالال کپور اور پطرس بخاری کا بدل مل گیا۔ اس پر میں بھی مہر صداقت ثبت کرتا ہوں۔

پروفیسر ابنِ کنول نے معروف ادیبہ، ناول و افسانہ نگار عصمت چغتائی کا خاکہ بعنوان "عصمت آپا" لکھا ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ اس کے آغاز میں انہوں نے کسی جواں سال قلمکار کی طرح نہایت پر جوش و پر مزاح انداز میں عصمت کی خاکہ کشی کی ہے۔ اس خاکے کا لفظ لفظ عصمت کی شخصیت، طبیعت، افتاد، مزاج اور خدمات کی صداقت کی شہادت دیتا ہے۔ ابنِ کنول نے اپنے افسانوی انداز کو اس خاکہ میں بھی مکمل طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ لگے ہاتھوں ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ لگائیں کہ اس کا آغاز کس طرح دلکش پیرائے میں کیا ہے:

"خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں"، صبر آجاتا اگر خاک میں پنہاں ہو جاتیں۔ ایسی خوبصورت خاتون کہ بڑھاپے میں بھی کوئی دیکھے تو دیکھتا رہے۔ درمیانہ قد، گورا رنگ، چنگیز خانی بدن، جو ہر طرح کے مقابلے کے لیے تیار، سفید روئی کے گالوں جیسے بال، انگریز لیڈی کی طرح۔ تبھی تو انہیں فلم جنون" میں انگریز عورت کی ماں کا کردار ملا۔ شیام بینیگل کی نظر تھی، جینیفر سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھیں۔ بالکل بوڑھی ڈول (گڑیا) کی طرح۔ کاش خاک میں مل جاتیں۔" (ص:90)

عصمت کتنی بیباک تھیں، وہ عورتوں پر مردانہ طبقہ کے ظالمانہ رویے کی کتنی کٹر مخالف تھیں۔ عورتوں کے مسائل کو کتنی مضبوطی سے اٹھاتی تھیں، اردو زبان و ادب میں ڈرامہ نگاری و افسانہ نگاری کو انہوں

نے کیسے فروغ دیا، ان سب پر خاکہ نگار نے مسحور کن گفتگو کی ہے۔ ساتھ ہی انہیں کرشن چندر، منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کا ہم پلہ فکشن نگار بھی قرار دیا ہے۔ علی گڑھ میں ان سے بار بار اپنی ملاقات اور ان سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے۔ ان سے اپنے تعلقات کو علی گڑھ برادری کا حصہ بتایا ہے۔ ان کے انتقال کو "اردو افسانوی ادب کا آخری ستون" گر جانے سے تعبیر کیا ہے۔ اس خاکہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابنِ کنول نے خود کو عصمت آپا کی عقیدت و محبت کی زنجیر میں جکڑ رکھا ہے۔ انھیں عصمت چغتائی کے نذر آتش کرنے کا بہت دکھ ہے، لکھتے ہیں:

"قبر کے اندر یہ فکشن نگار موجود ہے۔ جب دل چاہیگا دیکھ لیں گے۔ ایسی پیاری صورت کو مٹی نے بھی میلا نہ کیا ہوگا۔ مستقل منکر نکیر سے حجت ہو رہی ہوگی اور منکر نکیر تنگ آ کر اور یہ کہہ کر چلے گئے ہوں گے کہ ان سے الجھنا اپنی مصیبت بلانا ہے کہ یہ چنگیز خان کے خاندان سے ہیں لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ان کا خوبصورت بدن تو نذر آتش ہو کر راکھ بن گیا اور ہوا میں اڑ گیا۔ آگ نے بھی پہلے چھونے سے انکار کیا ہوگا۔ عصمت آپا تو خود آگ تھیں۔ ان کے قلم سے تو آگ ٹپکتی تھی۔" (ص:92-91)

پروفیسر ابنِ کنول عصمت آپا کا خاکہ لکھیں اور عینی آپا کو نسیا منسیا کر دیں یہ ناانصافی وہ نہیں کر سکتے ہیں، آخر منصف مزاج جو ٹھہرے! شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کرتے ہوئے 2008 سے 2015 کے دوران میں نے جو مشاہدہ کیا تھا اس کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ استاد محترم فرمان ربانی "اعدلوا ھو اقرب للتقوی" کے پاسدار و علمبردار ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں بھی انصاف کو ملحوظ رکھنے کی سعی مسعود کی ہے۔ عصمت آپا کے ساتھ ساتھ عینی آپا کا بھی خاکہ لکھا ہے اور بہت عمدہ لکھا ہے۔ اس کا آغاز بایں سطور کیا ہے:

"جب سے ادبی ہوش سنبھالا، یہی سنا کہ " آگ کا دریا" کی مصنفہ کی تپش بہت تیز ہے۔ ان سے ملتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں اور بات کرتے ہوئے ہکلاتے ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ اردو کی ادیبہ ہیں لیکن انگریزی بولتی ہیں۔ انگریزی میں سوچتی ہیں اور انگریزی میں لکھتی بھی ہیں۔ ان کا رویہ بھی انگریزی حکام کا سا ہوتا ہے۔ جس طرح انگریز ہندوستانیوں سے ملتے تھے یا بات کرتے تھے قرۃ العین بھی اسی طرح پیش آتی ہیں۔ ان کی شخصیت بھی ان کے اسلوب کی طرح پر شکوہ ہے۔ کچھ وہ اپنے رویے سے مرعوب کر دیتی ہیں اور کچھ لوگ ان کی تحریروں سے مرعوب ہو کر ان کے سامنے زبان نہیں کھول پاتے ہیں۔" (ص:108)

خاکہ نگار نے اس خاکہ میں عینی آپا کی اردو زبان و ادب کے علاوہ انگریزی میں مہارت، انگریزی سے جنون کی حد تک شغف، دوسروں پر ان کا رعب و دبدبہ اور ان کے جاہ و جلال، انٹرویوروں پر ان کا خوف، ان کی عظیم المرتبت شخصیت، افسانہ

نگاری اور ناول نگاری میں ان کی انفرادیت کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔اس کے علاوہ بہت ہی شگفتہ وشائستہ لب و لہجے میں انہیں کبر وغرور سے دور ایک "سچی فنکار" قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"عینی آپا وہ نہیں تھیں جو لوگ سوچتے تھے۔وہ ایک سچی فنکار تھیں۔"شیشے کے گھر" میں بیٹھ کر" دلربا" انداز میں" چائے کے باغ" سے لا ہوئی چائے پیش کرتے اور "پت جھڑ کی آواز" کو نظر انداز کرتے ہوئے "ستاروں سے آگے"، "روشنی کی رفتار" دیکھ کر یہ کہتی ہوئی رخصت ہوگئیں "اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو"، عینی آپا مغرور نہیں تھیں۔جبکہ ان کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کسی کے اندر غرور پیدا کر سکتا ہے۔"

(ص:109)

عینی آپا کا یہ خاکہ بہت دلچسپ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔قارئین کو اس کی قرأت کے وقت بڑا لطف آتا ہے۔

اس کتاب میں معاصر اردو ڈراما کی تنقید کے نئے امام، معروف ناقد و محقق، ڈراما نگار، نکڑ ناٹکوں اور تھیٹروں کے بڑے اداکار و ہدایت کار پروفیسر محمد کاظم، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی کے استاد کا خاکہ بھی شامل ہے۔ پروفیسر ابنِ کنول اور پروفیسر محمد کاظم میں بہت گہری دوستی ہے جس کا بنفس نفیس میں شاہد ہوں۔ دراں حالاں کہ دونوں کی عمر میں تفاوت کی دیوار کھڑی ہے۔ دراصل جب آدمی ایک درسگاہ یا عمل گاہ میں ہوتا ہے تو سینئرٹی و جونیئرٹی یا عمر کی دیواریں از خود منہدم ہوجاتی ہیں، خاص کر ہم مزاجوں اور ہم خیالوں کے درمیان کی دیواریں۔ وہاں اکثر کلیگ ہم پیالہ وہم نوالہ ہوجاتے ہیں اور وہ علامہ اقبال کے اس شعر کی عملی تصویر بن جاتے ہیں:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

مذکورہ بالا شعر عام طور پر مساجد کے نمازیوں کے حوالے سے کہا جاتا ہے، مگر میں نے پروفیسر ابنِ کنول اور پروفیسر محمد کاظم کے درمیان جس طرح بے تکلفی کا مشاہدہ کیا ہے اس سے مجھے لگتا ہے کہ یہ شعر ان دونوں مشاہیر زبان وادب پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ بہر حال! اس کتاب میں پروفیسر ابنِ کنول نے بہت خوبصورتی سے پروفیسر محمد کاظم کا خاکہ کھینچا ہے اور ان سے اپنے گہرے مراسم کا بڑی اپنائیت کے ساتھ اظہار کیا ہے۔اس کی سطر سطر ہی نہیں لفظ لفظ بھی پروفیسر ابن کنول کی پروفیسر محمد کاظم سے بے پناہ محبت کی چیخ چیخ کر شہادت دیتا ہے۔خاکہ نگار نے اس کا آغاز بھی دیگر خاکوں کی طرح اپنے مخصوص اساطیری و داستانوی پیرایۂ اسلوب میں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"ہیلو- ہیلو، جی السلام علیکم"، "کہاں ہو بھئی؟"، "جی کلکتہ میں"، "کب گئے؟"، "آج صبح آیا، کل ان شاء اللہ واپس آجاؤنگا۔"، ''ہیلو- ہیلو''، ''جی السلام علیکم۔''، ''کہاں ہو بھئی؟''، ''احمد آباد میں، رات آیا تھا۔" کبھی کلکتہ، کبھی احمد آباد، کبھی جبل پور، کبھی پونا، کبھی ممبئی، کبھی بنگلہ دیش، کبھی مصر، کبھی ترکی، کبھی

تاشقند، کبھی ماریشس... یہ آدمی ہے یا جن؟ ارے یہ جن نہیں، اداکار ہے۔ باادب، باملاحظہ، ہوشیار۔ اسٹیج پر سناٹا تھا، اچانک اندھیرے کو چیرتا ہوا روشنی کی زد میں ایک شخص چلاتا ہوا اسٹیج پر آیا۔ ''یہ دنیا منچ ہے۔ ہم سب اداکار ہیں۔ اچھے اور برے، سب مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اپنی اچھائیوں کے ساتھ، اپنی برائیوں کے ساتھ۔ ہاہاہاہا۔ وہ شخص بار بار یہ بات دہراتا ہوا اسٹیج سے غائب ہو جاتا ہے۔ اسٹیج پر روشنی ہو جاتی ہے۔ میں اس شخص کو تلاش کرتا ہوں۔ نظر نہیں آتا۔ پھر دیکھتا ہوں کہ ایک بھیڑ اسے گھیرے ہوئے چلا رہی ہے، اس سے مدد مانگ رہی ہے۔ میں نے غور سے دیکھا، یہ کون ہے۔ یہ تو کاظم ہے- ڈاکٹر محمد کاظم۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد۔ واقعی یہ استاد ہے۔ ہر جگہ استادی دکھاتا ہے۔ ہر فن میں استاد ہے۔"

(ص:201-202)

ابنِ کنول نے اس ڈرامہ میں بھی اپنے فنی کمالات کا خوب خوب مظاہرہ کیا ہے۔ پروفیسر محمد کاظم کی اداکاری، ہدایت کاری، استادی، خوش مزاجی، سلیقگی، شائستگی، سنجیدگی، بے پناہ صلاحیت، قابلیت، فعالیت، ادبیت، محنت، مشقت اور ان کے فکر و فن وغیرہ پر بڑی شگفتہ مزاجی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کے کلکتہ سے دہلی تک کا سفر اور دہلی میں جے این یو سے ایم اے، ایم فل و پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کرنے، مشہور ادبی رسالہ ''آجکل'' اور دہلی یونیورسٹی میں ملازمت کرنے، ان کے اخلاق کی وجہ سے یونیورسٹی کے سیکورٹی گارڈ اور کلرک سے لے کر، طلباء، ریسرچ اسکالرز، پروفیسران و دیگر اعلیٰ عہدیداران تک کے انہیں سلامی ٹھوکنے اور اور بے پناہ اہمیت و عزت بخشنے کی صراحت نہایت پر لطف انداز میں کی ہے۔ ان کے کھانے پینے اور سیر و تفریح کے شوق و ذوق کے حوالے سے بھی کئی انکشافات کئے ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ کی حسن تربیت، بہترین و لذیذ نوع بنوع پکوان میں مہارت، گھر کی صفائی و ستھرائی کا مکمل خیال رکھنے اور ان کے حسن ذوق کی خوب خوب مدح سرائی کی ہے۔ اس خاکہ کے ضمن میں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ کے درمیان کی معرکہ آرائی اور ایک دوسرے کی غیبت کرنے کا بہت ہی بیباکانہ انداز میں بھانڈا پھوڑ بھی کیا ہے۔ نیز شعبۂ اردو کے ایک اور نہایت فعال و سرگرم اور طلباء میں بیحد مقبول استاد ڈاکٹر امتیاز احمد کی سرگرمیوں، کھانے پینے میں ان کے اعلی ذوق اور عمدہ کھانے کا نظم و نسق اور بندوبست کرنے میں ان کی مہارت کا تذکرہ بھی بہت دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

موضوع گفتگو اس کتاب (کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی) میں محمد عتیق صدیقی، محمد زماں آزردہ، ایڈووکیٹ اے رحمان، پروفیسر علی احمد فاطمی، پیغام آفاقی، اسلم حنیف، جلال انجم، فاروق بخشی، ارتضی کریم، شمس تبریزی، خواجہ محمد اکرم الدین، عظیم صدیقی، نعیم انیس اور محمد شریف کے بھی خاکے شامل ہیں۔ سب پر علیحدہ گفتگو طوالت اور قارئین کی اکتاہٹ کا باعث ہوگی، چنانچہ گفتگو کو مزید طول دیئے بغیر

حاصل مطالعہ کے طور پر عرض کروں کہ کتاب میں شامل سبھی خاکوں کی قرأت کے دوران خاکہ نگار ابنِ کنول کی تخلیقی

بصیرت، معاشرتی بصارت اور عصری حسیت کے فنکارانہ مظاہرہ کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی اظہر من الشّمس ہوتی ہے کہ خاکہ نگار نفسیات انسانی کا نباض ہے اور فلسفہ زیست سے بخوبی آگاہ بھی۔ ہر خاکہ اپنے آغاز سے اختتام تک سحر انگیز ہے۔ مسجع، مقفّٰی اور پرشکوہ عبارت سے مزین ہے۔ زبان میں لطافت، سلاست، شائستگی، شگفتگی اور سنجیدگی کا دریا متموج ہے۔ تاریخ، تنقید، تحقیق اور لطف و مزاح کا خوبصورت امتزاج ہے۔ بامحاورہ زبان، نپے تلے جملے، ضرب الامثال کا جابجا استعمال ہے۔ ہر جملہ قارئین کو آگے کے جملوں اور ہر سطر آگے کی سطور کی قرأت پر مجبور کرتی ہے۔ سطر سطر ہی نہیں، بلکہ لفظ لفظ میں خاکہ نگار کی دلی کیفیات، محسوسات اور ذہنی محرکات کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ ابنِ کنول چونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ عہد طالب علمی سے ہی ان کا رشتہ داستانوں سے بڑا گہرا، مضبوط اور مستحکم رہا ہے، اس لیے افسانوں کے علاوہ ان کی دیگر تحریروں میں بھی داستانوی اسلوب کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ مسجع و مقفیٰ الفاظ سے لیس عبارتوں سے وہ ایک خاص قسم کی فضا قائم کر کے اپنی تحریروں کو استعاراتی و طلسماتی بنانے کا بخوبی فن و ہنر جانتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریروں کا جادو قارئین کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ ابنِ کنول نے اس کتاب کی تصنیف کر کے اردو خاکوں کو نہ صرف اس کی متاعِ گم شدہ لوٹا دیا ہے بلکہ اس فن کو عروج و ارتقاء بھی عطا کیا ہے۔ لاریب یہ کتاب اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ کہلانے کی صد فیصد مستحق ہے۔ انصاف کی بات تو یہ بھی ہے کہ جس طرح تحقیقی، تنقیدی، انشائیہ نگاری اور افسانہ نگاری کے میدان میں ان کی نمایاں حیثیت مسلم ہے، بعینہ خاکہ نگاری کے مجال میں بھی ان کی امتیازی حیثیت تسلیم کی جانی چاہیے اور انہیں بحیثیت خاکہ نگار معاصر ادب کا نمائندہ، ممتاز و مستند خاکہ نگار قرار دیا جانا چاہیے۔ کتاب کی اہمیت، جامعیت، افادیت اور استنادی حیثیت کا تقاضا بھی یہی ہے!!!

(نوٹ: یہ مضمون ابن کنول کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ مدیر)

☆☆☆☆

علی گڑھ کے مشہور ہونے کی اگر کوئی وجہ ہے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ورنہ تالے، مچھر اور مکھیاں تو اور شہروں میں بھی مل جاتے ہیں۔

(علی گڑھ کا جغرافیہ)

ابن کنول بحیثیت خاکہ نگار

ڈاکٹر شاہد اقبال

B-48، شاہین باغ، ٹھوکر نمبر 7، جامعہ نگر، نئی دہلی، رابطہ: 7011719508

اردو ادب میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش اٹھارہویں صدی کے نصف دہائی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اگر تذکرے کو اردو تنقید کے اولین نقوش کہا جاتا ہے تو ہمیں ان تذکروں کو بھی خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کہنے میں کوئی حیرانی نہیں ہونی چاہیے، یہ اس لئے کہ ان تذکروں میں نہ صرف کسی تخلیق کار کے فن پر بات ہوئی ہے بلکہ اس کی سیرت وصورت کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے ساتھ ہی اس کے عادات واطوار وغیرہ کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اردو میں خاکہ نگاری کا باضابطہ آغاز فرحت اللہ بیگ کے قلم سے ہوا۔ اردو میں بہت سے خاکے لکھے گئے ہیں مگر چند خاکوں کو چھوڑ کر زیادہ تر خاکے گمنامی کے شکار ہو گئے یا پھر لوگوں نے اسے پڑھنے کے لائق ہی نہیں سمجھا۔ اس کی وجوہات کیا ہیں یہ ایک اہم سوال ہے۔ خاکہ عام طور پر ان لوگوں پر لکھا جاتا ہے جو خاکہ نگار یا راوی کے بہت قریب ہوتا ہے، اس کے علاوہ براہ راست جس کا تعلق راوی سے ہو۔ خاکہ نگار سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ حقیقت نگاری سے کام لے کر ممدوح کی منفی ومثبت پہلوؤں کو اشاروں وکنایوں میں ادا کرے۔ اردو خاکے کی تاریخ میں ایسے کئی خاکے ہیں جس میں مبالغہ آرائی اور جھوٹ کا سہارا لیا گیا ہے، اس سے خاکہ نگار اور ممدوح دونوں کی شخصیت مجروح ہوئی ہے۔

ابن کنول کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، یہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ بڑے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ محقق، شاعر، ڈرامہ نگار اور زیرک ناقد بھی ہیں۔ پچیس خاکوں پر مبنی ان کی کتاب ''کچھ شگفتگی اور کچھ سنجیدگی'' حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ ان تمام خاکوں میں ابن کنول کی شخصیت بھی جھلکتی ہے کیونکہ یہ تمام لوگ ان کے بہت قریب رہے ہیں، سب سے اہم بات انہوں نے بہت ہی ایمانداری اور بے باکی سے خاکے لکھے ہیں جس کی جو شخصیت تھی ہو بہو پیش کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ راقم بھی ان میں سے بہت سے لوگوں کو جانتا ہے جن پر خاکے لکھے ہیں۔ خاکہ نگاری ایمانداری کے ساتھ 'ہلکے پھلکے انداز' میں بیان کرنے کا فن ہے۔ یعنی نہ کسی کی بے جا تعریف کی جائے اور نہ ہی برائی۔ ابن کنول نے ان تمام باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اپنے ممدوح کے متعلق خاکہ لکھا ہے۔

اکیسویں صدی میں خاکہ نگاری کی روایت کافی ماند پڑ گئی ہے۔ اب خاکے کی جگہ پر عام طور پر خاکہ نگار تنقید اور تنقیص کر رہا ہے۔ مگر ابن کنول نے اس رجحان سے انحراف کرتے ہوئے خاکہ نگاری کی کلاسیکی روایت اور فن کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، بلکہ یہ کہا جائے کہ انہوں نے خاکہ نگاری میں پھر سے روح ڈال دی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے دلکش اندازِ بیان اور دلچسپ اسلوب کے ذریعہ ہر طرح کے قاری کو خاکہ پڑھنے پر مجبور کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر خاکہ نگار صرف ممدوح پر ہی طنز کرتا ہے، مگر ابن کنول کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے خود پر بھی طنز کیا ہے۔ خاکہ نگاری کی روایت میں خود پر طنز کرنا جدید روش معلوم ہوتی ہے، یہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ افسانوی ادب ہو یا پھر غیر

افسانوی دونوں میں تخیل اور تفکر کی کارفرمائی ضرور ہوتی ہے جس کے وجہ سے تخلیقیت جنم لیتی ہے جس سے قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے زندگی کا حصہ ہے۔ ابن کنول نے ان باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے فن کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ خاکے کے مطالعہ کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ افسانوی ادب کا حصہ ہے۔ جس شخص کا خاکہ لکھا ہے اس کے تمام پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی خیال رکھا ہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ممدوح سے قاری کو ہمدردی ہونے لگتی ہے۔

ابن کنول نے خاکہ نگاری کی روایت میں ایک ایسی تکنیک کا استعمال کیا ہے جو کہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے جس ادیب پر خاکہ لکھا ہے اس کے خصائص کو اس کے ادبی کارناموں کے نام سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً قاضی عبدالستار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب نے زندگی چاہے 'غالب' کی طرح گزاری ہو لیکن 'خالد بن ولید' کی طرح رسولِ خدا سے محبت کرتے، مجاہدانہ انداز 'صلاح الدین ایوبی' جیسا تھا۔ داراشکوہ سے گنگا جمنی تہذیب کا درس لیا تھا۔'' (ص: ۳۴)

اس کے علاوہ انہوں نے عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے تعلق سے بھی لکھا ہے اور اس انداز میں تحریر کیا ہے کہ قاری خاکہ کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اسی طرح ان کے خاکے میں منظر کشی بھی کمال کی ہے۔ ابن کنول کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے منظر کشی میں ڈرامائی عناصر پیدا کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ہم اس جگہ کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں۔

''کبھی کلکتہ، کبھی احمد آباد، کبھی جبل پور، کبھی پونا، کبھی ممبئی، کبھی بنگلہ دیش، کبھی مصر، کبھی ترکی، کبھی تاشقند، کبھی ماریشس۔ یہ آدمی ہے یا جن؟ ''ارے یہ جن نہیں، ادکار ہے۔۔ باادب، باملاحظہ ہوشیار۔'' اسٹیج پر سناٹا تھا، اچانک اندھیرے کو چیرتا ہوا روشنی کی زد میں ایک شخص چلاتا ہوا اسٹیج پر آیا۔'' ص ۲۲۶ (مشکل کشا محمد کاظم)

اس کے علاوہ انہوں نے گاہے بہ گاہے زندگی کی پیچ وخم کے ساتھ انسانی نفسیات کو بھی عیاں کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس زمانے میں پڑھا لکھا اسے ہی کہا جاتا تھا جو اللہ رسول کو برا بھلا کہے اور روزے نماز کو فضول سمجھے بلکہ بہت سے ایسے بھی تھے جو اس تعلیم کو حاصل کرنے کے بعد باپ کو خبطی سمجھنے لگتے ہیں۔'' ص: ۴۳ (قمر رئیس)

آج بھی اس طرح کے نظریات کا جم غفیر موجود ہیں جو اللہ کے وجود کو برا بھلا کہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ لوگ ان کی باتوں سے خوب محظوظ ہوتے ہیں حالانکہ وہ غلط ہوتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ابن کنول نے خاکہ نگاری کی روایت کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ آنے والی نسلیں ان ہی خاکوں سے کسی بھی ادیب کی حالات زندگی اور اس کی شخصیت سے روبرو ہو سکتے ہیں۔ خاکے کو ایک طرح سے اردو ادیبوں کے حالات زندگی کے انسائیکلو پیڈیا کہنا چاہئے کیونکہ خاکہ نگار کسی بھی ادیب کا جب خاکہ لکھتا ہے تو اس کی زندگی کے علاوہ اس کے شکل وصورت اور کارنامے کو بھی پیش کرتا ہے۔

ابن کنول نے اپنے خاکے میں ہر ممکن جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ضروری بھی ہے کیوں کہ کسی بھی اصناف ادب کو زندہ رکھنے کے لیے اس میں ہمیشہ زمانے کے حساب سے رد و بدل کرتے رہنا چاہیے اس میں نئی نئی جدت و ندرت کا

استعمال کرنی چاہیے۔ابن کنول نے بہار کے جتنے بھی ادیب پر خاکہ لکھا ہے اس میں اس کی شخصیت کے خصائص بیان کرنے کے ساتھ ساتھ صوبہ بہار کی خوبیوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے کیوں کہ ان کو معلوم ہے کہ سیتا، بھگوان مہاویر، سکھوں کے دسویں گرو، گرو گوبند سنگھ کی پیدائش سرزمین بہار ہے اس کے علاوہ بھگوان بدھ کو بھی نروان بہار ہی میں حاصل ہوا تھا، اسی طرح گپت عہد میں نالندہ یونیورسٹی دنیا میں تعلیم وتدریس کی اہم درسگاہ تھی، اس کے علاوہ اشوک، شیر شاہ سوری وغیرہ نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔اقتباس ملاحظہ ہو

''اردو ہی کیا زندگی کے ہر شعبہ پر بہار کے لوگوں کا قبضہ ہے۔منتری سے لے کر افسر تک اور سنتری سے لے کر مزدور تک، ہر صوبہ میں بہار سے ہی آتے ہیں۔بہار ہے تو بہار ہے۔۔۔۔ورنہ بہار جیسی ذہانت اور زرخیزی تو کسی صوبے میں نہیں پائی جاتی''۔ص ۱۸۸ (ارتضی کریم ہمدم دیرینہ)

ابن کنول ہر فن مولا ادیب تھے۔انہوں نے اپنے خاکوں میں کئی جگہ ڈرامائی عنصر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔فکشن ہو یا دیگر نثری اصناف اس میں ڈرامائی انداز بیان سے تحریر میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ابن کنول نے اپنی تحریر میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو

''ہیلو۔ہیلو۔۔۔۔جی السلام علیکم۔۔۔۔کہاں ہو بھئی۔۔۔۔۔جی کلکتہ میں۔۔۔ کب گئے؟۔۔۔آج صبح آیا کل انشاءاللہ واپس آجاوگا''۔۔۔۔ہیلو۔ہیلو۔۔۔۔جی السلام علیکم۔۔۔ کہاں ہو بھئی۔۔احمد آباد میں، رات آیا تھا''ص ۲۵۵ (مشکل کشا: محمد کاظم)

ابن کنول نے اپنے خاص انداز بیان (جس کو ہم داستانوی انداز بیان کہہ سکتے ہیں) سے اپنے خاکوں میں افسانوی رنگ بھر دیا ہے۔جس سے خاکوں کی قرآت میں شگفتگی پیدا ہوگئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کے خاکوں میں افسانہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

''کبھی کلکتہ، کبھی احمد آباد، کبھی جبل پور، کبھی پونا، کبھی ممبئی، کبھی بنگلہ دیش، کبھی مصر کبھی ترکی، کبھی تاشقند، کبھی ماریشش۔۔۔یہ آدمی ہے جن؟ ارے یہ جن نہیں یہ اداکار ہے۔با ادب، با ملاحظہ ہوشیار۔اسٹیج پر سناٹا تھا، اچانک اندھیرے کو چیرتا ہوا روشنی کی زد میں ایک شخص چلاتا ہوا اسٹیج پر آیا''ص ۲۲۶

اس طرح کے اور بھی کئی مثالیں ہیں جہاں ابن کنول نے اپنے دلکش اسلوب سے خاکوں میں دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ابن کنول نے اپنے خاکوں کو زندہ وجاوید رکھنے کے لئے نت نئے طریقے اور دلچسپ اسلوب کا سہارا لیا ہے جس سے ہر قسم کا قاری محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ زیر لب مسکرا کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکے کی ہر کوئی تعریف کرتا ہوا نظر آرہا ہے۔

***

''کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی'' خاکوں کا گنجینۂ گوہر

ابراہیم افسر
میرٹھ، یوپی
MOB-9897012528

اُردو ادب میں خاکہ نگاری کا با قاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کی مشہور تصنیف ''ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی'' سے مانا جاتا ہے۔اس سے قبل تذکروں میں شعرا و ادبا کے تحریری خاکے جا بجا ملتے ہیں۔لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے خاکے کو جو شہرت دوام حاصل ہوئی ویسی شہرت کسی خاکے کو نصیب نہ ہوئی۔اس خاکے کو پڑھنے کے بعد مولوی وحید الدین سلیم نے مرزا فرحت اللہ بیگ سے اپنا خاکہ لکھنے کی گزارش کی۔اس گزارش کو پورا کرنے کے لیے فرحت اللہ بیگ نے ایک خاکہ نما مضمون ''ایک وصیت کی تعمیل'' تحریر کیا۔اس کے بعد اُردو میں خاکہ نگاری کی روایت نے فروغ پایا۔مولوی عبدالحق نے ''نام دیو مالی'' اور رشید احمد صدیقی نے ''کندن'' کا خاکہ لکھ کر حاشیائی کرداروں کو جائز مقام عطا کیا۔

COVID-19 جیسی مہلک بیماری کے سبب دنیا کے بیش تر ممالک میں LOCKDOWN نافذ کیا گیا۔ ہندوستان میں بھی 24 مارچ 2020 کو حاکمِ وقت نے 21 دن کے LOCKDOWN کا اعلان کیا۔اس دوران کسی کو کہیں بھی آنے جانے اور کسی سے ملنے کی منا ہی تھی۔دو گز کا فاصلہ اور ماسک پہننا لازمی قرار دیا گیا۔لاک ڈاؤن میں اُردو ادیبوں کو گھر بیٹھ کر کام کرنے کا موقع کسی نعمت سے کم نہ تھا۔کسی نے افسانے لکھے، کسی نے شاعری کی، کسی نے تنقید میں ہاتھ آزمایا تو کسی نے تحقیقی گتھیوں کو گھر بیٹھ کر سلجھایا تو کسی نے اپنے ہم عصر ساتھیوں کو یاد کرتے ہوئے خاکے تحریر کیے۔پروفیسر ابن کنول نے بھی اسی لاک ڈاؤن میں ''کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی'' عنوان سے اپنے اساتذہ، رفیقوں اور معاصرین کے خاکے تحریر کیے۔موصوف نے کتاب کا انتساب عدالتی کارروائی سے قبل حلفی بیان کی شکل میں معنون کرتے ہوئے لکھا ''جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا یقین کریں یا نہ کریں، آپ کو اختیار ہے۔''۔موصوف نے کتاب میں شامل خاکوں کے بارے میں اپنے پیش لفظ نما ''معذرت نامہ'' میں مزید معلومات قارئین تک پہنچاتے ہوئے لکھا:

> ''اس کتاب میں جو خاکے شامل ہیں ان میں میرے قابل احترام اساتذہ ہیں، کچھ ایسی شخصیات ہیں جن سے مجھے عقیدت ہے یا جن کا میں احترام کرتا ہوں۔کچھ میرے وہ دوست ہیں جن کے ساتھ زندگی کا طویل سفر طے کیا ہے، کچھ خرد دوست ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں۔اس میں ایک خاکہ جو میں نے اپنے اسکول 'منٹو سرکل' کے صد سالہ جشن پر لکھا تھا وہ شامل ہے۔منٹو سرکل میری زندگی کا اہم حصہ ہے۔آخری خاکہ ایک ملازم پر ہے، اس کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایسی شخصیات کی کتنی ضرورت ہوتی ہے جنھیں ہم

کمتر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ان خاکوں میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں ایک ایک لفظ سچ ہے۔ میرا مقصد اپنوں کو اپنی نظر سے دیکھ کر پیش کرنا تھا، کسی کی تضحیک یا دل آزاری میرا مقصد نہیں ہے۔ میں رشتوں کو مجروح نہیں کرنا چاہتا، رشتے جو خون کے نہیں ہوتے بڑی مشکل سے بنتے ہیں۔ مجھے اپنے اساتذہ سے بھی عقیدت ہے اور مجھے اپنے دوست بھی عزیز ہیں۔اگر کہیں قلم سے لغزش ہوگئی ہو تو صمیم قلب سے معذرت خواہ ہوں۔'' (کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی، مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی، 2020، ص 11)

پرفیسر ابن کنول کی کتاب میں 25 خاکے شامل ہیں۔انھوں نے سب سے پہلا خاکہ آرٹ اور ریاضی کے اُستاد ''منشی چھٹّن'' کا تحریر کیا ہے۔اس خاکے میں موصوف نے قصبہ گنّور، اُردو میڈیم اسلامیہ اسکول اور دیگر اساتذہ کی دل چسپ یادیں قارئین کے سامنے پیش کی ہیں۔یادِ ماضی کے اوراق کو پلٹتے ہوئے ابن کنول قارئین کو اس زمانے میں لے جاتے ہیں جہاں صرف صداقت اور سچائی کا بول بالا تھا۔اپنے اُستاد کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی انھوں نے طشت از بام کیا ہے۔ابتدائی زمانے میں اپنے اُستاد سے پڑھا ہوا سبق وہ اب تک نہیں بھولے ہیں۔گنّور سے دہلی آئے ہوئے انھیں ایک زمانہ ہوگیا ہے لیکن ان کی یادوں میں اپنے مہرباں و مشفق اُستاد کی تصویر گردش کرتی رہتی ہے:

''دہلی میں آئے ہوئے بھی چار دہائیوں سے زیادہ وقت گزر گیا، لیکن چھٹّن منشی جی کا چہرہ اور ان کی باتیں اب بھی یاد ہیں۔سنا ہے بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔میرے ذہن میں وہ ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ان کی وہی صورت اور وہی مشفقانہ باتیں مجھے یاد دلاتی رہتی ہیں۔انسان بچھڑ جاتا ہے لیکن اس کا کردار اسے زندہ رکھتا ہے۔چھٹّن منشی جی ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے۔'' (ایضاً، ص 16)

''منٹوسرکل'' خاکے میں پروفیسر ابن کنول نے اپنی ابتدائی تعلیم کے گہوارے کو قلمی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔اس خاکے میں منٹوسرکل کی سنہری یادوں کو قلمی قالب پہنایا گیا ہے۔اس خاکے میں موصوف نے ایماندارانہ طریقے سے اپنی حرکت و عمل کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔خاکے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ منٹوسرکل کی تعلیم و تربیت کا اثر اب تک ان کے ذہن میں نقش ہے۔

پدم شری قاضی عبدالستار کے خاکے میں پروفیسر ابن کنول نے اپنے افسانہ نگار بننے کی روداد کے علاوہ قاضی صاحب کی پروقار شخصیت کا ایسا نقشہ کھینچا گویا قاضی صاحب ہمارے سامنے چہل قدمی کر رہے ہوں۔خاکے کی ابتدا میں ہی موصوف نے فکشن بالخصوص افسانوں کے بارے میں قاضی صاحب کے اقوال کو نقل کیا ہے۔قاضی صاحب کی سرپرستی میں جن نوجوان افسانہ نگاروں نے فکشن کی دنیا میں قدم رکھا انھیں قاضی صاحب کے گروہ کا آدمی تسلیم کیا گیا۔ ابن کنول نے تو باقاعدہ قاضی صاحب سے افسانے لکھنے کا ہنر سیکھا تھا۔قاضی صاحب کے عادات و اطوار کا بیان بھی دل چسپ ہے۔افسانے کی طرح ان میں جزئیات نگاری سے کام لیا گیا ہے۔موصوف کے گھر میں زیتون کے تیل کے استعمال کی بات بہت معمولی تھی لیکن قاضی صاحب

کی محبت کا یہ عالم تھا کہ انھیں فون پر اس کے نقصان بتا دیتے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے قاضی صاحب کے اہم افسانوں اور ناولوں کو ایک لڑی میں پروتے ہوئے لکھا:

''قاضی صاحب نے زندگی چاہے ''غالب'' کی طرح گزاری ہو، لیکن ''خالد بن ولید'' کی طرح رسولِ خدا سے محبت کرتے تھے، مجاہدانہ انداز ''صلاح الدین ایوبی'' جیسا تھا، ''داراشکوہ'' سے گنگا جمنی تہذیب کا درس لیا تھا۔ وہ ''شب گزیدہ''، فن کار ''غبار شب'' میں بھٹکتے ہوئے ''بادل'' کو ''مجّو بھیا'' کا پیغام دیتا تھا کہ اب کسی ''حضرت جان'' کا ''پہلا اور آخری خط'' نہیں آئے گا۔ ''رضو باجی'' کی ''آنکھیں'' پتھرا گئیں۔ ''پیتل کا گھنٹہ'' بس ''ایک کہانی'' بن چکا تھا۔ ''نیا قانون'' آنے کے بعد ''میراث'' میں بس ایک ''دیوالی'' کا دیا بچا تھا جو ''لالہ امام بخش'' نے ''ٹھاکر دوارے'' کی ''مالکن'' کے آگے رکھ دیا تھا، جس کی مدھم روشنی سے ''تاجم سلطان'' کا حسن دمک رہا تھا، لیکن ''بھولے بسرے'' کبھی ''مجریٰ'' ہوتا تھا۔'' (ایضاً، ص34 تا35)

پروفیسر قمر رئیس کے خاکے میں موصوف نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے موصوف کی تعلیم و تربیت کا انتظام دہلی یونی ورسٹی میں کیا تھا۔ پروفیسر قمر رئیس نے موصوف کی قدم قدم پر اپنی اولاد کی طرح تربیت کی۔ اس خاکے کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر ابن کنول کی شخصیت، ذہنی تربیت اور دال روٹی اور گوشت بوٹی کے بندوبست میں قمر رئیس کا بہت بڑا کردار ہے۔ قمر رئیس، کئی مرتبہ بٹلہ ہاؤس ابن کنول سے ملنے جاتے تھے۔ 1990 میں جب دہلی میں فرقہ وارانہ تناؤ ہوا تو قمر رئیس وِویک وہار سے بٹلہ ہاؤس ابن کنول کے پاس رہنے کے لیے آئے تھے۔ موصوف نے اس خاکے میں قمر رئیس کے کئی واقعات قلم بند کیے ہیں جنھیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ طلبہ سے کتنی محبت کرتے تھے۔ کمیونسٹ نظریات کے حامی ہونے کے باوجود یا اللہ سے دور نہیں تھے۔ 1986 میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جبلی تقریبات کو کامیاب بنانے والے بھی قمر رئیس ہی تھے۔ گوپی چند نارنگ اور قمر رئیس کی ادبی چشمک کسی سے چھپی نہیں لیکن اس کے باوجود دونوں ادبی بزرگ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ابن کنول نے قمر رئیس کی پروقار شخصیت کو قلمی جامہ پہناتے ہوئے لکھا:

''قمر صاحب کی شخصیت بہت پُرکشش تھی۔ دلیپ کمار کی طرح خوب صورت پٹھان تھے، دراز قد، نکھرتا رنگ، چمک دار مسکراتی آنکھیں، پیشانی پر لہراتے سیاہ بال، جنھیں تھوڑی تھوڑی دیر میں اُنگلیوں سے اوپر کرتے، خاموش رہتے تو صوفیانہ استغراق، بولتے تو بلبل کی سی چہچہاٹ۔ علی گڑھ میں مجھے قاضی صاحب کی سرپرستی حاصل تھی، دہلی میں قمر رئیس جیسا شفیق انسان مل گیا۔'' (ایضا، ص42)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے خاکے میں ابن کنول نے ان کی ذہانت اور دانش وبینش کے قلمی نقشے صفحۂ قرطاس پر کھینچے ہیں۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کیرانہ سے دیوبند، یہاں سے اسار امسلم انٹر کالج، پھر علی گڑھ، اس کے بعد دہلی یونی ورسٹی، پھر جامعہ ملیہ

اسلامیہ اور آخر میں دہلی یونی ورسٹی سے رٹائرمنٹ کے سفر کو موصوف نے اس طرح بیان کیا گویا ہر واقعہ کے ہم چشم دید گواہ ہوں۔ پرانی دہلی کے محلہ چوڑی والان میں ان کی رہایش تھی۔ ابن کنول ان کی طرزِ رہایش کے بارے میں کہتے ہیں کہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے گاؤں دیہات میں بچپن گزارا تھا، لیکن دہلی آنے کے بعد بھی اس میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی۔ یہ جس مکان میں رہتے تھے وہ کافی لمبا چوڑا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہی وہ طالب علموں کو مشورہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سے طالب علم ان کے گھر پر ہی آ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر چلے گئے۔ ابن کنول نے بھی اپنا ایم فل اور پی ایچ ڈی کا مقالہ انھیں کی زیر نگرانی مکمل کیا تھا۔ علوی صاحب کے اندر تحقیقی و تنقیدی اور شعری ذوق ابتدا سے ہی تھا۔ پرانی دہلی سے والہانہ شغف اور ان کی انکساری کے بارے میں ابن کنول لکھتے ہیں:

> ''علوی صاحب دہلی آ کر دہلی کے ہی ہو رہے۔ جن گلیوں میں ذوق اور غالب بستے تھے وہیں قیام کیا۔ دہلی کی گلیوں سے ذوق کی طرح محبت ہو گئی۔ پچاس سال سے زیادہ وقت عمر کا دہلی میں گزارا، لیکن شاہ جہان آباد کی فصیل سے باہر نہ گھر کرایے پر لیا اور نہ بنایا، جب کہ کتنے ہی دہلی والے دہلی اور اس کی تہذیب سے محبت کا دعوا کرتے رہے لیکن دہلی سے بے وفائی کر کے جمنا پار جا بسے۔ علوی صاحب نے دہلی کی تاریخ و تہذیب پر خصوصی توجہ دی اور اس کی تہذیبی اقدار کو محفوظ کرنے کی حتی الامکان کوشش بھی کی۔۔۔۔ علوی صاحب کی رہایش دہلی کی شاہی جامع مسجد سے تھوڑے فاصلے پر چوڑی والان کی خلیق منزل میں تھی۔ پرانے زمانے کی بنی حویلی کے ایک حصے میں علوی صاحب اپنی کتابوں کے بیچ محو مطالعہ رہا کرتے تھے۔ چوڑی والان میں رہنے کی وجہ سے علوی صاحب کو چوڑی والیوں سے محبت تھی۔ چوڑی والیاں بھی ان کی علمیت اور بھولے پن کا بہت فائدہ اُٹھاتی تھیں۔'' (ایضاً، ص 63)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خاکے میں ابن کنول نے اپنے قلم سے مختلف رنگ بھرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ 1995 میں جب دہلی یونی ورسٹی سے نارنگ صاحب سبک دوش ہوئے تو ان کے اعزاز میں ''ارمغانِ نارنگ'' کا ڈول ڈالا گیا۔ اسی کے بعد ابن کنول نے اپنے رشتوں کو نارنگ صاحب سے جوڑنے کا کام شروع کیا۔ ابن کنول لکھتے ہیں کہ نارنگ صاحب سے بہت سے لوگوں کا نظریاتی اختلاف تھا لیکن اس کے باوجود بھی ان کے معترضین ان کی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے ساتھ مل کر انھوں نے دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کو بامِ عروج بخشا۔ نارنگ صاحب سے قبل ساہتیہ اکیڈمی کا صدر کوئی اُردو والا نہیں بن پایا تھا۔ لیکن نارنگ صاحب نے اپنی محنت، جستجو اور لگن کے سبب وہ مقام حاصل کیے جنھیں حاصل کرنے کے لیے لاکھ جتن کرنے پڑتے ہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے رٹائرمنٹ کے بعد نارنگ صاحب ہی اکیلے شخص ہیں جنھوں نے ان کی جگہ کو پُر کیا۔ لیکن نارنگ صاحب کے رٹائرمنٹ کے بعد دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں وہ جگہ آج بھی خالی ہے۔ کیوں کہ گوپی چند نارنگ جیسا دوسرا آدمی ابھی تک نہیں مل پایا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی ادبی خدمات اور ان کی اُردو

دوستی کے بارے میں پروفیسر ابن کنول رقم طراز ہیں:

''ہم ذاتی یا نظریاتی اختلافات رکھتے ہوں، لیکن یہ سچ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اُردو زبان کے لیے اور اُردو ادب میں جو کام انجام دیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی کی صدارت کے عہدے تک کسی اُردو والے کا پہنچنا ہی معجزہ ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی میں نارنگ صاحب کی وجہ سے ہی اُردو کو منفرد مقام حاصل ہے۔ پسند اور ناپسند ہر شخص کی ہوتی ہے۔ ہم بھی اگر اس عہدے پر ہوتے تو اپنی مرضی کے کنوینر بناتے اور اپنے چاہنے والوں کو ایوارڈ سے نوازتے۔ یہ تو انسانی فطرت ہے، اس کی شکایت غیر انسانی ہے۔ نارنگ صاحب کو جاننا ہے تو ان کی انسانی کمزوریوں کو ہٹا کر دیکھیے۔ خالص اُردو کے ادیب کے طور پر دیکھیے، تب ان کے قد کا اندازہ ہوگا۔'' (ایضاً، ص 78)

صوفی شاعر عنوان چشتی کے خاکے میں موصوف نے ان کی اُستادی کے علاوہ صوفیانہ مزاج اور شاعرانہ کاوشوں سے قارئین کو روبرو کرایا ہے۔ ابن کنول نے پروفیسر عنوان چشتی کی ادبی خدمات بالخصوص تنقیدی صلاحیتوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مدرس کے ساتھ عنوان چشتی منگلور میں درگاہ حضرت شاہ سید عثمان جہاں گیر کے سجّادہ نشیں بھی تھے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ تنقید میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ تصوف ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ ادب اور روحانیت سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ بقول ابن کنول ایک وقت ایسا بھی آیا جب عنوان چشتی نے ادبی مشاغل سے تقریباً کنارہ کرلیا اور خانقاہ آباد کرلی۔ پہلے ان کی نگاہ میں ادب قدر اول تھا اور تصوف قدر دوم، بعد میں یہ صورت حال ہوئی کہ تصوف قدر اول ہوگیا اور ادب قدر دوم۔

حیات اللہ انصاری کے بارے ابن کنول نے جو باتیں لکھی ہیں وہ کافی اہم ہیں۔ انصاری صاحب مجاہدِ آزادی کے ساتھ صفِ اوّل کے صحافی بھی تھے۔ کانگریس کے ترجمان اخبار ''قومی آواز'' کے وہ مدیر تھے۔ انھوں نے ''دس دن میں اُردو'' سیکھنے کا قاعدہ بھی لکھا تھا۔ علاوہ ازیں حیات اللہ انصاری ایک کامیاب فکشن نگار تھے۔ پریم چند کی روایت کو آگے بڑھانے میں انھوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ممبر پارلیامنٹ کی حیثیت سے انھوں نے اُتر پردیش میں اُردو کو جائز مقام اور حق دلانے کے لیے آواز بلند کی اور اس کے لیے انھوں نے بیس لاکھ لوگوں کے دستخط کرا کر صدر جمہوریہ کے پاس ارسال کیے۔ کمیونسٹ نظریات کے حامی ہونے کے باوجود انھوں نے تاعمر گاندھیائی نظریات کی پاسداری کی۔ ابن کنول نے ان کے افسانے ''آخری کوشش'' کو پریم چند کے افسانے ''کفن'' پر ترجیح دی ہے۔

''عصمت آپا'' کے خاکے میں ابن کنول نے لکھا ہے کہ ان کی وضع قطع کی وجہ سے انھیں فلم ''جنون'' میں ایک اہم کردار ملا۔ اُردو کے بڑے افسانہ نگاروں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی کے بعد عصمت کا نام لیا جاتا ہے۔ ابن کنول کے عصمت آپا سے تعلق علی گڑھ کے زمانے سے تھے۔ عصمت آپا بھی اپنے آپ کو عبداللہ ہال کی کمسن لڑکی سمجھتی

تھیں۔ جب وہ علی گڑھ آتیں تو نو جوان افسانہ نگاران سے افسانے کی فنی باریکیوں پر خوب باتیں کرتے۔ لیڈی چنگیز خاں بھی نئے لکھنے والوں کو کارآمد اور مفید مشورے دیتیں۔ ایک بار جب ابن کنول نے ان سے معلوم کیا کہ آپ تو ترقی پسند افسانہ نگار ہیں لیکن رومانی اور فلمی رسالوں کے لیے بھی لکھتی ہیں؟ انھوں نے برجستہ کہا:

''میں اپنے ساتھ بہت سے قلم رکھتی ہوں، جس رسالے کو جس طرح کے افسانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کا قلم اُٹھاتی ہوں اور افسانہ لکھ دیتی ہوں۔ ایک نظریے میں بندھ کر افسانہ نہیں لکھا جاتا۔ ہر طرح کے تجربات ہونے چاہئیں۔'' (ایضاً، ص 98)

محمد عتیق صدیقی کے خاکے میں ابن کنول نے ایک ایسے ادیب کے درد کو ساجھا کیا جس کے سامنے ان کی کتاب ''گل کرسٹ اور اس کا عہد'' کو دوسرے ہم نام لوگوں نے اپنے نام سے متعارف کرایا۔ ابن کنول سے ان کا تعارف ان کے تحقیقی مقالے کی وجہ سے ہوا۔ عتیق صدیقی نے جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جیل میں ہی انھوں نے ''دی عرب اوکینگ'' کتاب لکھی جسے ''رسالہ نگار'' میں شائع کرایا۔ انھوں نے انڈین ائیر فورس اور انڈین آرمی ایلائنسز میں بھی کام کیا۔ عتیق صدیقی نے تاعمر اُردو کے فروغ کے لیے کام کیے۔

''عینی آپا'' کے خاکے میں ابن کنول نے قرۃ العین حیدر کی شخصیت اور ان کے رتبے پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ابن کنول لکھتے ہیں کہ عینی آپا کے پاس کوئی شخص اس لیے نہیں جاتا تھا کہ کہیں ''وہ آگ کا دریا'' بن کر برس نہ پڑیں۔ جب کہ عینی آپا کی شخصیت اس کے متضاد تھی۔ وہ دوٹوک بات کرنے والی خاتون تھیں۔ بے شک انھوں نے اُردو میں لکھا لیکن مغربی طرزِ روش ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انگریزی کتابیں پڑھنا، انگریزی میں باتیں کرنا انھیں بہت پسند تھا۔ اس کی خاص وجہ ان کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ انگریزی میں ہونا تھا۔ ادبی ماحول انھیں گھر سے ہی ملا۔ والد سجاد حیدر یلدرم اور والدہ نذرِ سجاد حیدر اُردو کے مایہ ناز ادیب تھے۔ آزاد خیالی ان کے روح میں سرایت کر چکی تھی۔ دورانِ انٹرویو اگر سوال ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا تو وہ اناپ شناپ بولنے لگتی تھیں۔ لیکن ابن کنول سے ان کی ملاقاتیں اور باتیں خوش گوار ماحول میں ہوتیں۔ جب بھی عینی آپا ان سے ملتیں تو بڑی ہی مشفقانہ انداز کے ساتھ پیش آتیں۔ عینی آپا کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ انھیں اپنے لکھے پر بات کرنا پسند نہیں تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ صاحب سوال پہلے ان کے لکھے کو پڑھے اور ناقدین سے گفتگو کرے۔ ابن کنول کا یہ بھی ماننا ہے کہ عینی آپا مغرور نہیں تھیں بل کہ انھیں مغرور سمجھ لیا گیا۔

''شگفتہ مزاج محمد زماں آزردہ'' کا خاکہ بہت ہی معلوماتی اور دل چسپ ہے۔ پروفیسر زماں آزردہ کے بارے میں ابن کنول کا خیال ہے کہ ان کے تھیلے میں قسم قسم کے میوے بھرے رہتے ہیں اور دوستوں کو باری باری سے ان کا ذائقہ چکھاتے ہیں۔ زماں صاحب کو فوٹو گرافی کا شوق ابتدا سے ہے۔ ماریشس اور لندن کے سفر کے دوران کے حیرت انگیز واقعات کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زماں صاحب مناظرِ قدرت کے علاوہ مناظرِ چشم کے بھی شوقین ہیں۔ صوم و

صلاۃ کی پابندی انھوں نے سفر میں بھی کی اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کی۔زماں صاحب دورانِ سفر سنجیدہ نہیں ہوتے بل کہ ماحول کو خوش گوار بنانے کی ممکن کوشش کرتے ہیں۔مرزا سلامت علی دبیر پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے باعث زماں آزردہ نے لکھنؤ کی گلیوں کی خاک بھی چھانیں۔لیکن شاعری کے مقابلے میں ان کے انشائیے خاصے کی چیز ہیں۔ابن کنول کی زماں آزردہ سے 1984 میں پہلی ملاقات کشمیر یونی ورسٹی میں انٹرویو کے دوران ہوئی۔موصوف کی نظر میں زماں آزردہ کی داڑھی ان کی شگفتگی اور سنجیدگی کا حسین مرقع ہے۔

ایڈوکیٹ اے۔رحمن کے خاکے میں ابن کنول لکھتے ہیں کہ جب میں نے پہلی مرتبہ انھیں دیکھا تو پہلی ہی نظر میں وکیل عبدالرحمن مجھے کسی پڑھے لکھے فقیر کی مانند لگے جو زور زور سے چیخ کر اپنا حق مانگ رہا ہے۔لیکن ابن کنول کے سامنے حقیقت آنے کے بعد ان کی شخصیت اور علم دوستی کے سبب ان سے بار بار ملنے کو دل چاہا۔ان کی اُردو نوازی کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں کہ ان کی اُردو زبان کے لیے کوششیں لائقِ تحسین اور لائقِ احترام ہیں۔عالمی اُردو ٹرسٹ کے ذریعے انھوں نے اُردو کی کتابوں کو پاکٹ سائز میں شائع کیا۔اخبارات اور رسائل میں اُردو کی بقا کے لیے کالم نویسی ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔اپنی پہلی ملاقات کا منظر اور اے۔رحمن کی شخصیت کا جو خاکہ ابن کنول نے کھینچا ہے اسے ایک بار ضرور پڑھنا چاہیے:

> ''انجم عثمانی سے بات چیت کے دوران ایک عجیب حلیے کا آدمی داخل ہوا، بڑے بڑے بال بڑھی ہوئی داڑھی، آتے ہی اتنی بلند آواز میں قوت کے ساتھ سلام کیا جیسے سلام کیا کیا ہو، سلام دے کر مارا ہو، اگر جسم پر معقول اور نفیس لباس نہ ہوتا تو میں واقعی سمجھتا کہ کوئی بد دماغ فقیر ہے۔ایسے فقیروں کی چیخ کر بولنے کی عادت ہی ہوتی ہے۔وہ تیز آواز سے لوگوں کو ڈراتے بھی ہیں اور یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا براہ راست اللہ تعالی سے قریبی تعلق ہے۔میں نے سوچا کہ کوئی پڑھا لکھا فقیر ہے۔چیخ کر اس لیے بولتا ہے کہ عادت سے مجبور ہے۔'' (ایضاً، ص128)

''آخری ترقی پسند: علی احمد فاطمی'' خاکے میں موصوف نے پروفیسر علی احمد فاطمی کی علمی و ادبی شخصیت کے علاوہ ان کے اسفار و سمینار پر بھی گفتگو کی ہے۔ابن کنول لکھتے ہیں کہ علی احمد فاطمی کے نام کی وجہ سے یہ دونوں جگہ (شیعہ اور سنّی) کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔سید احتشام حسین نے بھی ان کے نام کی وجہ سے دھوکا کھایا اور ایم۔اے اُردو میں کرنے کا مشورہ دیا۔علی احمد فاطمی الہ آباد یونی ورسٹی میں پروفیسر سید عقیل رضوی کے شاگرد تھے لیکن علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ان کے لیے دانش گاہِ ثانی کے مانند تھی۔ترقی پسند نظریات کے حامی لوگوں سے ملنا ان کا شغل تھا۔فاطمی صاحب کی پی ایچ ڈی مکمل بھی نہ ہوئی تھی لیکن انھوں نے ''بیس کہانیوں کا انتخاب'' شائع کرا اپنے آپ کو بہ طور ناقد پیش کیا۔سینٹ جانس کالج آگرہ میں ملازمت کے بعد سید عقیل رضوی کی بدولت الہ آباد یونی ورسٹی میں اُستاد مقرر ہوئے۔یہیں سے بہ حیثیت پروفیسر رٹائر بھی ہوئے۔ابن کنول، فاطمی صاحب کی علمیت اور ادبیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سمیناروں میں خوب شرکت کرتے ہیں۔لیکن کسی سمینار میں جانے سے قبل مقالہ

تیار کرنا آسان نہیں۔ وہ اپنے طلبہ کے خیال کے علاوہ ان کی ترقی کے لیے ہمیشہ فکر مند بھی رہتے ہیں۔ دہلی میں منعقد ہونے والے سمیناروں میں اپنے شاگردوں کو ذاتی خرچوں پر ساتھ لاتے ہیں۔

''مالک مکان: پیغام آفاقی'' کے خاکے میں موصوف لکھتے ہیں کہ پیغام آفاقی اُردو ادب کا باقاعدہ طالب علم نہیں تھا۔ بل کہ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے انھیں اُردو ادب میں دل چسپی پیدا ہوئی۔ یہ دل چسپی ان کا شوق اور جنون بن گئی۔ پیغام آفاقی نے سول سروس میں جانے کے بعد اپنے شوق کو مزید پروان چڑھایا۔ شاعری (شعری مجوعہ درندہ) اور فکشن (پلیتہ، مکان وغیرہ) میں نام پیدا کیا۔ پیغام آفاقی جب تک علی گڑھ میں رہے انھیں قاضی عبدالستار کے علاوہ اپنے ہم خیال لوگوں کا ساتھ ملا۔ آئی پی ایس ہونے کے باوجود ان کی شخصیت ادبی تھی۔ ابن کنول لکھتے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کی سب سے زیادہ مدد کرنے والا پیغام آفاقی ہی تھا۔ موصوف نے ان کی ادبی اور سماجی مدد کے کئی قصے اس خاکے میں بیان کیے ہیں۔ پیغام آفاقی نے اُردو کی ترویج واشاعت کے لیے کئی ڈاکیومینٹری فلمیں بھی بنائیں۔ ایک فلم میں تو ابن کنول نے بھی کردار ادا کیا تھا۔

''ڈاکٹر جلال انجم'' کے خاکے میں ابن کنول نے ایسے ایسے قصے تحریر کیے ہیں قارئین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائیں۔ میرٹھ، لال قلعہ اور بہادر شاہ ظفر کے تعلق سے موصوف نے سنجیدہ اور شگفتہ باتیں لکھی ہیں۔ موصوف سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ابن کنول اپنے دوستوں کے ہم راہ ان کی شادی میں میرٹھ تشریف لے گئے۔ جلال انجم کے گلے میں پڑے نوٹوں کے ہار سے دہلی سے میرٹھ تک کا کرایہ وصولا۔ جلال انجم کو کھانا بنانے کا بہت شوق تھا۔ جلال انجم دہلی حکومت میں اُستاد کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ابن کنول اس وقت دہلی یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ دونوں کی رہایش بٹلہ ہاؤس میں تھی۔ یار لوگ روزانہ جمع ہوتے اور ادبی محفلیں خوب جمتی تھیں۔ ابن کنول لکھتے ہیں کہ سینٹ اسٹیفن ہسپتال میں جلال انجم نے آخری سانس ان کے سامنے لی۔ انھوں نے جلال انجم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ شعر درج کیا:

وہ گیا جس سے بزم تھی روشن
شمع جلتی ہے، کیوں شبستاں میں

''ترقی پسند رومانی شاعر: فاروق بخشی'' خاکے میں موصوف نے فاروق بخشی کی شاعری اور تنقید پر بے باک رائے کا اظہار کرنے کے علاوہ ان کے ساتھ مشاعروں میں گزارے گئے اوقات کا تذکرہ شگفتہ اور دل چسپ انداز میں کیا ہے۔ اُردو اکادمی دہلی کی جانب سے لال قلعہ میں منعقد مشاعرے کی روداد ابن کنول صاحب نے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد رات کے دو بجے لال قلعے سے بٹلہ ہاؤس تک فاروق بخشی کے ساتھ جلال انجم، شمس تبریزی اور خود ابن کنول پیدل مارچ کرتے ہوئے آئے۔ راستے بھر صرف مشاعرے کی واہ واہ کا تذکرہ تھا۔ لیکن فاروق بخشی کو پیدل چلنے والے ساتھیوں کی آہ کا احساس نہیں تھا۔ فاروق بخشی سے ابن کنول کی پہلی ملاقات دہلی جامع مسجد واقع مکتبہ جامعہ کے دفتر میں

ہوئی تھی۔فاروق بخشی کی علم دوستی کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں کہ انھیں لکھنے کے ساتھ ''ادب کرنے'' پر یقین ہے۔اپنی نوجوانی کے دنوں میں انھوں نے ''قلم زاد'' نامی تنظیم کا ڈول ڈالا تھا۔اس خاکے میں موصوف نے ان کی عشق مزاجی ،رومانی شاعری اور شعر سنانے کے فن پر طوالت کے ساتھ لکھا ہے۔

''ارتضیٰ کریم: ہمدم دیرینہ'' خاکے میں ابن کنول نے پروفیسر ارتضیٰ کریم کی شخصیت کے ہر پہلو پر قلمی باتیں کی ہیں۔در اصل دہلی یونی ورسٹی میں ارتضیٰ کریم کو ایم۔فل اور پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کا مشورہ ابن کنول نے ہی دیا تھا۔یہیں سے ان دونوں کی دوستی پروان چڑھی۔لیکن ارتضیٰ کریم ،ابن کنول کو رسالہ'' آہنگ'' میں کام کرنے کی وجہ سے پہلے سے ہی جانتے تھے۔اس رسالے میں ابن کنول کے کئی افسانے شائع ہو چکے تھے۔ارتضیٰ کریم میں احتجاجی رنگ و آہنگ ابتدا سے ہی تھا۔غالب انسٹی ٹیوٹ ،نئی دہلی میں منعقدہ ہونے والے سمیناروں میں طلبہ کو سب سے بعد میں کھانا دیا جاتا تھا۔اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے والے ارتضیٰ کریم ہی تھے۔ارتضیٰ کریم کی ادبی سرگرمیوں اور فعالیت کے سبب انھیں وہ سب کچھ حاصل ہوا،جس کا خواب ہر انسان دیکھتا ہے۔ان کی ادبی سرگرمیوں اور فعالیت کی وجہ سے اساتذہ کی نظر میں ان کا قد دن رات بڑھتا گیا۔بہار سے دہلی آنے کے بعد ارتضیٰ کریم نے کبھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ارتضیٰ کریم کی تصنیفات اور ترتیب شدہ کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ابن کنول لکھتے ہیں کہ ان کی کتابوں کا وزن پچاس کلو سے بھی زیادہ وہوگا۔اور سوتے وقت بھی ان کا دماغ چلتا ہے۔اپنی ترقی کے راستے تلاش کرنے میں جاگتا رہتا ہے۔وہ دن اور رات میں کم از کم تیس گھنٹے کام کرتا ہے۔موصوف کے رشتے ارتضیٰ صاحب سے کھٹّے اور میٹھے رہے ہیں۔نظریاتی اختلاف کے باوجود ابن کنول لکھتے ہیں:

> ''ارتضیٰ کریم سے ہمارے تعلقات اچھے رہے ہوں یا بُرے،تقریباً تین کم چالیس سال کے ہو گئے ہیں۔ اس طویل عرصے میں رشتے خوش گوار بھی رہے اور تلخ بھی،لیکن بدکلامی کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو کچھ بھی کہا ہو،لیکن سامنے کبھی کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ رشتوں میں کھٹاس ہے۔در اصل ارتضیٰ کریم کا اور میرا پیشہ ایک ہوتے ہوئے بھی راستے الگ ہیں۔مزاج بھی الگ ہیں۔میں یونی ورسٹی کی ملازمت سے مطمئن ہوں،کہیں چھوٹے بڑے عہدے پر جانا نہیں ،یہیں سے ان شاء اللہ گھر واپسی ہوگی۔اس کی طبیعت میں بے چینی ہے،دل میں ہزاروں خواہشیں ،ہر خواہش پہ دم نکلتا ہے۔ارتضیٰ نے یونی ورسٹی کی ملازمت کو کافی نہیں سمجھا ،بل کہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اور بھی بہت کچھ کیا۔ ''(ایضاً،ص،198)

''گیسو دراز: شمس تبریزی'' خاکے میں ابن کنول نے شمس تبریزی کے بال،ان کی چال اور ان کی ڈھال پر خامہ فرسائی کی ہے۔موصوف لکھتے ہیں کہ جب میں علی گڑھ میں طالب علم تھا تب سے تبریز نامی اشخاص ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن گئے ۔دہلی میں آنے کے بعد بھی شمس تبریزی نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔دراصل دہلی میں جس شمس تبریزی سے ان کی ملاقات ہوئی وہ

قومی آواز میں نائب مدیر اور اچھے شاعر بھی تھے۔ موصوف انھیں شام کے وقت اپنے افسانے سنانے کے فراق میں رہتے تھے لیکن شمس تبریزی دوپہر کے دو بجے گھر سے دفتر نکل جاتے اور دیر رات واپس آتے۔ انھوں نے دہلی یونی ورسٹی میں ارتضیٰ کریم کے ساتھ شمس تبریزی کو بھی داخلہ لینے پر آمادہ کیا۔ یہاں تک کہ شمس تبریزی کا ایم فل کا فارم اور فیس ابن کنول نے جمع کیے۔ شمس تبریزی کا تعلق اٹاوہ سے تھا۔ بلا کے ذہین تھے۔ ہمیشہ قلندرانہ زندگی گزاری۔ قناعت پسندی ان کا شیوہ تھا۔ اپنی شاعری کا کوئی ضخیم کلیات تیار نہیں کیا۔ البتہ انتخاب ضرور تیار کیا تھا۔

''نصف صوفی: خواجہ محمد اکرام الدین'' خاکے میں ابن کنول نے خواجہ احمد فاروقی کو دہلی کا تیئسواں خواجہ اور خواجہ محمد اکرام الدین کو چوبیسواں خواجہ قرار دیا ہے۔ حالاں کہ دہلی کو ''بائیس خواجاؤں کی دہلی'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ابن کنول لکھتے ہیں کہ خواجہ محمد اکرام الدین نے مدرسہ شمس الہدیٰ میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ذاتی طور پر میٹرک کا امتحان اپنے والد کی اجازت کے بغیر پاس کیا۔ خواجہ اکرام الدین، دہلی یونی ورسٹی میں پانچ سال تک رہے۔ دہلی یونی ورسٹی میں ان کا تقرر ریسرچ ایسوسی ایٹ کے طور پر پروفیسر عبدالحق کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کے بعد پروفیسر وہاب اشرفی نے ان کا تقرر بہ حیثیت استاد رانچی میں کیا۔ لیکن ان کے جے این یو کے استاد پروفیسر نصیر احمد خاں نے انھیں رانچی سے واپس بلا کر جے این یو میں مستقل طور پر اسسٹنٹ پروفیسر بنا دیا۔ ابن کنول نے ان کے غیر ملکی اسفار کے کلومیٹر کی تعداد کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ موجودہ دور کے ابنِ بطوطہ سے کم نہیں ہیں، جتنے اسفار انھوں نے کیے ہیں اتنے تو ابنِ بطوطہ نے بھی نہیں کیے ہوں گے۔ جب یہ قومی کونسل برائے فروغِ اُردو کے سربراہ تھے، تب انھوں نے اُردو زبان و ادب کو نئی ٹیکنولوجی سے روشناس کرایا۔ قومی کونسل سے نایاب و نادر کتابیں شائع کرائیں۔ اُردو کے فروغ کے لیے انھوں نے کئی اہم ورک شاپ اور سمینار کا انعقاد بھی کیا۔ موجودہ دور میں WORLD URDU ASSOCIATION کے ذریعے اُردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ ابن کنول نے خواجہ اکرام الدین کی اس تیز رفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''1996 میں پی ایچ ڈی کیا اور 2013 میں پروفیسر ہو گئے، جب کہ بہت سے 1990 میں پی ایچ ڈی کرنے والے اسسٹنٹ پروفیسر ہونے کی خواہش میں گھوم رہے ہیں۔ احباب کو شبہ ہونے لگا کہ ضرور کوئی غیبی طاقت ہے، جو ان کی مستقل مدد کر رہی ہے، ورنہ تو دیکھنے میں ایسی کوئی پُر وقار شخصیت نہیں ہے کہ آدمی انھیں دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو جائے ۔۔۔۔۔۔ ہو نہ ہو کوئی غیبی قوت ہی ہے جو جاپان سے امریکہ تک اور ہالینڈ سے مصر اور ماریشس تک سب کو خواجہ خواجہ کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ یعنی ایران اور توران سب جگہ خواجہ ہی خواجہ ہے۔ کچھ تو ان کی علمیت اور ادبیت کے قائل ہیں اور کچھ ان کی خواجگی کے۔'' (ایضاً، ص 220)

''مشکل کشا: محمد کاظم'' خاکے میں ابن کنول لکھتے ہیں ڈاکٹر کاظم کا ایک پیر دہلی میں اور دوسرا کلکتہ میں رہتا ہے۔ گھومنا انھیں بہت پسند ہے۔ یہ مصر، ماریشس، بنگلہ دیش، ترکی، ازبیکستان وغیرہ کے اسفار کر چکے ہیں۔ ڈرامہ نگاری ان کے جسم اور روح میں سرایت کر چکی ہے۔ ڈراموں اور نکڑ ناٹکوں میں اداکاری ڈاکٹر محمد کاظم کا پسندیدہ عمل ہے۔ نکڑ ناٹکوں کے حوالوں سے ان کی کئی کتابیں مثلاً، بنگال میں اُردو نکڑ ناٹک، ہندوستانی نکڑ ناٹک اور اس کی سماجی معنویت، مشرقی ہند میں اُردو نکڑ ناٹک وغیرہ منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ نکڑ ناٹکوں کے علاوہ کاظم صاحب نے داستان گوئی پر بھی کام کیا ہے۔ ان کی خوبیوں پر سنجیدگی سے گفتگو کرتے

ہوئے ابن کنول نے یہ بھی لکھا ہے کہ واقعی یہ ہر فن مولا استاد ہے۔ ہر جگہ استادی دکھاتا ہے۔ ہر فن میں استاد ہے بنگالی ہے نا، بنگالی تو ہر فن مولا ہوتے ہیں۔ ڈرامہ بہت کرتے ہیں۔ بنگالیوں کے لیے زندگی ہی ڈرامہ ہے۔ ہر بنگالی خود کو ستیہ جیت رے سمجھتا ہے۔ ابن کنول نے اس خاکے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ڈاکٹر محمد کاظم طلبہ کو ایک ہدایت کار کی مانند سمجھاتے ہیں۔ نئی تکنیک سے ہم آہنگی اور نئے مسائل کا حل ان کے پاس موجود ہوتا ہے۔ ملازموں کی تنخواہ، ان کے گریڈ پے، بیسک پے وغیرہ کا میزان یہی لگاتے ہیں۔ یعنی یہ حساب کتاب اور آفس ورک میں بھی ماہر ہیں۔ شعبۂ اُردو کے زیادہ تر آفیشئل کاغذی کام ڈاکٹر محمد کاظم کے ہی سپرد ہیں۔ صدر شعبہ تو صرف دستاویزوں پر دستخط کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد کاظم نے دہلی یونی ورسٹی میں 2002 میں جوائن کیا۔ تب سے آج تک انھوں نے جتنی شہرت اور عزت کمائی اتنی تو کئی پروفیسر رٹائرمنٹ تک نہیں کما پاتے ہیں۔ ان کے بلند و بالا اخلاق کی وجہ سے اعلا حکام سے لے کر چپراسی تک ان کا احترام کرتے ہیں۔

''عظیم صدیقی'' خاکے میں ابن کنول نے ان کی اُردو نوازی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ عظیم صدیقی بنیادی طور پر مصور تھے۔ لیکن انھیں اُردو ادب سے والہانہ شغف تھا۔ ان کی شریک حیات ڈاکٹر نگار عظیم ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ اس کے باوجود دونوں مصور بھی ہیں اور ادیب بھی۔ عظیم صدیقی نے اُردو کو تکنیک سے جوڑنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ کمپیوٹر کے ماہر تھے۔ اپنی تمام کتابوں میں انھوں نے تکنیک کا خوب استعمال کیا۔ اُردو سکھانے کے لیے انھوں نے کتاب بھی تیار کی تھی۔ اُردو والوں کو کمپیوٹر سے روشناس کرانے کے لیے ''ہدایت مائکروسافت ورڈ'' کتاب بھی لکھی۔ عظیم صدیقی کا تعلق بجنور سے تھا لیکن ابن کنول نے انھیں میرٹھ والے دوستوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

''معصوم ادیب: ڈاکٹر نعیم انیس'' خاکے میں ابن کنول نے ان کی ادب نواز معصومیت پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ ابن کنول کی ڈاکٹر نعیم انیس سے پہلی ملاقات این سی ای آر ٹی، نئی دہلی کے ورک شاپ میں ہوئی۔ اس ورک شاپ میں مرد حضرات میں صرف یہ ہی سب سے کم عمر تھے۔ ان کی کم عمری کا فائدہ بزرگ ادیبوں نے خوب اٹھایا۔ ڈاکٹر نعیم انیس نے بھی اپنے بزرگ ادیبوں کے ہر حکم پر لبیک کہا۔ نعیم انیس کا تعلق یو پی، مظفر نگر، کے قصبہ جھنجھانہ سے ہے۔ ان کے بزرگ تلاشِ معاش کی خاطر جھنجھانہ سے کلکتہ چلے گئے۔ یہیں پر نعیم انیس نے آنکھیں کھولیں اور تعلیم و تربیت حاصل کر کے کلکتہ میں ملازمت حاصل کی۔ ابن کنول نے اس خاکے میں بنگالی زبان اور اُردو کے رشتوں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ کہیں کہیں بنگالی مارکیٹ، اور بنگالی بولنے والے افراد بالخصوص ڈاکٹر کاظم کا برسبیل تذکرہ آ گیا ہے۔ ڈاکٹر نعیم انیس کی ادبی کارکردگیوں اور سرگرمیوں کے بارے میں ابن کنول لکھتے ہیں:

> ''ان کی ''پرواز'' بہت بلند ہے اور ''فکر و تحریر'' بھی۔ 1994 میں ''نیاز احمد کا مطالعہ'' کیا۔ 1999 میں ''اظہار'' کر ڈالا، پھر ''یادوں کے جگنوں'' لے کر ''وہ لمحے یاد'' کرتے رہے۔ کبھی ''پریم چند'' کو پڑھا، کبھی ''اعزاز افضل کا کلام'' دہرا دیا، ''اُردو میں معروف خواتین افسانہ نگاروں کی خدمات'' بتا کر انھیں خوش کیا۔ ''علامہ اقبال'' اور ''خواجہ جاوید اختر'' کو ''میزان افکار'' پر پرکھا۔ ''آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اُردو ادب'' تلاش کیا۔ ''راجندر سنگھ بیدی'' اور ''انتظار حسین'' کے بعد ''اکیسویں صدی میں اُردو ناول'' اور ''اکیسویں صدی میں اُردو افسانہ'' پر گفتگو' بیدل مرشد آبادی کی غزلیات'' کے ساتھ ساتھ ''بیگم

رقیہ'' کی شخصیت پر بھی اظہارِ خیال کیا۔اسی لیے تو گذشتہ بیس سال سے اس نوجوان کو مستقل انعامات سے نوازا جارہا ہے۔''(ایضاً،ص249)

پروفیسر ابن کنول نے ''کچھ شگفتگی اور کچھ سنجیدگی''میں آخری خاکہ اپنے گھریلو ملازم ''محمد شریف: خادم یا مالک''عنوان سے تحریر کیا ہے۔اس خاکے میں موصوف نے محمد شریف کی خامیوں اور خوبیوں کا تذکرہ دل چسپ انداز میں کیا ہے۔ان کے مطابق محمد شریف صرف ملازم ہی نہیں ہے بل کہ ان کے گھر کا سب سے اہم ترین فرد ہے۔گھر میں رکھی ہوئی چیزوں کی جتنی جان کاری محمد شریف کے پاس ہے اتنی اہلِ خانہ کے پاس بھی نہیں۔محمد شریف کی زبان میں لکنت ضرور ہے لیکن اس کا دل شیشے کی طرح صاف ہے۔بچوں، بزرگوں اور عورتوں میں اس کی بہت قدر ہے۔گھر والے بھی اس پر آنکھ بند کر کے بھروسا کرتے ہیں۔وہ،سب لوگوں کے کام سلیقگی کے ساتھ کرتا ہے۔اہلِ خانہ نے اس کی شادی ایک ملازمہ سے کرادی تھی لیکن وہ محمد شریف کے پاس زیادہ دن نہیں رہ پائی۔البتہ محمد شریف کو اس بات کا کوئی ملال نہیں کہ اس کی بیوی اس کا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ ابن کنول کے اہلِ خانہ کے ساتھ زندگی بسر کرنا اسے پسند ہے۔گھر میں منعقد ہونے والی تقریبات میں سج سنور کر محمد شریف پیش پیش رہتا ہے۔ابن کنول نے اس خاکے کے اختتام پر لکھا ہے کہ ''شریف کو اتنی محبت اور عزت ملی ہے کہ شاید اب اُسے زندگی بھر محرومی کا احساس نہیں ہوگا۔''

بہر نوع!''کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی''صرف خاکوں کا ہی مجموعہ نہیں بل کہ یہ معلومات کا گنجینۂ ہے۔اس کتاب میں موصوف نے عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہوئے اپنی بات کو پیش کیا ہے۔جگہ جگہ محاورات اور ضرب المثل کا برجستہ استعمال کیا ہے۔خاکہ نگار نے اپنی بات کو اس انداز میں پیش کیا گویا قاری بھی اس محفل کا حصہ ہو۔جملے چست،اور فقرے درست ہیں۔بات میں سے بات نکالنے کا انداز معنی خیز ہے۔چھوٹی چھوٹی باتوں سے خاکوں میں بوقلمونیاں پیش کی گئی ہیں۔قاری اگر اس کتاب کا مطالعہ ایک بار شروع کر دے تو اختتام پر ہی دم لے۔بزرگ ادیبوں پر لکھے خاکوں میں زبان و بیان کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔واقعات و منظر نگاری میں جزئیات سے کام لیا گیا ہے۔کشمیر اور غیر ملکی اسفار کے بیان میں سحر انگیزی نمایاں ہے۔کتاب کے عنوان کی مانند ان خاکوں میں شگفتگی اور سنجیدگی کے پہلو جا بجا موجود ہیں۔صحت مند تنقید کے پہلوؤں کو مزاح کی چاشنی میں لپیٹ کر پیش کیا گیا ہے۔دورِ حاضر میں جو خاکے لکھے گئے ہیں ان میں پروفیسر ابن کنول کی یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔اس کتاب کو بے شک لاک ڈاؤن میں لکھا گیا،لیکن لاک ڈاؤن کی پابندیاں بھی ان کے قلم کو ڈاؤن نہ کر سکیں۔مجھے کامل یقین ہے کہ خاکوں کی یہ کتاب آنے والے وقت میں دستاویز کی حیثیت سے جانی جائے گی۔

(نوٹ: یہ مضمون ابن کنول کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔مدیر)

☆☆☆

IBRAHEEM AFSAR
WARD NO-1,MEHPA CHAURAHA
SIWAL KHAS,MEERUT(U.P)250501
MOB-9897012528

پروفیسر ابن کنول کے سفرناموں کا تجزیاتی مطالعہ

محمد یوسف
ریسرچ اسکالر بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

پروفیسر ابن کنول کے سفرنامے اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ان کے سفرناموں کا مجموعہ چار کھونٹ اپنے منفرد اسلوب، دلکش انداز تحریر، باکمال قوت مشاہدہ، طرز تفہیم کی خوب صورتی اور فکری سنجیدگی کی بدولت ایک نیا اضافہ ادبی ہے۔ان کے سفرناموں میں فنی وفکری گہرائی کا اظہار ایک نئی جہت کا آئینہ دار ہے۔ان کے سفرنامے اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ، معاشرت، سماج، سیاست اور ثقافت کا ایک جہان آباد کیے ہوئے ہیں۔انھوں نے اپنے سفری تجربات، تاثرات، مشاہدات اور احساسات کو ادبی شان سے پیش کیا ہے۔سفرنامہ مختلف الجہات اور کثیر الانواع حیثیات کی بدولت اردو ادب کی مقبول صنف رہا ہے جس میں نئی دنیاؤں کی دریافت کا شوق اور خوب سے خوب تر کی تلاش کا عنصر بنیادی محرک رہا ہے۔سفرنامے کے بارے میں سعید احمد یوں رقم طراز ہیں۔

> سفرنامہ ایک بیانیہ صنف ادب ہے جس میں سیاح یا مسافر دوران سفر یا اختتام سفر پر کسی ملک یا شہر کے بارے میں اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات قلم بند کرتا ہے۔یہ واحد صنف ہے جس میں بہت سی اصناف کی علمی خوبیاں موجود ہیں۔اسی لیے اس کو ام الاصناف کہا گیا ہے۔اس کو علم و آگہی کی دستاویز سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔1

یونانی مورخ ہیروڈوٹس اور میگس تھینز کے سفرناموں سے شروع ہونے والی اس روایت کی بدولت اردو ادب میں سفرناموں کی ایک مستحکم روایت موجود رہی ہے۔یوسف کمبل پوش کا عجائبات فرنگ، مولوی مسیح الدین، سرسید احمد خان، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، جعفر تھانسیری، جگن ناتھ آزاد، حسن رضوی، اجمل نیازی، محمد کاظم، مولانا عبدالماجد دریابادی، محمود نظامی، گوپی چند نارنگ، بیگم اختر ریاض الدین، مستنصر حسین تارڑ اور رضا علی عابدی سمیت کئی نام اس صنف کو باکمال بنانے میں کوشاں رہے۔سفرنامے کے فنی محاسن میں اسلوب بیان، تہذیب وثقافت کی ترجمانی، حقیقت پسندی، راست گفتاری، لسانی شعور، ملکی تاریخ، علوم وفنون، صنعت وحرفت، مشاغل زیست، انسان فہمی اور قوت مشاہدہ کو کلیدی مقام حاصل رہا لیکن ہر سیاح کی وسعت نگاہی منفرد انداز اختیار کیے ہوئے ہے۔

ابن کنول کے سفرناموں میں حج بیت اللہ، امریکہ، موریشس، لندن، پاکستان، متحدہ عرب امارات، ماسکو، ازبکستان اور ہندوستان کے اسفار شامل ہیں۔جن کو چار کھونٹ کے نام سے شائع کیا گیا۔ان سفرناموں میں ابن کنول کی انفرادیت پوری شان سے موجود ہے۔حج بیت اللہ کا سفر دلکش اسلوب، مذہبی عقیدت، اسلامی تاریخ اور مزاح کا امتزاج ہے۔یہ ان کا منفرد سفر ہے جہاں ان کا ذاتی سرمایہ استعمال ہوا اور حرم پاک کی فضاء قدس ان کی روحانی دنیا کو نئی تازگی بخشی ہے۔اسلام میں سفر کی اہمیت، حرمین

شرفین کے روح پرور مناظر، جنگ بدر و خندق، منی، مزدلفہ اور عرفات کی تاریخی اہمیت اور مناسک حج کا بیان شامل ہے۔ابن کنول کو تاریخ سے خاص دل چسپی رہی جس کا اظہار انھوں نے اپنے تمام اسفار میں تاریخی صداقت سے کیا ہے۔مدینہ اور مکہ کے دل کش مناظر کے ساتھ تاریخ بیان کرنے کا انداز یوں سامنے آتا ہے۔

> یہ مسلمانوں کے لیے دوسری مقدس ترین مسجد ہے۔اس کی تعمیر 623 عیسوی میں کی گئی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ہجرت کر کے یثرب یعنی مدینہ پہنچے تو اپنے گھر کے برابر مسجد کے لیے دو یتیموں سے یہ زمین خریدی۔مٹی کی دیواریں بنائی گئیں۔کھجور کے تنوں اور پتوں کی مدد سے چھت بنائی گئی ابتدا میں مسجد اقصیٰ کی جانب قبلہ تھا، بعد میں کعبہ کی طرف تبدیل کیا گیا۔مسجد کے متصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گھر تھا۔وہیں آپ کا وصال ہوا، وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ تھا۔مدینہ کا قدیم نام یثرب تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا نام مدینہ تجویز کیا۔آپ کو مدینہ اور مدینہ والوں سے اس قدر محبت تھی کہ فتح مکہ کے بعد بھی آپ نے مدینہ ہی میں رہنا پسند کیا۔2

اس کے علاوہ مسجد نبوی کی توسیع، عرب کی دیگر مساجد کی تاریخ، منی اور عرفات میں جزئیات نگاری، کنکریوں اور حجر اسود کے مزاح سے بھرپور مناظر اور تمام تفصیلات کا بیان ایک کیمرائی تکنیک سے ابھارا گیا ہے جس کی بدولت جہاں تاریخ کے دریچے کھلتے ہیں وہاں زائرین کے لیے تمام سفری مصائب و سہولیات کا اہتمام موجود ہے۔مذہبی عقیدت سفرنامے کی فضاء کو متاثر کرنے کے بجائے دیگر مذاہب کے لیے تاریخی دل چسپی کا سامان رکھتی ہے۔

ان کا دوسرا سفرنامہ امریکہ کی جدید زندگی کو ایک زندہ دل ادیب کی نظر سے دیکھنے کی خواہش سے لبریز ہے۔اردو انسٹی ٹیوٹ آف کیلفورنیا کی خصوصی دعوت پر ابن کنول 22 مئی 2001 سے 18 جون 2001 تک امریکہ میں مقیم رہے۔ان کے اندر حج بیت کی زیارت کے بعد کلیساء کا رخ کشمکش کے گرد گھومتا محسوس ہوتا ہے۔اس دوران امریکی طرز معاشرت کا ہندوستانی طرز حیات سے تقابل خاصا دل چسپ ہے۔امریکی معاشرتی، علمی، تجارتی اور سیاحتی ترقی کا احوال نمایاں پہلو ہیں جن پر ابن کنول کی نگاہ مرکوز رہی۔انھوں نے امریکی زندگی میں تکلف کی عدم موجودگی گھروں کی سجاوٹ و بناوٹ، کھانے کے اوقات میں عجلت پسندی اور اقدار پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی روایت کو بیان کیا ہے۔امریکہ کی مہنگی اور مصروف زندگی میں چند ایسے بازاروں کا تذکرہ بھی شامل ہے جہاں پاکستانی اور ہندوستانی لوگ قیمتوں پر حجت بازی کا شوق پورا کرتے ہیں۔سین فرانسسکو کی تاریخ، تہذیبی زندگی کا عکس، گولڈن گیٹ برج کے اطراف کی رنگا رنگی، سٹینڈ فورڈ یونیورسٹی کی وجہ شہرت، علمی ترقی، تہذیبوں کا امتزاج، ہندوستان دانش گاہوں سے تقابل، کیلی فورنیا کے سمندری مناظر اور تجارتی مراکز کا حسن سفرنامے کا انفراد ہے۔امریکہ میں سرکاری و نجی دانش گاہوں کے ذکر میں ابن کنول نے سرمایہ داری نظام کے اثرات کے علاوہ وہاں کے بارے میں پائے جانے

والے تخیل کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔وہاں کی جامعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہاں کی یونیورسٹیوں کے کیمپس دیکھ کر اچھا لگتا ہے،اس طرح کا حسن ہمارے ہاں کی پرائیویٹ یونیورسٹیوں میں دکھائی دیتا ہے،لیکن حکومت کی زیرنگرانی بیشتر سرکاری دفتروں اور بازاروں ہی کی طرح نظر آتی ہیں۔مثل مشہور ہے جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔دراصل پرائیویٹ یونیورسٹیوں میں فیس کی شکل میں گڑ کی مقدار زیادہ ڈالنی پڑتی ہے اس لیے چکنے چکنے پات نظر آتے ہیں۔اب کم خرچ بالانشین والی مثال بیکار ہے۔خیر ہمیں تو اپنا ملک اور اپنی دانش گاہیں ہی اچھی لگتی ہیں، دور کے ڈھول بس سہانے ہوتے ہیں۔3

ابن کنول کا تیسرا سفر دنیا کے خوب صورت اور رنگین دیس مرایشس سے متعلق ہے جہاں ان کا جانا متعدد مرتبہ ہوا۔اجمال اس حالیہ سفر کی نیشنل ا ردو انسٹی ٹیوٹ کا دعوت نامہ ہے۔ابن کنول ہر مرتبہ موریشس کے جادوئی فطری مناظر کی دلکشی میں مگن ہو جاتے ہیں۔اسلام اور ہندومت میں سری لنکا کی اہمیت، وہاں کے طرز بودوباش،مہمان نوازی، گنے کی پیداوار اور شگر کی بڑھتی بیماری، انگریزی کے بجائے فرینچ زبان کی مقبولیت کے محرکات، لباس وخوارک، اسلام و ہندومت کا امتزاج، پاکستان اور ہندوستان کے ادبی لوگوں کا اجتماع،مویشس کا جغرافیہ،طبعی خدوخال، میوزیم، جامعات کا انفرادی رنگ، اردو کی محبت، اسلامی طرز تعمیر، ہندوستانی مطالعات کا مرکز، اندرا گاندھی سینٹر،موسمی تغیر وتبدل اور ملکوتی حسن سفرنامے کو منفرد بنانے کی شعوری کوشش ہے۔ابن کنول اور موریشس کا قدرتی حسن ملاحظہ ہو۔

> موریشس کی خوبصورتی کا انحصار سمندر کے ساحلوں کے نظاروں پر ہے۔ڈاکٹر صابر نے متعدد ساحل Beaches دکھائے۔ساحل کے مناظر تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں 20-19 ہی کا فرق ہوتا ہے۔کہیں سورج غروب ہوتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے کہیں سمندر میں طغیانی زیادہ ہوتی ہے اور کہیں کم، برسات کا موسم ہو یا نہ ہو،مویشس میں اکثر آسمان پر دھنک نظر آتے ہیں۔پہاڑوں پر ہریالی ہے، جہاں سے جھرنے بہتے ہیں۔لوگوں میں سادگی ہے بناوٹ نہیں۔وزیر وکبیر وامیر سے ملنے میں بھی دقت نہیں ہوتی۔گنے کی کھیتی کے سبب یہاں کی فضاؤں میں شیرینی ہے۔4

پروفیسر ابن کنول اپنے سفرناموں میں لندن، وہاں کی تاریخ، انسانی محنت وترقی، وہاں کی معاشرت،طرز زیست اور قابل دید مقامات کو بھی خاص اہمیت دیتے ہیں۔ان کے ہاں تاریخ گوئی کا ہنر سفرناموں کو نئی معنویت عطا کرتا ہے۔ان کی کیمرائی تکنیک جہاں منظرکشی اور جزئیات نگاری سے قاری کو مسحور کرتی ہے وہاں تاریخ اور عہد بہ عہد کا انسانی سفر بھی دل کشی کا باعث ہے۔لندن کا طرز زندگی، عمارت کا حسن، پنجاب اور دہلی کا گمان، برٹش میوزیم کی تاریخ، ٹاور برج اور لندن ٹاور کے مناظر، انسانی لگن اور ترقی کے شہکار، سینٹ پال گرجا کے بدلتے مناظر اور لندن کی مصروف زندگی کا عکس منفرد ادبی اسلوب سے اجاگر ہوا ہے۔ایشیائی لوگوں کی کثرت اور ہندوستان میں انگریزوں کے طویل قیام سے ابن کنول کو لندن اپنا اپنا سا لگا اور پہلی بار اجنبیت

کا احساس کم سے کم رہا۔ وہ لکھتے ہیں

ساؤتھ لندن کو چھوٹا ہندوستان یا چھوٹا پنجاب بھی کہتے ہیں۔ بازار میں پہنچ کر ایسا لگا جیسے دہلی یا لاہور کے بازار میں گھوم رہے ہیں۔ بازار میں گھومنے والی خواتین برقعے کے علاوہ

> ساڑی اور شلوار قمیص بھی پہنے ہوئے تھیں۔ مغربی لباس بہت کم نظر آتا ہے۔ دکانوں پر گول گپے بھی تھے اور جلیبیاں بھی، سموسے کی پلیٹ تین پونڈ کی تھی اور کباب رول دو پونڈ کا بلیماران کی دکانوں کی طرح جوتوں کی دکانیں بھی تھیں اور برقعوں کے شوروم بھی۔ طرح طرح کے سلیم شاہی جوتے اور پاکستانی برقعے ٹنگے ہوئے تھے۔ رنگ برنگ سوٹ، دوپٹے اور چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔5

پروفیسر ابن کنول نے سفر ناموں میں پاکستان کے دو اسفار فیصل آباد اور پشاور کا ذکر بھی گہری اپنائیت اور محبت بھرے احساسات سے کیا ہے۔ ان کے اندر دونوں ممالک کے لوگوں میں موجود محبت کا عکس نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ وہ انسانی تقسیم کے قائل نہیں ہیں اور ادب کے عالمگیر تصور کے کے ہم نوا ہیں۔ جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کی دعوت پر ابن کنول 28 اگست تا 3 ستمبر 2006 پاکستان مقیم رہے۔ تقسیم کی اذیت، مذہبی شدت پسندی، فیصل آباد اور لاہور کے تاریخی مقامات کا بیان سفر نامے کا ادبی حسن ہے۔ ان کے مطابق فیصل آباد کو 1849 میں زراعت کے لیے برطانوی فوجیوں نے بسایا۔ اس کا نام پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر سر جیمس لائل کے نام پر پڑا۔ 1977 میں سعودی بادشاہ شاہ فیصل کے نام پر فیصل آباد ہوا۔ اس شہر کی تعمیر کے وقت ایک مرکزی گھنٹہ گھر بنا کر اس کے چاروں طرف آٹھ قطاروں میں برطانوی جھنڈے کی شکل میں بازار بنائے گے۔ پاکستان کا مانچسٹر آزادی سے قبل مذہبی تفریق سے بالاتر تھا۔ گورنمنٹ کالج کی تاریخ، مزار اقبال کے مناظر اور لاہور کی تاریخ ابن کنول کی تاریخی دل چسپی کی عکاس ہے۔ اکبر کا شاہی قلعہ، جہانگیر کی تعمیرات اور لاہور کی قدیم وجدید تاریخ سفر نامہ کو امر کر دینے کے لیے کافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> لاہور، کراچی کے بعد پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ زمانہ قدیم میں ہر بڑا شہر کسی نہ کسی دریا کے کنارے بسایا گیا تھا۔ یہاں دریا راوی بہتا ہے۔ اس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ روایت ہے کہ رام چندر جی کے بیٹے راجہ لو نے اس شہر کو آباد کیا۔ دسویں صدی عیسوی تک متعدد حکمرانوں نے یہاں حکومت کی۔ جب محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کر لیا تو اپنے غلام ایاز کو یہاں کا گورنر بنایا۔ بارہویں صدی عیسوی میں یہ شہاب الدین غوری کی حکومت میں شامل رہا اور دہلی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ مغلوں میں سبھی بادشاہوں نے لاہور کی طرف توجہ کی۔ ملکہ نور جہاں کو لاہور بہت پسند تھا۔6

ابن کنول پشاور یونیورسٹی کی دعوت پر 5 تا 13 اگست 2008 پشاور تشریف لائے۔ پشاور سفر کے دوران انہوں نے ایبٹ آباد اور

ہزارہ کے تاریخی اور قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ مہمان نوازی سے لطف اٹھایا۔ پشاور کی تاریخ کے خفیہ گوشے بے نقاب کیے۔ پشاور یونیورسٹی کے آغاز اور انگریزوں کی جانب سے دیسی مقامات کو اردو نام بخشنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ ابن کنول پشاور کی تاریخ کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> پشاور کا شمار جنوبی ایشیاء کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ کشان راجاؤں کے راجہ کنشک کی پشاور راجدھانی تھا اور اسے پرش پورہ کہا جاتا تھا جس کا مطلب تھا مردوں کا شہر۔ واقعی پشاور مردوں کا شہر ہے۔۔۔۔ ایک انگریز اس علاقہ میں ڈپٹی کمشنر تھا، اس نے اس علاقہ کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر ایک نظم بعنوان ایبٹ آباد Abbottabad لکھی اور اس بستی کا نام ہی اپنے نام پر ایبٹ آباد رکھ دیا۔ اپنے ناموں کے ساتھ اردو الفاظ ملا کر انھیں ہندوستانی بنا دیا، جیسے لائل پور 7

ابن کنول نے ماسکو کے احوال بھی بالتفصیل قلم بند کیے ہیں جہاں وہ ڈاکٹر اندرا گاز یوا کی دعوت پر گے۔ ابن کنول نے ماسکو میں تاریخ کے بجائے فنون لطیفہ سے اپنی دلچسپی کو سامنے لایا ہے۔ وہاں کی عمارات اور طرز تعمیر کی انفرادیت سفرنامے کو منفرد بناتی ہیں۔ ماسکو کی خوبصورتی کریملن کے سیاحتی مقامات، لینن کا مقبرہ، فصیل، گرجے، محل، حکمرانوں کی رنگین مزاجی، اسلامی طرز تعمیر اور چرچ کا بیان خاص ہے۔ عمارتوں میں موجود نقاشی، گرجوں کے منقش گنبد، مینار، مصوری اور ان کے ہندوستانی طرز تعمیر سے مماثلت کا بیان دلکشی سے لبریز ہے۔

چار کھونٹ میں متحدہ عرب امارات کی سیاحت تاریخی، معاشرتی، تہذیبی اور سماجی عہد کا ارتقاء موجود ہے۔ امارات کی ریاستوں میں ابوظہبی، دبئی، شارجہ، عجمان، فجیرہ، راس الخیمہ اور ام القوین کا حال و ماضی پوری طرح عیاں ہے۔ ان کے مطابق 1971 میں انگریزی تسلط سے آزادی اور تیل و معدنیات کی فراوانی اس خطے کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ امارات کی جدت نے ابن کنول کا بہت متاثر کیا جہاں ان کا تاریخی شعور حالیہ ترقی میں گم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے مطابق امارات اور یورپ میں فرق کرنا انسان کے لیے بے حد مشکل ہے۔ تیل کا مالیاتی حسن امارات کی پہچان ہے۔ دبئی کی جدت دبئی مال، آب ایکوریم، برج العرب، جمیرا ساحل، برج خلیفہ انسانی ترقی کے ناقابل یقین نمونے ہیں۔ شارجہ کا کرکٹ اسٹیڈیم، مقام القصبہ کا تفریحی ماحول، عالیشان عمارات، برقی قمقموں کا عکس انسانی عقل کے شہکار ہیں۔ ان کا انداز ملاحظہ ہو۔:

> متحدہ عرب امارات میں ہر ریاست ایک چھوٹا سا ملک ہے، جو اتحاد کی وجہ سے ایک گلدستہ کی طرح نظر آتا ہے۔ ہر ایک کی علاحدہ اپنی اپنی شناخت ہے اور اہمیت ہے، لیکن گلدان ایک ہونے کی وجہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ ابوظہبی متحدہ عرب امارات کی سب سے بڑی ریاست ہے اور ملک کا دارالخلافہ بھی ہے۔ دبئی کا دنیا کے جدید شہروں میں شمار ہوتا ہے اور ملک کا سب سے بڑا شہر بھی

ہے۔دبئی سے ملحقہ شارجہ بھی تجارتی اور سیاحتی اعتبار سے متحدہ عرب امارات کی اہم ریاست اور شہر ہے۔شارجہ کرکٹ کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔8

ابن کنول نے ازبکستان کے تاریخی اور قدرتی حسن کو بھی خاص طور پر اجاگر کیا ہے۔اسلامی تاریخی یادگاروں کی دوبارہ آرائش، روسی رسم الخط کی خطاطی، مولانا عارف دیگرنی کا مزار، خواجہ بہاء الدین نقشبند کا حجرہ، کنواں، زائرین کے لیے انتظامات، خواجہ عبدالخالق کی صوفیانہ تعلیمات، مقبرے، محراب، مساجد اور اسلامی طرز زندگی کے نمایاں پہلو ہیں جو ابن کنول نے تصوف کے رنگ میں پیش کیا۔

پروفیسر ابن کنول نے اپنے ہندوستانی اسفار کو بھی وطن پرستی کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ان کے مطابق ہندوستان دنیا کا خوب صورت ترین ملک ہے جہاں کا ہر رنگ خود میں بے مثال ہے۔ہندوستان کے علاقوں کی زبان، موسم، قدرتی مناظر، تہذیب و ثقافت اور طرز زیست میں تنوع کا رنگ ہے۔ان کا پہلا سفر ممبئی کا تھا جہاں کا ساحل، فلمی دنیا، دلکش مناظر اور طبقاتی اونچ نیچ کا اظہار موجود ہے۔اس کے ساتھ حیدرآباد کے چار مینار، قطب شاہی خاندان کی خدمات، سالار جنگ میوزیم، قلعہ گولکنڈہ، ابراہیم باغ، گوتم بت کا مجسمہ اور رات کا نظارا عمدگی سے بیان ہوا ہے۔ان کا ایک انداز ملاحظہ ہو۔:

> حیدرآباد کو سلطان قلی قطب شاہ نے آباد کیا، اسی لیے اس کی تعمیر میں شاعرانہ مزاج شامل ہے۔قطب شاہی خاندان نے اردو زبان وادب کی خدمت کا جو آغاز کیا وہ آج تک جاری ہے چار مینار کے پاس ہی مکہ مسجد ہے جس میں شاہی خاندان کے افراد کی قبریں ہیں۔اس کے پیچھے چومحلہ پیلس ہے جس میں نظام کا خاندان رہتا تھا، بہت خوبصورت محل ہے۔پرانی کاریں بھی نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔حیدرآباد میں سیاحوں کی دلچسپی کے لیے خاص مقام سالار جنگ میوزیم ہے۔9

پروفیسر ابن کنول کے سفرناموں میں زندگی کی مسلسل حرکت موجود ہے۔ان کا اسلوب بیان سادگی اور سلاست کا دل کش نمونہ ہے۔ان کی نگاہ ظاہر و پوشیدہ مناظر کو عیاں کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے۔وہ شہری و دیہی مناظر اور تاریخ کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک نقشہ یا سفری گائیڈ بن کر فرد کو حال و ماضی سے آگہی دلاتا ہے۔ان کے ہاں تاریخیبان کرنے کا خاص اہتمام ہے جو ان کا مخصوص ادبی انفراد ہے۔قاری ان کے دیکھے ہوئے مناظر کیمرائی تکنیک اور تاریخ کی بدولت اپنے شعور کا حصہ بنا لیتا ہے۔ان کے سفرناموں میں موجود تاریخ، معاشرت، تہذیب و ثقافت کا بیان، دلکش منظرنگاری اور نسان فہمی کے علاوہ آسان و عام فہم زبان موجود ہے جو ان کو باکمال تاریخی شعور کا حامل سفرنگار بناتا ہے۔ان کے سفرناموں میں تخلیقی لطافت اور تیز بینی کا وہی فن موجود ہے جس کو ڈاکٹر بشری رحمن نے افسانے کا حسن قرار دیا ہے جس کی بدولت انھوں نے نئی زمینوں کو کمال مہارت سے دریافت کیا۔وہ لکھتی ہیں۔

> سیاح کی تیز بینی ملک کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کوشش کا اظہار ایک

اچھے سفر نامے کی بنیادی خصوصیت ہے اور اس سے سفر نامے کو تخلیقی لطافت اور فنی جاذبیت حاصل ہوتی ہے بلاشبہ سفر نامہ نئی زمینوں کی دریافت کا وسیلہ ہے۔10

پروفیسر ابن کنول اپنی تخلیقات کی بدولت اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے لیکن ان کے سفر ناموں میں جدت اور تاریخی و تخلیقی صلاحیت ان کا منفرد تعارف بن کر ادبی افق پر روشن رہے گی۔

حوالہ جات۔

1۔سعید احمد۔آزادی کے بعد اردو سفر نامہ۔کلاسیک آرٹ پریس، دہلی۔2012،ص9

2۔ابن کنول، پروفیسر۔چار کھونٹ۔کتابی دنیا۔دہلی۔2022۔ص37

3۔ایضاص81

4۔ایضا۔ص128

5۔ایضا،ص151

6۔ایضا۔ص189

7۔ایضاص202

8۔ایضاص234

9۔ایضا،ص290

10۔بشری رحمن، ڈاکٹر۔اردو میں غیر مذہبی سفر نامے۔شاندار پریس، گورکھپور،ص37۔

☆☆☆☆

چین کی عادت ہے کہ اپنی کوئی چیز بھی اپنے ملک تک نہیں رکھتا، پوری دنیا میں برآمد کرتا ہے، بس اس نے کورونا وائرس کی بھی برآمد شروع کر دی۔ پہلے برآمد کی ہوئی اشیاء سستی تھیں اب کورونا مفت کر دیا۔

کووڈ-19-ابن کنول

ابن کنول کا سفرنامہ چارکھونٹ

آفاق حیدر
گیسٹ لیکچرر سریندر ناتھ کالج فار ویمن کولکاتا

سفرنامہ سفر کے حقائق پر مبنی انفرادی تجربے کا نام ہے۔ایک طرح سے سفرناموں میں خودکلامی ہوتی ہے۔انگریزی میں اسے travelogue کہتے ہیں جو گریک لفظ مونو یعنی واحد اور لوگ یعنی speech ہے۔سفرنامہ میں راقم الحروف جو سفر کرتا ہے اور پھر اس سفر کو حقائق کے ساتھ بیان کرتا ہے۔لیکن سفرنامہ میں راقم الحروف کے اندر چل رہے جذبات واحساسات کو اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اردو ادب میں سفرناموں کے ابتدائی نقوش ہمیں 1847 میں یوسف کمبل پوش کے عجائبات فرنگ میں ملتے ہیں۔ سرسید احمد خان نے 1870 میں مسافران لندن لکھا اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد نے سیر ایران اور شبلی نعمانی نے سفرنامہ مصر روم و شام لکھا۔ 20 ویں صدی میں بھی بڑے پیمانے پر سفرنامے لکھے گئے اور اکیسویں صدی میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔سفرنامہ میں مسافر جو سفر کرتا ہے اس کو من وعن بیان کرتا ہے۔مسافر جب داستان سفر بیان کرتا ہے تو اپنے آنکھوں سے دیکھے ہوئے مناظر کو دوسرے کے سامنے دہراتا ہے یا خیالی طور دوسروں کو اسی سفر پر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔لیکن کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو سفر تو کرتے ہیں پر اس کے بعد چپ سادھ لیتے ہیں نہ اس کے متعلق کچھ بولتے ہیں اور نہ لکھتے ہی۔لیکن وہ لوگ قابل ستائش ہیں جو سفر کرتے ہیں اور اس کو قلم بند کر کے دوسرے لوگوں پر احسان کرتے ہیں اور اس سفر کا حصہ بناتے ہیں۔ایسے مسافر کسی بھی معاشرے زبان وتہذیب کے ارتقاء میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔بعض اوقات سفرنامے تحقیقی کاموں میں بہت اہم ثابت ہوئے ہیں۔

اگر واسکوڈی گاما نے دنیا کا سفر نہیں کیا ہوتا تو آج تاریخ کچھ اور ہوتی اور نہ ہی وہ پوری دنیا میں اتنا مقبول ہوتا آج ہمیں ان سفرناموں کے ذریعے ہی پتا چلتا ہے کہ جب ہیونگ سانگ ہندوستان آیا تھا تو اس وقت کا ہندوستان کیسا تھا یہاں کے لوگ کس طرح کی زندگی گزارتے تھے معاشرہ کیسا تھا۔آج البیرونی کے سفرنامے سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ اس وقت کا ہندوستان کیسا تھا۔اسی لئے کبھی کبھی سفرنامے تاریخ نویسی سے بھی زیادہ اہم ثابت ہوئے ہیں۔ان سفرناموں کی بدولت ایک قاری ہزاروں کیلومیٹر دور کسی ملک کے حالات، وہاں کی طرز زندگی اور تفریحی مقامات سے گھر بیٹھے ہی محظوظ ہوسکتا ہے اور وہاں کی طرز زندگی سے اچھی طرح واقف ہوسکتا ہے۔اکیسویں صدی میں بھی سفرنامہ لکھنے کا سفر جاری ہے اور کئی لوگ دلچسپ سفرنامے لکھ رہے ہیں ان میں ایک نام پروفیسر اب کنول کا بھی ہے ان کے بیروں ممالک اسفار پر مبنی ان کی کتاب" چارکھونٹ"

میں شامل ہے۔کتاب کے نام سے ہی واضح ہوجاتا ہے کہ اس میں چارسمت کی باتیں کی گئی ہے یعنی پوری دنیا کا ذکر ہے اور پوری دنیا کا ذکر اذکار اسی وقت کر سکتے ہیں جب آپ دنیا کا سفر کرتے ہیں۔چارکھونٹ پروفیسر ابن کنول کے ان سفرناموں پر مشتمل ہے جو انہوں نے سفر حج کے علاوہ ادبی اجتماعات میں شرکت کرنے اور اپنے اہل خانہ کو مختلف ملکوں کے کی سیر وتفریح کرانے کے سلسلے میں کئے ہیں۔انہوں نے ان سفرناموں کو تحریر کر کے نہ صرف قارئیں کو ہم سفر بنایا ہے اور ان کی معلومات میں اضافہ کیا ہے بلکہ اپنی شخصیت کے مختلف گوشے اس طرح سے واضح کر دیئے ہیں کہ سامنے نظر آنے والا ابن کنول آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور بلکل ہی مختلف شخص سے ہماری ملاقات ہوتی ہے اور بقول زماں آزردہ" جب ہم ابن کنول کے سفرناموں کا،مطالعہ کرتے ہیں تو ایک قدآور، دوردور تک اپنا،سایہ پھیلانے والا ایک محیرالعقل ذی روح کا سامنا ہوتا ہے۔یوں تو اس سے قبل بہت سے لوگوں نے امریکہ برطانیہ فرانس روس تاشقند افغانستان اور پاکستان اور مراقش وغیرہ کے سفرنامے لکھے ہیں لیکن کسی نے جمشید پور،شیلانگ،ممبء۔کلکتہ،انڈمان،کرناٹک تیلنگانہ یا کشمیر جیسی جگہوں کو اپنے سفرناموں کے ذریعے ہر ایک کی یاداشت کا حصہ نہیں بنایا ہے۔"

(زماں آزردہ چارکھونٹ دیباچہ،ص10)

پروفیسر ابن کنول کی زبانی ان کی پوری زندگی بھی بجائے خود ایک سفرنامہ رہی ہے۔ڈبائی آبائی وطن ہے تعلیم علی گڑھ میں پائی اور روزگار دہلی میں۔گزشتہ کئی برسوں میں ابن کنول نے تحقیق اور تنقید کی دنیا کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن کے مختلف دریچے کھولنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔جہاں سے ہم ان کی شخصیت کی کئی اور وصف کا نظارہ کر سکتے ہیں۔انہوں نے خاکہ اور انشائیے تخلیق کر کے اپنے ذہن رسا کے ایک اور دریچے کو قارئین کے لئے وا کر دیا تھا اور اب سفرنامے نے ان کا ایسا پوشیدہ وصف سامنے لایا ہے جس میں ہم ایک منفرد ابن کنول کو دیکھتے ہیں۔جس میں ان کی وسیع النظری صاف جھلکتی ہے۔جس میں وہ چھوٹی سی چھوٹی چیزوں اور عام سے باتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں۔سفرنامے کے اسلوب اور انداز بیاں ایسا ہے کہ انکو پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ ہم ان کے ہم راہ سفر پر ساتھ ساتھ چل رہے ہوں اور الفاظ وواقعات اور مناظر صف بستہ کھڑے ہیں اور ہم سے خود بخود مخاطب ہو رہے ہیں۔

چارکھونٹ کے سفرنامے کی نثر میں تخلیقیت اور روانی ہے وہ ان کی افسانہ نگاری کی دین ہے دوسری جانب ان کے خاکوں اور انشائیوں میں موجود ان کی حس مزاح ان کے سفرناموں بھی جا بجا نظر آتا ہے جس نے سفرنامے کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے جس کے سبب دوران مطالعہ قاری وقفے وقفے پر طنز ومزاح کی آمیزش سے محظوظ ہوتا ہے۔

چارکھونٹ میں ابن کنول دنیا کی جو سیر کی ہے ان اسفار کو قلمبند کر کے ایک کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔اس میں پہلا سفر حج بیت اللہ کا ہے اس کے علاوہ آٹھ بیرومما لک کے سفر کا حال ہے اور آخری باب میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے سفر کا حال ہے۔چارکھونٹ میں انہوں نے سعودی عرب،امریکہ،ماریشس،پاکستان،متحدہ عرب امارت،ماسکو اور ازبکستان کے اسفار کے

حالات لکھے ہیں۔ پاکستان کا دو بار سفر کیا ہے ایک بار فیصل آباد اور دوسری بار تاریخی شہر پشاور کا سفر نامہ ہے۔

پروفیسر ابن کنول کے سفر نامے کا آغاز حج بیت اللہ سے ہوتا ہے۔ یہ ان کا پہلا بیرون ملک سفر ہے۔ اس سفر نامے میں انہوں نے حج کے روانگی کے روح پرور منظر اور مکہ مدینہ کے سفر کا حال اس خوبی سے بیاں کیا ہے کہ قاری سارے مناظر کو اپنے آنکھوں کے سامنے صاف صاف دیکھ سکتا ہے۔ سفر کا حال بیان کرتے ہوئے قاری کو بھی فرحت بخش تجسس اور حیرانگی کی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جب پہلی بار مکہ شہر اور خانہ کعبہ کے دیدار کا منظر پیش کرتے ہیں تو قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ ابن کنول کا ہاتھ تھامے ہوئے وہ بھی مسجد الحرام می داخل ہو چکا ہے۔ وہ کئی بار سنجیدگی کے ماحول میں بھی اپنے حس مزاح سے قاری کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جب وہ سفا مروا کی پہاڑیوں پر سر منڈوانے کا ذکر کرتے ہیں۔۔

''سعی کے بعد فارغ البالی یعنی بال کٹوانے تھے۔ ویسے تو ہماری فارغ البالی کی ابتدا قدرتی طور پر ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی کچھ بہار باقی تھی، خواتین کو مروہ کے پاس چھوڑا۔ میں قاضی کریم کے ساتھ سر منڈوانے کے لئے چلا آیا۔ باہر مونڈنے والوں کی دکانوں کی قطار تھی۔ سر مونڈنے کے ہر نائی دس ریال لے رہا تھا۔ زیادہ تر ہندوستانی اور پاکستانی تھے۔ ویسے بھی برصغیر کے لوگ سر مونڈنے میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ سہارنپور کے ایک نائی نے ہمارے سر کو بے بال و پر کر دیا۔ دوران استرا درازی ہم نے حب الوطنی کا واسطہ دے کر کچھ رعایت کی کوشش کی لیکن اس استرے نے ہماری امیدوں کو قطع کر کے ہماری زبان درازی کو بے اثر کر دیا۔ اس نے ایک چائے کی قیمت کے برابر یعنی ایک ریال کی بھی رعایت نہیں کی جب ہم اپنے منڈے ہوئے سر کو لیکر اپنی بیگمات کے پاس گئے تو انہوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ شناختی کارڈ دکھا کر یقین دلایا کہ جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' (چار کھونٹ، ابن کنول ص 31)

ابن کنول حج بیت اللہ کے سفر کے دوران جہاں ایک طرف عربوں کی ترقی پر عش عش کرتے ہیں تو وہیں دوسری جانب اسلام کے تئیں ان کی بد دیانتی اور ان کے بدلتے ہوئے ترجیحات پر طنز کے نشتر سے وار کرنا نہیں بھولتے ہیں اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''مسجد نبوی اور مسجد الحرام کے اطراف متعدد پانچ ستارہ ہوٹل ہیں، جن کے نام انگریزوں کے نام پر ہے، یعنی ان مقدس شہروں میں جہاں غیر مسلموں کا آنا ممنوع ہے، غیر مسلموں کی ہوٹلوں کی شاخیں اصل ناموں کے ساتھ موجود ہیں، یعنی گڑ کھائیں، گلگلوں سے پرہیز۔ پہلے مسلمان اپنی ذہانت اور قوت سے دنیا میں بلند مقام حاصل کرتے تھے اور اب تیل کی دولت حاصل کر کے بلند عمارتیں تعمیر کرتے ہیں۔ عیش گاہیں بناتے ہیں، اپنی حفاظت کے لئے غیر مسلموں کی مدد مانگتے ہیں۔ حج کے موقع پر لاکھوں مختلف رنگ و نسل کے مسلمانوں کو دیکھ کت

طاقت کا احساس ہوتا ہے،لیکن صرف کچھ وقت کے لئے‘‘(چارکھونٹ،ابن کنول ص49)

سعودی عرب کے سفر کے دوران عربوں کی اسلامی اقدار کے تئیں بے حسی اور قدیم شہروں کے نشانیوں کے زائل ہونے اورعربوں کی غیر سنجیدگی پر کف افسوس ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔عرب میں سب کچھ بدل چکا ہے وہاں کا معاشرہ وہاں کی زندگی اگر کچھ نہیں بدلا ہے تو ان کا لباس جو اسلامی نہیں بلکہ عربی لباس ہے جو زمانہ جاہلیت میں بھی یہی لباس پہنا کرتے تھے۔

سعودی عرب سے واپسی کے ماہ کے بعد ہی امریکہ سفر کا انہوں اپنے اس سفر نامے میں ذکر کیا ہے۔حج بیت اللہ کے سفر سے واپسی پر اردو انسٹی ٹیوٹ کیلیفورنیا کے ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت نامہ ملا اور اس مقصد سے امریکہ جانا ہوا۔جہاں ان کے ایک ساگرد لارڈ کارڈوزا تھے جو 1993 میں اردو زبان سیکھنے ہندوستان آئے تھے۔امریکہ کے سفر کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ امریکہ جیسے ملک میں جانا آسان نہیں ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے ویزا حاصل کرنے کی دشواریوں کو بیان کیا ہے۔اس کے بعد امریکہ پہنچنے کے بعد کے حالات اور کس طرح سے یہاں کی طرز زندگی ہندوستان کے طرز زندگی سے کس طرح مختلف ہے اس کا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

جب لارڈ کارڈوزا اوران کی اہلیہ مشل کارڈواذ ہندوستان میں اردو سیکھنے کے غرض آئے ہوئے تو اس دوران ابن کنول اور کارڈوزا کی دوستی یوجاتی ہے۔اس درمیان دونوں ملکوں کے معاشرے اور عادت واطوار کے فرق کو واضح کرتے ہوئے واقع کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔راڈ کارڈوزا اپنی اہلیہ کے ساتھ دہلی کے نظام الدین میں رہتے تھے۔

> ’’پہلی مرتبہ جب نظام الدین میں واقع راڈ کارڈوزا کے مکان پر گئے تو کچھ دیر بیٹھنے کے بعد کارڈوزا نے ہم سے معلوم کیا”آپ کچھ چائے یا کولڈرنک لیں گے؟‘‘
>
> اپنی تہذیب کے مطابق ہم نے تکلفا انکار کیا،انہوں نے دوبارہ پوچھنے کی زحمت نہیں کی،ہم انکار کر کے بہت پچھتائے۔معلوم ہوا کہ امریکہ میں ایک بار اگر کوئی انکار کردے تو دوبارہ اس سے نہیں پوچھتے۔پھر جب ہماری دعوت پر وہ ہمارے گھر آئے تو ہم نے انہیں یہاں کی تہذیب سمجھائی کہ پہلے مہمان ایک دو بار انکار کرتے ہیں میزبان کو کئی بار پوچھنا پڑتا ہے۔اگر پہلی بار میں مہمان ہاں کر دیتا ہے تو میزبان کو نہ صرف ناگوار گزرتا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ کھانے کے لئے ہی آئے ہیں۔راڈ کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے معذرت بھی کی۔”(چارکھونٹ،ابن کنول ص60)

امریکہ میں تقریباً ایک ماہ گزرے دن کے متعلق ابن کنول نے چارکھونٹ میں بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے وہاں کی روزمرہ زندگی،خاندانی نظام اور مذہب سے وہاں کے لوگوں کے لگاؤ پر تفصیل باتیں کی ہے جس سے امریکی معاشرے کے کئی گوشے آشکار ہوتے ہیں اور یہ وہم دور ہوجاتا ہے کہ جیسا ہم امریکہ کے بارے میں سوچتے اور سنتے ہیں امریکہ اس سے قدرے مختلف ہے وہاں بھی خاندانی نظام قائم مذہبی سرگرمیاں بھی ہیں اور مہمان نوازی بھی لی جاتی ہے۔

امریکہ کے ابن کنول نے اپنی کتاب چار کھونٹ خوبصورت ملک ماریشس کے سفر کا حال بیان کیا ہے۔ ماریشس کے سفر میں ان کے ساتھ ہندوستان کے اور بھی اردو کے ادیب ہمراہ ہوتے ہیں۔ اس سفر کی دلچسپ پہلوؤں کو نہایت ہی خوبصورت انداز میں سبن کنول نے پیش کیا ہے۔ ابن کنول ماریشس کے سفر کا حال پڑھنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کئی ہزار میل دور جزیرہ نما ملک ماریشس میں اردو زبان کی موجودگی ہے اور اس کی تاریخی پہلو سے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں۔ برسوں پہلے ہندوستان سے آئے ہم وطنوں کے حال بیان کئے ہیں۔ ماریشس کا سفر کا سبب بھی ادبی تھا جو انہوں نے 2003 میں کیا تھا۔

ماریشس میں اردو زبان کی موجودگی کے حوالے سے بات کی ہے۔ اس جزیرہ نما ملک میں اکثریت ان ہندوستانیوں کی ہے جنہیں انگریز مزدور بنا کر لے گئے تھے اور پھر وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے اور پھر انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے تہذیب وتمدن اور زبان کو ترقی کے لئے سعی شروع کر دی۔

ابن کنول سفر کے دوران کی دلچسپ واقعات کو اتنی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں کہ واقعات مزید دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ ماریشس کے سفر پر ان کے کئی جاننے والے بھی جا رہے تھے لہذا ہندوستان میں ادیب و شاعروں کے درمیان ایک دوسرے کے تئیں رقابت کی جو روایت ہے اس کا ذکر اس سفر کے دوران پیش آئے ایک واقع کے ذریعے اشارہ کرتے ہیں۔

> ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ ہندوستان سے کون کون نامور ادیب ماریشس جائیں گے، بس اتنا معلوم تھا کہ ہمارا جانا طے ہے۔ ہم نے بھی زیادہ ڈھنڈورا پیٹنا مناسب نہیں سمجھا، اس لئے کہ خوش ہونے والوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ نظر لگانے اور ٹانگ کھینچنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بڑے بزرگ ادیب اپنے سے کم تر ادیب کو ایک ہی پروگرام میں دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور منتظمین سے شکایت بھی کر دیتے ہیں۔
>
> ارے بھائی آنے انہیں کیوں بلایا ہے۔ ابھی ان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ ہمیں ان کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھنا ہوگا۔"
>
> سمجھدار منتظمین تو خاموش رہتے ہیں ناسمجھ بزرگوں کی بات کا احترام کرتے ہوئے نوجوان ادیبوں سے معذرت کر لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے بعض اداروں میں اس وقت تک کسی ادیب کو نہیں بلاتے جب تک وہ سینئر سیٹیزن نہ ہو جائے۔ بزرگی سب سے بڑی سند مانی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض ہم عمر بھی اپنی اپنی محرومی کے سبب برداشت نہیں کر پاتے سوچتے ہیں کہ میں نہیں تو کوئی نہیں دراصل سچ تو یہ ہے۔

دل میں نفرت کی نہاں آگ سے خطرہ ہے تمہیں
آستینوں میں پلے ناگ سے خطرہ ہے تمہیں

(چار کھونٹ، ابن کنول ص 95)

ابن کنول ہمیں ماریشس جیسے دور دراز ملک کے حسین مناظر سے لطف اندوز کراتے تو ہیں ہی ساتھ اس ملک کی تاریخ اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں اور ان کے پش منظر سے بھی بہت خوبی سے ہمیں روشناس کراتے ہیں ماریشس کے بارے لکھتے ہیں کہ

> ماریشس قدرتی طور پر خوبصورت جزیرہ ہے ،لیکن اسے مزید خوبصورت بنانے میں ہندوستانی مزدوروں کا ہاتھ ہے۔ برسوں انہوں نے یہاں غلامانہ زندگی گزاری ،انگریزوں کے مظالم کو برداشت کیا ،لیکن جب انہیں آزادی ہوگئی اور وہ خود اقتدار میں آ گئے تو انہوں نے اپنی قدیم ہندوستانی تہزیب اور زبانوں کا احیاء کیا، دنیا میں اپنی شناخت قائم کی۔

(ابن کنول چار کھونٹ،ص 101)

پھر لندن اردو اکاڈمی سے بلاوا آ گیا اور اس طرح پھر لندن کا بھی سفر ہوا۔لیکن ہر نئے سفر ہر ابن کنول حج بیت اللہ کے سفر کا ذکر نا نہیں بھولتے ہیں ایسا لگتا ہے حج بیت اللہ کے سفر نے ان کے دل پر گہرے نقوش چھوڑے تھے۔لندن کا سفر بھی ادبی تھا ان کے ساتھ ملک اور بھی کئی اردو ادب کے عالم ساتھ تھے۔اس سفر میں انہوں نے انگریزوں کے ہندوستان میں قیام اور لندن کی زندگی کو بیان کیا ہے۔لندن کے سفر کا حال بھی کچھ امریکہ جیسا ہی ہے۔وہاں کی ترقی وہاں کی جدید طرز زندگی کا حال اور لندن میں اردو زبان کے حالات اور وہاں موجود اردو کے مداح جو دیار غیر میں اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں ان کا حال بہت ہی خوبصورتی سے بیان کیا۔

2003 میں لندن سے واپسی پر پاکستان کے شہر فیصل آباد کا سفر ہوا۔فیصل آباد میں ایک ادبی کانفرنس میں شرکت کی دعوت پر پاکستان جانے کا موقع ملا۔ پڑوسی ملک کا سفر کیا اور وہاں کی زندگی و حالات جو ہمارے ملک کی طرح ہیں کا ذکر کیا ہے۔یہ بھی سفر ادبی تھا وہاّ ایک عالمی سیمینار میں مقالہ پڑھنا تھا۔اس بار بھی ان کے ساتھ ہندوستان دے اعر بھی کئی ساتھی پاکستان جا رہے تھے پاکستان کے اس سفر کا بھی انہوں نے بہت دلچسپ حالات کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد پھر 2008 میں پاکستان کے شہر پشاور کا سفر کرنا پڑا یہ سفر بھی ادبی تھا اد بار بھی عالمی سیمینار کا حصہ بننا تھا۔پشاور کی تاریخی حیثیت سب کو پتا ہے یہاں کیمتعلق بھی لکھنے جو بہت کچھ تھا لہذا انہوں نے پشاور شہر کے سفر کے بھی بہت دلچسپ حالات بیان کئے ہیں۔

اس کے بعد سیر وتفریح کے غرض سے مع اہل وایال متحدہ عرب امارت کا سفر کیا یہ سفر خالص تفریحی تھا اس سفر کے دوران انہوں نے گذشتہ برسوں میں عرب دنیا کی صورت حال میں انقلابی تبدیلیوں اور ترقی کا ذکر بخوبی کیا ہے اور وہاں موجود ہندوستانیوں کا حال بھی بھی لکھا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے روس کے ماسکو سفر کا حال لکھا ہے یہ سفر بھی ادبی نوعیت کا رہا روس اور ہندوستان کے تعلقات

بہت پرانے رہے ہیں۔اس سفر کے دوران اردو زبان کی روس میں ماضی اور مستقبل کا بھی حال لکھا ہے ویسے ماسکو اردو والوں کے لیے ایک زمانے میں بہت اہم ہوا کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ابن کنول نے ماسکو شہر کا اپنے آنکھول دیکھا حال بیان کیا ہے جو بہت ہی دلچسپ اور ایک بار پڑھنے لائق ہے۔۔

چار کھونٹ میں آخری بیرو ملک کا سفر کا بیان ازبکستان کا ہے اس ملک کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے۔دیو مالائی کہانیوں کے حوالے سے کافی مشہور ہے اور اسلامی شناخت اور اسلامی تاریخ بھی اہم ہے۔یہ سفر بھی ادبی رہا ادسفر پر بھی انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے اس سفر نامہ کو بدقسمتی پڑھ کر ازبکستان کے حسین وادیوں اور دیو مالائی کہانیوں اور ادتاریخ سے واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔

آخر میں انہوں سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا کے مصداق اپنے ملک کے مختلف شہروں اور مشہور جگہوں کا احوال اور لکھا ہے۔جو عام طور پر لوگوں کے نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔اپنے ہی ملک کے کئی مقامات ہیں جن دے عام لوگ واقف نہیں ہے۔پروفیسر ابن کنول کے سفر نامہ ہمیں ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں سے واپسی بہت تکلیف دہ ہے ہم انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ کتاب کے آخری صفات تک پہنچتے ہی قاری کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ سلسلہ حاری رہے۔آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ جو لوگ دنیا کی سیر گھر بیٹھے کرنا چاہتے ہوں چار کھونٹ کے چار چکر لگائیں۔

آج جب ہم ن بآسانی جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے بھی موبائل فون کے ذریعے دنیا کو دیکھ سکتے ہیں لیکن پروفیسر ابن کنول کی چار کھونٹ جدید ٹیکنالوجی کے دور میں بھی اپنی طرف مائل کرتی ہے۔

ابن کنول نے اردو ادن کے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنے نقوش ثبت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔بعض لوگ خود نہیں بولتے ان کا کام بولتا ہے۔ادب میں آپ کا کام ہی بولتا ہے اس معاملے میں ابن کنول کے خدمات ناقابل فراموش ہیں ان کے اردو زبان وادب کے لئے خدمات بے لوث ہیں اور ان کا یہی کام ان کو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

ادب میں عہدے نہیں کام بولتا ہے میاں
وہ ایک شخص اکیلے ادارہ لگتا ہے

***

ہماری ہر حکومت کسی نہ کسی بندی پر ضرور توجہ دیتی ہے جو براہ راست بندوں کو متاثر کرتی ہے۔

لاک ڈاؤن-ابن کنول

پروفیسر ابن کنول کی سفرنامہ نگاری

ڈاکٹر محمد عامر
002-نرمدا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی
موبائل نمبر:9868561984
ای میل: mohdamir56@gmail.com

پروفیسر ابن کنول کا شمار اکیسویں صدی عیسوی کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ پروفیسر ابن کنول بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، خاکہ نگار، نقاد، محقق اور سفرنامہ نگار ہیں۔ انھوں نے جس صنف پر بھی قلم اٹھایا اس کا پورا حق ادا کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات ادبی دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی رہی ہیں۔ جہاں انھوں نے افسانہ، خاکہ اور تحقیق وتنقید کو اپنی گراں مایہ تصنیفات دی ہیں، وہیں سفرنامہ لکھ کر اس کی روایت کو مستحکم بھی بنایا ہے۔ پروفیسر ابن کنول کے سفرناموں کا مجموعہ 'چار کھونٹ' اکیسویں صدی عیسوی کے اہم سفرناموں میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ 'چار کھونٹ' میں ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ غیر ممالک کی بھی روداد سفر کو بیان کیا ہے۔ ہاں! اس میں ہندوستان کے مختلف شہروں کی جو روداد سفر بیان کی گئی ہے اس میں وہ تفصیلات نظر نہیں آتی ہیں جو غیر ممالک کے روداد سفر میں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مصنف نے غیر ممالک کے روداد کو تفصیل سے بیان کر کے ان کی تہذیبی، سماجی، سیاسی اور ترقیاتی زندگی کو قاری کے سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ 'چار کھونٹ' میں پروفیسر ابن کنول نے ان تمام غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کیا ہے، جو قاری کی دلچسپی میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا تھا۔ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ 'چار کھونٹ' کے مصنف پروفیسر ابن کنول درس وتدریس سے لمبی مدت تک وابستہ تھے۔ علاوہ ازیں اردو ادب کی مختلف اصناف میں بھی طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مطالعے میں وسعت اور تجربات ومشاہدات میں پختگی دیکھنے کو ملتی ہے۔

'چار کھونٹ' سعودی عربیہ، موریشس، امریکہ، انگلینڈ اور متحدہ عرب امارات کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں کی روداد سفر پر محیط ہے، جس میں ہم ان شہروں کی سماجی، تہذیبی، سیاسی اور ترقیاتی زندگی کو پروفیسر ابن کنول کے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ سفرنامہ دوران سفر پیش آنے والے ان واقعات وحادثات کا دلچسپ بیان ہے، جس کو مصنف اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں پیش کرتا ہے۔ واقعات وحادثات میں اہم اور غیر اہم کی پہچان ہی سفرنامے کی جان ہے۔ ظاہر ہے کہ اہم اور غیر اہم کی تفریق تبھی کی جاسکتی ہے جب مطالعے میں وسعت اور تجربات ومشاہدات میں پختگی ہو۔ اس بات کا اندازہ اپنے آس پاس کے لوگوں سے بخوبی کر سکتے ہیں، کیوں کہ جب ایک عام آدمی روداد سفر بیان کرتا

ہے تو ایسی باتوں کا بھی ذکر کر دیتا ہے، جس کا نہ تو سماجی اور نہ ہی تہذیبی زندگی سے کوئی سروکار ہوتا ہے۔ وہیں دوسری طرف جب ایک ادیب اور دانش ور روداد سفر بیان کرتا ہے تو اس کی نظر دوران سفر اہم چیزوں اور جزئیات پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اور دانش ور کے سفر ناموں کو ہر دور میں سراہا گیا ہے۔ لہٰذا جب ہم 'چار کھونٹ' میں شامل سفر ناموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں پیش کی گئی روداد سفر مستقبل میں مستند ماخذ تصور کیے جائیں گے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ 'چار کھونٹ' کے مصنف پروفیسر ابن کنول لمبی مدت تک درس وتدریس سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بیشتر سفر بحیثیت ادیب کیا ہے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان تمام ممالک اور شہروں میں جن میں انھیں سیمینار یا کانفرنس کے لیے مدعو کیا گیا تھا ان کا ذکر جب وہ اپنے سفر نامے میں کرتے ہیں تو ان میں سیمینار کی روداد اور ادبی سرگرمیاں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ہاں! سعودی عربیہ کا سفر ایک خاص مذہبی عقیدت کے تحت کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب کے روداد سفر میں ہمیں نہ تو کہیں ادبی سرگرمیاں نظر آتی ہیں اور نہ ہی وہ سیاحت نظر آتی ہے جو دیگر سفر ناموں میں دیکھنے کو ملتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سفر پروفیسر ابن کنول نے بغرض حج بیت اللہ کے کیا تھا۔ اسی لیے اس سفر نامے میں مذہبی مقامات اور اس کے تئیں تاثرات ہی زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں، لیکن اس سفر نامے کو بھی پروفیسر ابن کنول نے اپنے وسیع مطالعے اور تجربات ومشاہدات کی بدولت ایک دستاویز بنا دیا ہے، کیوں کہ اس میں بہت سی ایسی باتوں کا ذکر ہے جو کہ روداد سفر ہونے کے ساتھ معلوماتی ذخیرہ ہے، اور ان تمام لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے جو حج بیت اللہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس سفر نامے میں ان تمام مقامات کی انفرادیت واہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''30/جنوری کو مسجد نبوی میں پہلی نماز ادا کی۔ یہ مسلمانوں کے لیے دوسری مقدس ترین مسجد ہے۔ اس کی تعمیر 623 عیسوی میں کی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ہجرت کر کے یثرب یعنی مدینہ پہنچے تو اپنے گھر کے برابر مسجد کے لیے دو یتیموں سے یہ زمین خریدی۔۔۔۔۔ ابتدا میں مسجد اقصیٰ کی جانب قبلہ تھا، بعد میں کعبہ کی طرف تبدیل کیا گیا۔۔۔۔۔۔ مدینہ کا قدیم نام یثرب تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا نام مدینہ تجویز کیا۔۔۔۔ مسجد نبوی 623 عیسوی میں جب تعمیر ہوئی تھی تو اس کا کل رقبہ 1050 میٹر تھا اور صرف تین دروازے تھے۔ مختلف ادوار میں توسیع کے بعد اس کا رقبہ 235000 مربع میٹر میں ہے اور 41 دروازے ہیں۔ میناروں کی تعداد بھی دس ہے۔ یہ توسیع شاہ فہد بن عبدالعزیز نے 1994ء میں کرائی''۔[1]

درج بالا اقتباس سے ہم پروفیسر ابن کنول کے وسیع مطالعے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حج بیت اللہ کے روداد سفر میں پروفیسر ابن کنول نے صرف جزئیات پر ہی نظر نہیں رکھی، بلکہ وہ تمام مقامات جو اسلامی نقطۂ نظر سے اہم تھے ان کی تاریخی

حیثیت کو بھی بیان کیا ہے، جس سے ان کا تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی مزاج عیاں ہوتا ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے سعودی عرب کے روداد سفر میں صرف مذہبی مقامات کی ہی تاریخی حیثیت کو واضح نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے اس شہر کو بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جس کا ذکر احادیث وتواریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے سعودی عربیہ کی مقدس سرزمین پر قدم رکھا تو ان کی نگاہ قدیم سعودی عربیہ کو ہی ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''سڑک کے دونوں طرف پتھریلا میدان تھا، نگاہیں اونٹوں اور کھجور کے باغوں کو تلاش کر رہی تھیں، لیکن نہ اونٹ نظر آئے نہ باغات۔ البتہ میدانوں کو دیکھ کر ذہن میں تاریخ کے ابواب کھل گئے۔ حبشہ کی ہجرت سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل تک کے واقعات یاد آ گئے۔ ریت میں اَٹے قافلے نظر آنے لگے، گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ اونٹ دوڑتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ تاریخ کے اوراق جب کھلتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان بے یار و مددگار لوگوں نے صرف ایمانی طاقت کی بنیاد پر دنیا کو فتح کر لیا تھا اور آج دولت کی فراوانی اور تمام سہولتوں کے باوجود دنیا کی سب سے کمزور قوم مسلمان ہے''۔ 2

درج بالا اقتباس میں ماضی کی بازیافت کو جس جذباتی انداز میں پروفیسر ابن کنول نے پیش کیا ہے اس میں سعودی عرب کی ترقی اور قدیم تہذیب کا تصادم نظر آتا ہے، کیوں کہ مصنف کو یہاں پر وہ سعودی نظر نہیں آیا جس کو انھوں نے احادیث وتواریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا یا بزرگوں سے سن رکھا تھا۔ بہر حال سعودی عرب کے روداد سفر میں وہاں کی تہذیبی وسماجی زندگی کا وہ منظر نہیں دکھائی دیتا ہے جو دیگر سفرناموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سفر میں مصنف ایک مذہبی فریضہ ادا کر رہے تھے، جس میں ایام قیام کی ایک مدت اور جگہ متعین کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سفرنامے میں حج بیت اللہ کے وہ تمام فرائض اور جزئیات نظر آتی ہیں جو دوران حج ضروری ہیں، جسے پروفیسر ابن کنول نے پوری باریک بینی سے پیش کر کے اس کی تاریخی اہمیت کو بھی صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیا ہے۔

'چار کھونٹ' کا دوسرا سفرنامہ امریکہ کے روداد سفر پر محیط ہے۔ پروفیسر ابن کنول کا یہ وہ پہلا سفرنامہ ہے، جو سیاحتی نقطۂ نظر سے کافی اہم ہے۔ ویسے تو انھوں نے یہ سفر ایک امریکی باشندے کے دعوت نامے پر ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے کیا تھا۔ اس سفرنامہ میں پروفیسر ابن کنول سفر کی ابتدا سے لے کر واپسی تک کی ان تمام باتوں کا ذکر بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے، جو فن سفرنامہ کے نقطۂ نظر اہم ہیں۔ اس سفر میں پروفیسر ابن کنول کی حیثیت ایک ادیب کی تھی، لیکن روداد سفر رقم کرتے وقت سیمینار کی روداد بیان کرنے سے شعوری طور پر گریز کیا ہے، کیوں کہ پروفیسر ابن کنول کی نظر نے امریکہ کی ترقی یافتہ زندگی کو زیادہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے، جس کے لیے امریکہ عالمی سطح پر جانا جاتا ہے۔ امریکہ کی ترقیات کے علاوہ پروفیسر ابن کنول نے وہاں کے قدرتی مناظر اور تہذیبی زندگی کو بھی بے باکی سے پیش کیا ہے۔ اور امریکہ کو اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں دیکھنے

کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے امریکہ کی تہذیبی وسماجی زندگی کی تاریخ کو رقم کر کے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ امریکہ کے لوگوں کی طرز زندگی کیسی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے روداد سفر میں کھانے کے انواع واقسام اور بازاروں کی رونقیں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> سین فرانسسکو کے بازار میں پیدل گھومے، سڑکوں کے اطراف بڑے شوروم تھے۔ کشادہ سڑکیں تھیں۔ فٹ پاتھ بنانے میں بھی فراخ دلی سے کام لیا گیا تھا۔ جن پر کرتب دکھانے والے اپنے کرتب بھی دکھا رہے تھے۔ مصور لوگوں کو سامنے بٹھا کر تصویریں بھی بنا رہے تھے، زیادہ مصور تھائی لینڈ، ملیشیا اور انڈونیشیا کے تھے۔ ایک جگہ رک کر ہم لوگوں نے مچھلی کے کباب کھائے، کباب کھاتے وقت ذرا سی جھجک محسوس نہیں ہوئی، اس لیے کہ مچھلی تو ہر حال میں حلال ہے۔ قریب دس بجے رات کو وہاں سے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ رات کا منظر بڑا خوبصورت لگ رہا تھا، تمام پہاڑوں پر روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا ستارے نیچے اتر آئے ہیں یا زمین آئینہ بن گئی ہے اور ستاروں کا عکس نظر آرہا ہے''۔ 3

درج بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر ابن کنول کو امریکہ کے سفر میں کن چیزوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اور یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مذکورہ اقتباس میں جن مناظر کی تصویر کشی کی ہے اس کے پیچھے سفرنامہ نگار کا کیا مقصد ہے۔ 'چار کھونٹ' کے تقریباً سبھی سفرناموں میں جو یکسانیت نظر آتی ہے وہ غیر ممالک کی ترقیات کے ساتھ اس کی تہذیبی زندگی کی تصویر کشی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی روداد سفر رقم کرتے وقت مصنف نے جہاں اس کی سماجی وتہذیبی زندگی کو پیش کیا ہے، وہیں اس کے دوسرے رخ کو بھی پیش کر کے اس ملک کی حقیقت کو واضح کر کے اپنے قارئین کو امریکہ کے دوسرے رخ سے روشناس کرایا۔ امریکہ جیسے ملک کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں ایسے خیالات گردش کرنے لگتے ہیں گو کہ امریکہ میں مذکورہ بالا اقتباس میں پیش کیے گئے مناظر ہو ہی نہیں سکتے ہیں، مگر ہم اس سفرنامے سے اس امریکہ کو جان سکے جسے پروفیسر ابن کنول نے پیش کیا ہے۔ تقریباً یہی انفرادیت ان کے تمام سفرناموں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ پروفیسر ابن کنول امریکہ تو بحیثیت ادیب مدعو کیے گئے تھے، مگر روداد سفر رقم کرتے وقت اجمالاً ادبی سرگرمیوں کو بیان کیا ہے اور ایک سیاح کی طرح ہمہ وقت وہاں کے قدرتی مناظر کو ہی دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ سفرنامے کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ امریکہ کے تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر کو دیکھنے میں ہی زیادہ دلچسپی لیا کرتے تھے۔ ہاں! غیر ضروری تفصیلات سے گریز کر کے اہم اور منفرد چیزوں کو اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں بیان کیا ہے، جس میں نظر جزئیات پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم امریکہ کی اس زندگی سے واقف ہوجاتے ہیں جسے اکثر لوگ بیان کرنے سے گریز کر جاتے ہیں۔ بہر حال امریکہ کی روداد سفر رقم کرنے میں پروفیسر ابن کنول نے جہاں امریکہ کی سماجی زندگی کو پیش کیا ہے، وہیں اس کے قدرتی مناظر کو بھی پیش کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

14 / جون کو Red Wood Grove Nature Cantre چلنے کا پروگرام بنایا گیا۔ قدرتی مناظر کا یہ مرکز Santa Cruz میں ہے۔ یہاں زیادہ تر ایسے درخت ہیں جن کی لکڑی سرخی مائل ہے اور ڈیڑھ دو ہزار سال پرانے ہیں۔ درختوں کی لمبائی بہت زیادہ ہے، سب سے بڑا درخت 280 فٹ لمبا ہے، جس کے تنے کی موٹائی 17 فٹ ہے۔ ایسے ہی سرو قد اور طویل القامت درختوں کے تنے بجلی کے کھمبوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیلی فورنیا میں تو جنگلات بہت زیادہ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لوہے یا سیمنٹ کی جگہ بجلی کے تاروں کو ان اونچے اور سیدھے درختوں سے باندھا گیا ہے۔ اس قدرتی مرکز کو دیکھنے ہزاروں سیاح آتے ہیں۔ پہاڑوں اور سمندروں نے مناظر کو اور خوبصورت کر دیا ہے''۔ 4

'چار کھونٹ' میں موریشس کا سفرنامہ کافی اہم اور معلوماتی ہے۔ موریشس بھی پروفیسر ابن کنول بحیثیت ادیب عالمی اردو کانفرنس کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ حج بیت اللہ کے علاوہ تقریباً تمام غیر ملکی سفر پروفیسر ابن کنول نے بحیثیت ادیب کیے تھے، لیکن انھوں نے ایک سیاح کی حیثیت سے ان ممالک کو دیکھنے و سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر سفرناموں میں تحقیق و تاریخ سے دلچسپی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ موریشس کو بھی پروفیسر ابن کنول ایک سیاح کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی اس کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی سماجی و تہذیبی زندگی کو دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موریشس کا سفرنامہ تاریخی نوعیت سے کافی اہم ہو جاتا ہے۔ موریشس میں پروفیسر ابن کنول نے اپنی زیادہ تر توجہ قدرتی مناظر، اس کی آب و ہوا اور کاشت کاری پر صرف کی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگست میں موریشس کا موسم اچھا ہوتا ہے، کبھی بارش بھی ہونے لگتی ہے۔ ہلکی ہلکی سردی تھی۔ رات کے سناٹے میں سمندر کی لہروں کی آوازیں خوف بھی پیدا کرتی ہیں۔ سمندر میں دور جہازوں کی روشنیاں بھی نظر آتی ہیں۔ فضا میں بالکل آلودگی نہیں تھی، اسی لیے آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے صاف نظر آ رہے تھے، جو دہلی میں ڈھونڈنے پڑتے ہیں''۔ 5

بہر حال موریشس کے سفر میں پروفیسر ابن کنول نے وہاں کے قدرتی مناظر کے علاوہ وہاں کی سماجی زندگی، رہن سہن اور تقریبات وغیرہ کو بھی قریب سے دیکھا اور اپنے سفرنامے میں بخوبی پیش کر دیا۔

'چار کھونٹ' کے اہم سفرناموں میں انگلینڈ کا سفرنامہ منفرد مقام رکھتا ہے، کیوں کہ اس سفر میں بھی پروفیسر ابن کنول ایک ادیب کے ساتھ ایک سیاح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے انگلینڈ کو علمی و ادبی نظریے سے دیکھنے کے ساتھ اس کی ترقیات کو بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سفرنامے میں پروفیسر ابن کنول کے تجربات و مشاہدات دوسرے سفرناموں کی بہ نسبت الگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سفرنامے میں انھوں نے انگلینڈ کی سماجی و تہذیبی زندگی کے ساتھ یہاں کی

ترقیات اور علمی وادبی شخصیات کا ذکر بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔ انگلینڈ کے سفر میں پروفیسر ابن کنول نے مختلف تاریخی مقامات کی سیر وتفریح کے علاوہ وہاں کے بازاروں، ریستوران، یونیورسٹی اور میوزیم وغیرہ کو بھی باریکی سے دیکھا اور سفرنامہ کی شکل میں رقم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انگلینڈ کے روداد سفر میں جہاں ہمیں کھانے کی انواع واقسام، سماجی وتہذیبی زندگی، بازار اور گلی کوچے دکھائی دیتے ہیں وہیں وہاں کی عالیشان عمارت، یونیورسٹیز اور میوزیم کے علاوہ وہاں کی مشہور ومعروف علمی وادبی شخصیات سے بھی واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ انگلینڈ کی ادبی، علمی اور تہذیبی وراثت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''برٹش میوزیم کی عمارت دیکھ کر انگریزوں کی اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ یہ لوگ اپنی علمی، ادبی اور تہذیبی وراثت کی حفاظت پر کس قدر توجہ دیتے ہیں۔ انتہائی عظیم الشان عمارت ہے، دیکھ کر کسی محل کا سا گمان ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے بادشاہ قلعے اور مقبرے بنانے میں لگے رہے اور اسی میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا میوزیم ہے۔ اس میں پوری دنیا کی تاریخ وتہذیب کی نشانیاں محفوظ ہیں۔ انگریزوں کو قدیم وجدید ہر طرح کی چیزیں اکٹھا کرنے کا شوق ہے، انھیں چاہے وہ نوادرات خریدنے پڑیں یا لوٹنے پڑیں۔ جن ملکوں پر انھوں نے قبضہ کیا وہاں لوٹ مار کرنا تو ان کا قانونی حق بن گیا تھا''۔ 6

انگریزوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی حکومت میں ایک وقت ایسا تھا جس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک کو اپنے قبضے میں علم وحکمت کی بنیاد پر لیا تھا، وہ جس ملک میں بھی رہے وہاں کی دولت کے ساتھ وہاں کے نایاب ذخیرے (جن میں کتب بھی شامل تھی) اپنے ملک لے گئے جن کی انھوں نے صرف قدر ہی نہیں کی، بلکہ اسے تہذیبی وراثت کے طور پر آج بھی محفوظ رکھا ہے۔ درج بالا اقتباس میں پروفیسر ابن کنول نے جن مشاہدات کو بیان کیا ہے وہ کئی باتوں کی طرف دعوت فکر دیتے ہیں۔ اول یہ کہ دنیا میں اسی قوم نے ترقی حاصل کی جنھوں نے اپنی تہذیبی وراثت کو سنبھال کر رکھا، دوسرے یہ کہ محنت ومشقت اور دوراندیشی ہی اصل ترقی کا راز ہے۔ آج ہم ان ممالک سے ترقیات میں پیچھے اس لیے ہیں کہ ہم نے اپنی تہذیبی وراثت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اگر آدمی ذرا سی ہمت کرے تو لندن کے تمام اہم مقامات کو قدموں ہی سے روند سکتا ہے۔ دراصل شاہانِ برطانیہ زیادہ فضول خرچ نہیں تھے۔ باپ دادا کی عمارتوں میں ہی تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ رہتے رہے، جب کہ انھوں نے پوری دنیا سے اتنی دولت لوٹی کہ خاندان کے ہر فرد کے لیے قلعہ بنوا سکتے تھے۔ انھوں نے یہ دولت دیگر ترقیاتی کاموں اور تعلیمی اداروں پر خرچ کی۔ ہمارے بادشاہوں نے تمام وقت اور دولت قلعے بنوانے میں صرف کی۔ ہر بادشاہ نے اپنے لیے نیا قلعہ بنوایا۔ باپ

کے بنوائے ہوئے قلعے میں بھی رہنا پسند نہیں کیا''۔ 7

بہرحال انگلینڈ کے روداد سفر میں پروفیسر ابن کنول نے وہاں کی ترقیاتی زندگی کے ساتھ وہاں کے علمی وادبی ماحول کا بھی احاطہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے وہاں کی طرز رہائش کے ساتھ بازاروں کی رونق کو بھی دائرۂ کار میں لایا ہے، جس سے کہ ہم انگلینڈ کی سماجی زندگی کے بہت سے اہم گوشوں سے واقف ہوجاتے ہیں۔

متحدہ عرب امارات کا نام سنتے ہی ہمارا ذہن برج خلیفہ کی آسمان چھوتی عمارت کی طرف چلا جاتا ہے۔ ذہن کا اس طرف جانا بھی لازمی ہے، کیوں کہ قدرت نے قیمتی ذخیروں کو اس کی زمین کے اندر پوشیدہ کیا ہے، جسے یہ لوگ نکالنے میں کامیاب ہوگئے ہیں، جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ عالیشان زندگی کے ساتھ عالیشان عمارت بنوا کر دنیا پر فوقیت لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ متحدہ عرب امارات ایک مدت تک غیر ممالک کے قبضے میں رہا ہے۔ جس کے چلتے یہاں کے باشندوں نے ایک مدت تک غلامی کی زندگی گزاری تھی، لیکن آزادی ملنے کے بعد متحدہ عرب امارات نے ایسی برق رفتاری سے ترقی کی کہ تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آج ان ممالک کے حالات معاشی اعتبار سے اتنے بہتر ہوگئے ہیں کہ دنیا کے دوسرے ممالک کے لوگ یا تو سیر وتفریح کی غرض سے وہاں جاتے ہیں یا تو تجارت کے سلسلے میں۔ متحدہ عرب امارات جہاں سیر وتفریح کا مرکز بنا ہوا ہے، وہیں اس نے روزگار کے بہت سارے وسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں دوسرے ملک سے لوگ بغرض سلسلۂ روزگار جاتے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے متحدہ عرب امارات کا سفر محض سیر وتفریح کی غرض سے اپنے اہل خانہ کے ساتھ کیا تھا۔ اس سفر میں بھی پروفیسر ابن کنول خالص سیاح کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اور ایک سیاح کی طرح وہاں کی ترقیاتی زندگی اور قدرتی مناظر کو دیکھا اور اسے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں صفحۂ قرطاس پر رقم کردیا۔ متحدہ عرب امارات کے روداد سفر میں جہاں ہم وہاں کی ترقیات کو دیکھتے ہیں، وہیں ہم دوسرے ممالک سے بغرض سلسلۂ روزگار آئے ہوئے ان مزدوروں کو بھی دیکھتے ہیں جو چند پیسوں کی خاطر اپنے اہل خانہ سے دور وہاں خستہ حالی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے اس سفرنامے میں جہاں متحدہ عرب امارات کی چکاچوند زندگی کو پیش کیا ہے، وہیں وہاں کی اس زندگی کو بھی دائرۂ کار میں لایا ہے، جس سے اکثر لوگ نابلد ہیں۔ ہم نے خلیجی ممالک سے متعلق جب بھی کہیں پڑھا یا کسی سے سنا تو اس کی چکاچوند بھری زندگی اور آسمان چھوتی بلند عمارتوں کو ہی سن کر محو ہوجاتے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے بھی اپنے اس سفرنامے میں وہاں کی آسمان چھوتی عمارت اور چکاچوند بھری زندگی کو پیش کیا ہے، لیکن انھوں نے ان مزدوروں کی زندگی کو بھی قریب سے دیکھنے کی کوشش کی، جو دوسرے ملکوں سے بغرض تلاش معاش کے سلسلے میں وہاں جاتے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ہم بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ یہاں آخر ایسا کیا ہے جو ان لوگوں کو ہندوستان آکر آلودگی، گندگی اور لوگوں کی طرز زندگی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے، جب کہ اسی آلودگی اور گندگی میں رہ کر جوان ہوئے ہیں۔ عجیب بات

ہے کہ جب ہمارے ملک سے لوگ باہر جاتے ہیں تو پلٹ کر آنا نہیں چاہتے۔انھیں اپنے وطن کی ہر چیز میں عیب نظر آنے لگتا ہے۔دوسرے ملک کا کالا رنگ بھی اچھا لگتا ہے''۔ 8

درج بالا اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پروفیسر ابن کنول وہاں کی طرز زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ادیب حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ پروفیسر ابن کنول ایک فعال ادیب ہیں،جن کا سماجی زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ متحدہ عرب امارات کی چکا چوند بھری زندگی کے درمیان کئی ایک حقیقت کا انکشاف کیا ہے،جس سے اکثر ہندوستانی نابلد ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ متحدہ عرب امارات کی عالیشان زندگی کے بیچ ایک اور زندگی ہے، جسے اکثر لوگ بیان کرنے سے گریز کر جاتے ہیں،لیکن پروفیسر ابن کنول تو سیاح کے ساتھ ادیب بھی ہیں،تبھی تو ان کی نگاہوں سے مزدوروں کی زندگی اوجھل نہ ہوسکی،اور اسے بیان کرنے میں بالکل دریغ محسوس نہیں کیا۔اقتباس دیکھیے:

''سونا پور کی زندگی دبئی سے بالکل الگ ہے۔مزدوروں کی یہ بستی دبئی میں آکر بھی اپنے ہی وطن جیسی زندگی گزار رہی ہے۔گھر والے خوش ہیں کہ بیٹا یا شوہر دبئی میں ہے، یہ نہیں جانتے کہ وہ سب کے آرام و آسائش کے لیے کتنی جدوجہد کر رہا ہے۔۔۔۔۔سونا پور میں لاکھوں مزدور رہتے ہیں،علی الصباح اٹھتے ہیں،نہانے دھونے کے بعد ناشتہ کر کے بسوں میں شہر کی طرف چلے جاتے ہیں۔رات کو تھکے ہارے واپس آتے ہیں۔ اپنے اپنے گھر ٹیلی فون پر باتیں کرتے ہیں، ٹیلی ویژن دیکھ کر وقت گزارتے ہیں۔ ٹیلی ویژن ان مزدوروں کی تفریح کا اہم ذریعہ ہے۔ یہاں مقامی لوگوں نے کرایے کے لیے یہ عمارتیں بنا رکھی ہیں، ہزاروں درہم ان مزدوروں سے کرایے کے طور پر وصول کیے جاتے ہیں۔ رومی نے مجھے کمرے بھی دکھائے اور غسل خانے اور باورچی خانے میں بھی لے گیا۔ایک بڑے سے ہال میں بہت سے گیس کے چولھے رکھے ہوئے تھے،جن کے درمیان چھوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی کر کے تقسیم کر دیا گیا تھا،انہی چولھوں پر مزدور اپنا کھانا بناتے ہیں۔ یہاں خواتین نہیں رہتیں،صرف مردوں کی بستی ہے۔ یہاں کے رہنے والے برصغیر کے لوگ یہ سوچ کر خوش ہیں کہ ہم سونا پور یعنی The City of Golden میں رہتے ہیں''۔ 9

درج بالا اقتباس ان مزدوروں کی زندگی کو عیاں کرتا ہے جو تلاش معاش کے لیے خلیجی ممالک جا کر اپنے اہل وعیال کو چند خوشیاں دینا چاہتے ہیں،لیکن اپنے اہل وعیال کی خوشیوں کی خاطر یہ مزدور کس اذیت ناک زندگی میں مبتلا ہوتے ہیں،شاید کہ اس کا ان کے اہل خانہ کے لوگ تصور تک نہیں کر سکتے ہیں اور ہم ان کے متعلق اکثر یہی سوچتے ہیں کہ جو مزدور خلیجی ممالک میں تلاش معاش کے سلسلے میں جاتے ہیں وہاں کے شیوخ کی طرح نہیں تو کم از کم اچھی زندگی ضرور گزارتے ہوں گے۔ایسا ہم اس لیے بھی سوچتے ہیں یہ لوگ اپنے وطن آکر جب وہاں کی روداد زندگی بیان کرتے ہیں تو کہیں سے خود کو مظلوم و مجبور ثابت نہیں ہونے دیتے اور ایسا اکثر لوگ کرتے ہیں جو خلیجی ممالک میں تلاش معاش کے سلسلے میں جاتے ہیں، چوں کہ ہم ان ممالک کی

عالیشان زندگی سے کچھ اس قدر واقف ہیں کہ پروفیسر ابن کنول نے متحدہ عرب امارات میں برصغیر کے مزدوروں کی جس طرز زندگی کو بیان کیا ہے، اس کا گمان تک نہیں کرتے کہ واقعی ایسی طرز زندگی اور رہائش وہاں بھی ہوتی ہوگی۔ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں ادیب حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ پروفیسر ابن کنول سفر میں ایک سیاح کے ساتھ ایک ادیب کی حیثیت سے بھی موجود ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حساس طبیعت نے متحدہ عرب امارات کی چکا چوند بھری زندگی کے بیچ ایسی طرز زندگی سے ہمیں روشناس کرایا ہے، جسے بیان کرنے سے اکثر لوگ گریز کر جاتے ہیں، لیکن انھوں نے اس طرز زندگی اور رہائش سے پردہ اٹھا کر اپنے سفرنامے کو زندگی کا ترجمان بنا دیا ہے، بلکہ بہت سارے لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔ ایک طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ممالک کی چکا چوند بھری زندگی ان مزدوروں کی قربانیوں پر منحصر ہے جو چند خوشیوں کے لیے جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور مارشرم کی وجہ سے اپنے عزیز و اقارب سے حقیقت بھی بیان نہیں کر پاتے ہیں۔

'چار کھونٹ' میں پاکستان، ماسکو اور ازبکستان کا سفرنامہ بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ پاکستان کا سفر بھی پروفیسر ابن کنول نے بحیثیت ادیب کیا تھا، لیکن روداد سفر رقم کرتے وقت انھوں نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور تقسیم ہند کے سانحے کو بھی یاد کیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے پشاور اور دلی کے بازاروں کا تقابل بھی کیا ہے، جس میں انھیں کچھ خاص فرق کا احساس نہیں ہوا، حتیٰ کہ انھیں وہاں کی سماجی زندگی میں بھی کچھ خاص فرق نظر نہیں آیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ دونوں ملک 1947ء سے قبل ایک ہی تہذیب کے پروردہ تھے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''خدا جانے ہندوستان کی تقسیم کس نے کی تھی۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ تو پاکستان میں چلی گئی، وادیٔ سندھ کی تہذیب کے آثار، موہن جوداڑو اور ٹکسلا سب کچھ تو پاکستان میں ہے۔ ہندوستان میں تو تاج محل، لال قلعہ اور قطب مینار ہیں۔ گرونانک جی مقام پیدائش پاکستان میں ہے۔ گرودوارہ پنجہ صاحب پاکستان میں ہے۔۔۔۔۔ سرحد پر آ کر دکھ ہوتا ہے، کسے معلوم تھا کہ ایک دن یہ ملک مذہب کے نام پر تقسیم ہو جائے گا، صدیوں کے رشتے ایک پل میں چند لوگوں کی خواہش پر ختم ہو جائیں گے''۔ 10

ماسکو کے روداد سفر میں پروفیسر ابن کنول نے وہاں کی علمی و ادبی ماحول اور انقلاب روس کو اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ جس انداز میں بیان کیا ہے، اس سے ماسکو کی پوری علمی و ادبی فضا ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر ابن کنول نے وہاں کے اہم مقامات کی سیر و تفریح بھی ایک سیاح و ادیب کی حیثیت سے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماسکو کے روداد سفر میں علمی، ادبی اور سیاسی فضا خوشگوار انداز میں سامنے آتی ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر ابن کنول نے وہاں کے قدرتی مناظر کو دلکش انداز میں پیش کر کے روس کی تہذیبی زندگی کو بھی عیاں کیا ہے۔ اسی طرح ازبکستان کے سفرنامے میں بھی وہاں کی سماجی زندگی کے ساتھ وہاں کے علمی ماحول کا بیان دلکش انداز میں ملتا ہے۔ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ سیاسی اور مذہبی اعتبار سے ازبکستان تاریخی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ جہاں اس سرزمین پر نامور بادشاہ پیدا ہوئے وہیں اس ملک نے جید عالم دین بھی دیے ہیں، جنھوں نے مذہب اسلام کے لیے وہ خدمات انجام دیں جسے تاریخ اسلام کے باب میں کبھی بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے ازبکستان کے سفر میں جہاں قدرتی مناظر کو نظر میں رکھا، وہیں انھوں نے عالم دین کے مزارات کی زیارت کو بھی رقم کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس ملک کا آزادی کے بعد اور قبل کا سماجی و تہذیبی تقابل بھی کیا ہے، جس کی وجہ سے قارئین پوری طرح سے ازبکستان سے

روشناس ہوجاتے ہیں۔

بہرحال 'چارکھونٹ' کے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر ابن کنول نے جس فن کاری سے اپنے تجربات ومشاہدات اور افکار ونظریات کو صفحۂ قرطاس پر رقم کیا ہے، وہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ دستاویز اس معنی میں کہ پروفیسر ابن کنول نے جس طرح ان ممالک اور شہروں کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کو پیش کیا ہے، اس کو انھوں نے تحقیق وتاریخ کی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے یہ کہ 'چارکھونٹ' میں سفرنامہ کی شکل میں ان ممالک کی تہذیبی، سماجی، سیاسی اور قدرتی مناظر کو رقم کیا ہے، وہ آنے والے زمانے میں جب ان ممالک کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی زندگی بدل چکی ہوگی، اس وقت یہ سفرنامہ اس کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی وراثت کو بیان کرے گا۔ علاوہ ازیں آنے والی نسل جب ان ملکوں کا رختِ سفر باندھے گی تو پروفیسر ابن کنول کا یہ سفرنامہ رہنمائی کا کام کرے گا۔ 'چارکھونٹ' کے آخر میں پروفیسر ابن کنول نے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کے عنوان سے بھی روداد سفر بیان کیا ہے، جس میں انھوں نے ہندوستان کے مختلف تاریخی مقامات اور شہروں کی روداد سفر بیان کی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سیر وتفریح کے علاوہ بھی ہمارے ملک میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جس کے لیے ہم دور دراز کے ملکوں کا سفر کرتے ہیں، تبھی تو انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے روداد سفر کا عنوان ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کے نام سے قائم کیا ہے۔ مجموعی طور پر 'چارکھونٹ' کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں شامل سفرنامے غیر ممالک کی سماجی، سیاسی، تہذیبی، علمی وادبی زندگی سے روشناس کراتے ہیں۔ یہ سفرنامے دور حاضر میں اہمیت تو رکھتے ہی ہیں آنے والے زمانے میں ان کی دستاویزی حیثیت بھی مسلم رہے گی۔

حواشی:

1۔ ابن کنول؛ چارکھونٹ، نئی دہلی؛ ناشر مصنف، 2022ء، ص37

2۔ ایضاً، ص۔ ایضاً، 27

3۔ ایضاً، ص80

4۔ ایضاً، ص83

5۔ ایضاً، ص106

6۔ ایضاً، ص158

7۔ ایضاً، ص169

8۔ ایضاً، ص217

9۔ ایضاً، ص226

10۔ ایضاً، ص204-211

****

Dr. Mohammad Amir
Jawaharlal Nehru University, New Delhi
Mob: 9868561984
Email: mohdamir56@gmail.com

ابن کنول کا ڈرامہ ''خواب'': ایک تنقیدی مطالعہ

ڈِمپلا دیوی
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی

ابن کنول عصر حاضر کے نامور محقق، نقاد، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور فکشن نگار تھے۔ اُردو ادب سے متعلق مختلف اصناف پر اُن کی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ابن کنول کا ڈرامہ ''خواب'' اُن کے مجموعے ''بزمِ داغ'' میں شامل تیسرا ڈرامہ ہے جو 2020ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ڈرامہ ''خواب'' کا موضوع عصر حاضر میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے حادثات اور جرائم و زیادتیوں پر مرکوز ہے۔ اس ڈرامہ میں مصنف نے یہ بتانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ عورت ہر دور میں کسی بھی غیر اور انجانے مرد کے ساتھ محفوظ نہیں ہو سکتی، وہ چاہے پولیس ہو، عدلیہ ہو یا کسی NGO یا رضا کارانہ جماعت کا کوئی رکن ہی کیوں نہ ہو۔ جس کو جہاں جیسے موقع ملتا ہے محافظ کے بھیس میں اپنے بھیڑیئے نما رروایئے کو انجام دیتا ہے۔ اس ڈرامہ میں ہوس پرستی کے ساتھ ساتھ عوام میں جڑ پکڑنے والی توہم پرستی اور بدنامی کا ڈر، لوک لاج اور خاندانی عزت کو بچائے رکھنے کی کوشش میں چاہے کسی کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے پر خاندان کی عزت کو محفوظ رکھنا ہے، جیسے سماجی عقائد پر کھل کر لکھا گیا ہے۔

ڈرامہ ''خواب'' میں ابن کنول نے ایک کردار ''نور محل'' کے خواب کے ذریعے موجودہ دور کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اُنھوں نے ہمارے اِردگرد سماج میں رہنے والے انواع اقسام کے لوگ جن میں سپاہی، معلم، درویش، بزرگ اور وہ لوگ جن کو محافظ کے طور پر دیکھا جاتا ہے، کی عکاسی کر کے یہ بتانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ موجودہ دور میں ایسے لوگوں سے ہم محفوظ نہیں ہیں۔ عورت کی حفاظت کرنے اور اُن کی عصمت بچانے کے بجائے سماج میں رہنے والے ایسے لوگ مختلف طریقوں سے اُن کا ذہنی و جسمانی استحصال کرتے ہیں۔

ڈرامہ ''خواب'' میں نور محل ہر روز ایک انجانے خواب سے دوچار ہوتی ہے اور خواب میں نجمہ کو دیکھتی ہے، جو چند روز قبل گھر سے غائب ہوئی ہوتی ہے۔ ابن کنول نے موجودہ دور کے سپاہیوں کے نقاب پوش چہرے کو بے نقاب کیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح نجمہ ایک محافظ سے بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ ڈرامے کا چھوٹا سا منظر پیش خدمت ہے:

نجمہ: مجھے میرے گھر پہنچا دیجئے میں بہت پریشان ہوں۔ بالکل تنہا ہوں۔

[سپاہی ہنسنے لگتے ہیں]

ایک سپاہی: ارے آدمی تو جہاں چاہے اُس کا گھر بن سکتا ہے۔ ہم تمہارا گھر بساتے ہیں۔

دوسرا سپاہی: ہم تمہاری پریشانی دور کرتے ہیں۔

تیسرا سپاہی: اور ہم تمہاری تنہائی دور کرتے ہیں۔

(بزم داغ از ابن کنول۔ص۔۹۸)

سپاہیوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ عوام کو لوٹ مار، دہشت گردی، چوری، رشوت خوری اور غنڈہ گردی سے محفوظ رکھے۔ ابن کنول نے ڈرامہ ''خواب'' میں کچھ ایسے سپاہیوں کے چہروں کو بے نقاب کیا ہے جو عوام کے لئے محافظ نہیں بلکہ قہر و عذاب بن جاتے ہیں۔ ڈرامے کے اس چھوٹے سے منظر سے اس بات کا بخوبی اندزہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کسی بھی وقت درندے کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ موجودہ دور پر اگر ہم نظر ڈالیں تو عورتوں کی صورتِ حال اس بات کا مکمل ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ملک آزاد ہونے کے بعد بھی عورتیں آزادی سے گھوم پھر نہیں سکتی، رات کو اکیلی باہر نہیں جا سکتی۔ اکیسویں صدی کے اس دور میں عورت خود کو محفوظ نہیں سمجھ پاتی ہے۔ ہمیشہ اس کے دل و دماغ پر دہشت و خوف طاری رہتا ہے۔

جہاں ایک طرف ابن کنول نے سپاہیوں کے چہروں کو بے نقاب کیا ہے، وہیں دوسری طرف ایک معلم جیسا حُلیہ رکھنے والے شخص کو بھی بے نقاب کیا ہے جو پہلے نجمہ کے لیے ہمدردی کا جذبہ دکھانے کا ناٹک کر کے اُس کی مدد کرتا ہے جس سے نجمہ کے دل میں اُمید کی ایک نئی کرِن جاگ اُٹھتی ہے لیکن اُسی لمحہ وہ معلم جیسا حُلیہ رکھنے والا شخص بھی اپنے ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لیے نجمہ کو اپنا شکار بناتا ہے۔

ڈرامے کے آخری حصے میں ابن کنول نے انسانی معاشرے کی ایک تلخ حقیقت بیان کی ہے کہ کس طرح سے بھولے بھالے لوگ جن پیروں، فقیروں اور درویشوں کے پاس جا کر اپنی دولت لُٹاتے ہیں، جن کو بندہِ خدا کہا جاتا ہے، لیکن لاچار خواتین کے مشکل وقت میں ایک درویش بھی اُن کی مجبوری کا فائدہ اُٹھا کر اعمال کے نام پر اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے۔ ابن کنول نے ''خواب'' میں درویش کا حُلیہ اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ درویش زرد لباس پہنے، ہاتھ میں چمٹا اور گلے میں تسبیحیں ڈال کر گھوم رہا ہوتا ہے۔ نجمہ کو اُس درویش شکل کے آدمی میں ایک خدا پرست منش نظر آتا ہے اور وہ اُس کے قدموں میں سر رکھ کر آسرا مانگتی ہے۔ مگر آسرا دینے کے بجائے درویش نما آدمی بھی اُس کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ موجودہ دور میں خواتین کے ساتھ پیش آنے والے مختلف واقعات کو ابن کنول نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آئے دن خواتین کی زندگی کن کن مسائل سے دوچار ہو رہی ہے اُس پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

زیرِ بحث ڈرامہ کے ذریعے ابن کنول نے ہمارے اِرد گرد سماج میں رہنے والی خواتین کی آپسی گفتگو کو بھی نہایت طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ نجمہ جو کہ عشرت علی کی بیٹی ہے، جو گھر سے گُم ہوتی ہے۔ اُس بچی کو حالات کے بے رحم گردش نے ماں باپ سے جُدا کیا ہوتا ہے۔ حالات کے اس بے رحم گردش سے واقفیت ہونے کے باوجود بھی خواتین کس قسم کی باتیں کرتی ہیں یہ جاننے کے لیے پیش ہے ''خواب'' کا ایک چھوٹا سا منظر:

امراؤ بیگم: ویسے میں تو کہتی ہوں کہ اگر وہ لڑکی اب نہ ملے تو اچھا ہے۔ نہ ملے گی تو کچھ رو دھو کر صبر کر لیا جائے گا۔

آخر مرنے کا بھی تو صبر آجاتا ہے لیکن اگر مل گئی تو عمر بھر کون روئے گا۔ کون اپنے گھر میں اُسے بہو بنا کر لے جائے گا۔

بلقیس: ہاں یہ بات تو ہے۔اب کون آنکھوں دیکھے اسے قبول کرے گا''۔

(بزمِ داغ از۔ابن کنول،ص۔۹۰)

ڈرامے کے اس مختصر سے منظر سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہم ایسے سماج میں رہتے ہیں جہاں والدین اپنی گُم شدہ بیٹی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔وہ یہ جانتے ہیں کہ ظالم سماج نے نجمہ کو گُم کیا ہے اُنہیں نجمہ کے غم میں رورو کے مرجانا قبول ہے مگر اُسے واپس گھر لا کر نئی زندگی دینا منظور نہیں ہے۔

نورمحل کو ہر روز آنے والا خوف زدہ اور ڈراونا سا خواب صرف نجمہ کے المیہ پر ختم نہیں ہوتا۔آج بھی ظالم سماج کی بربریت لاکھوں دوشیزاؤں کو نجمہ بنا رہی ہے اور یہ بربریت اُن دوشیزاؤں کو اپنے والدین سے جُدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

الغرض یہ کہ ابن کنول کا زیرِ بحث ڈرامہ موضوع کے اعتبار سے ہی منفرد نہیں ہے بلکہ یہ فن کے اصولوں پر بھی کھرا اُترتا ہے۔اس ڈرامے کا پلاٹ ایک گمشدہ لڑکی کے گرد بُنا گیا ہے جس کے ساتھ ہونے والی واردات نورمحل اپنے خواب میں دیکھتی ہے۔اس ڈرامہ میں نفسیاتی کرداروں کی کشمکش اور ذہنی انتشار کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس ڈرامہ کے کردار ہمارے ہی اردگرد کے رہنے والے لوگ ہیں جو کہ عصر حاضر کے معاشرہ کی ہو بہو عکاسی کرتے ہیں۔ابن کنول نے مکالمہ نگاری میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں اور پردہ خفا میں رہنے والی ایسی باتوں کو کرداروں کے مکالموں کے ذریعے اِس ہُنر مندی سے پیش کیا ہے کہ سب باتیں فطری معلوم ہوتی ہیں۔اس ڈرامہ کے مناظر بھی ٹی۔وی سکرین کی طرح آنکھوں کے سامنے چھا جاتے ہیں۔

ابن کنول کا ڈرامہ ''خواب'' اکیسویں صدی میں لکھے گئے اردو ڈراموں میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔یہ ڈرامہ صنف نازک کے ساتھ ہونے والے ظلم اور بربریت کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے بلکہ ہمارے معاشرے میں رہنے والے لوگوں کی سوچ جس میں عورتیں بھی شامل ہیں سے پردہ کشائی کرتا ہے کہ کس طرح سے لوگ ایک لڑکی کی جان سے زیادہ اپنے خاندانی رتبے،عزت،وقار کو اہمیت دیتے ہیں۔

****

حالت یہ ہوگئی کہ کوئی اپنے ہی گھر میں پھنسا کوئی غیر کے گھر میں پھنسا کسی کو میکے میں رہنے کا موقع مل گیا،کوئی سسرال میں پھنس گیا،کوئی عیادت کو گیا، پرسے کے بعد اوٹا،کوئی تین دن کے ہنی مون کے لیے گیا، چار مہینے کا چلہ لگا کر واپس آیا۔

انشائیہ لاک ڈاؤن سے ماخوذ

داستانوی رنگ وآہنگ کا تخلیق کار: ابنِ کنول

پروفیسر آفتاب احمد آفاقی
شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

ناصر محمود کمال بہ موسوم ابنِ کنول ادب کے موجودہ منظر نامے پر اپنی تخلیقی وتنقیدی تحریروں کی بنا پر سب سے فعال تصور کئے جاتے تھے۔ وہ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کنول ڈبائیوی ایک قومی شاعر کے طور پر مشہور ہیں۔ شعر و ادب سے ان کا شغف، ان کے والد کی ذہنی وفکری تربیت کا ثمرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بعد کو اعلیٰ تعلیم کے دوران علی گڑھ کی علمی وادبی فضا اور اساتذہ خصوصاً قاضی عبدالستار کی تربیت نے ناصر محمد کمال کو ادبی دنیا کا ابنِ کنول بنا دیا۔ انھوں نے اپنا ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا ایک نظم ماہ نامہ نور، رام پور میں شائع ہوئی لیکن انھیں جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ وہ اپنے احساس وجذبات کا اظہار شاعری کے بجائے نثر میں بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ چناچہ وہ ۱۹۷۲ء سے افسانہ نویسی کی طرف راغب ہوئے ان کا پہلا افسانہ 'اپنے ملے اجنبی کی طرح' ۱۹۷۴ء میں آفتابِ سحر (سکندرآباد) نامی رسالے میں شائع ہوا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی ان کا افسانہ 'بندراستے' (جو بعد میں ایک مجموعے کی شکل میں منظرِ عام پر آیا) اشاعت پذیر ہوا تو ادبی حلقے میں بڑی پذیرائی ہوئی۔

ابن کنول کا اختصاصی میدان داستان تھا، وہ داستان کی ترتیب وتدوین نیز تنقید سے دلچسپی لیتے رہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، نقاد، ڈراما نگار، خاکہ نگار تھے۔ انھوں نے ڈراموں اور سیریل میں اداکاری بھی کی تھی۔ داستانوں سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی بھی سلیکشن کمیٹی میں زیادہ تر سوالات داستانوں سے ہی پوچھتے تھے اور اچھے اچھوں کو پریشان کر دیتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے جن کے افسانوں پر داستانوی رنگ وآہنگ نمایاں ہے۔ انھوں نے درس وتدریس میں بھی بڑی فعالیت کا ثبوت دیا اور تصنیف وتالیف میں بھی ہمیشہ تازہ بہ دم رہے۔ 'بندراستے'، بزمِ داغ، چارکھونٹ، داستان سے ناول تک، ہندوستانی تہذیب بوستانِ خیال کے تناظر میں، تنقیدی اظہار، تنقید وتحسین، اردو افسانہ، تیسری دنیا کے لوگ، اصنافِ پارینہ، اردو شاعری، مضراب، اصنافِ سخن، بحرِ تجلّیات (سفرنامۂ حج) وغیرہ جیسی کتابیں ان کی اسی فعالیت کا بین ثبوت ہیں۔ ہر چند کہ انھوں نے نثری ادب پر اپنی بنائے ترجیح رکھی لیکن بحیثیت استاد کلاسیکی شعر وادب سے ان کی دلچسپی ایک فطری بات تھی۔ انھوں نے ایک طرف اردو کے کلاسیکی شعرا سے دلچسپی لی تو بعد کے اہم شعرا کی شخصیت اور فن پر مضامین لکھے۔ انھوں نے 'اردو شاعری' کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جس میں افضل پانی پتی، ولی دکنی، میر، نظیر اکبرآبادی، مصحفی، غالب، مومن کے علاوہ اقبال، حسرت، فراق، مخدوم، فیض، ن۔م راشد اور کیفی اعظمی پر مضامین شامل ہیں۔

ابنِ کنول ادب کا ایک گہرا شعور رکھتے ہیں اور فن وفنکار کے تقاضوں اور ذمہ داریوں سے کما حقہ واقف ہیں۔ ان کے نزدیک ادب میں تخلیق کو اساسی حیثیت حاصل ہے اس لئے وہ تنقید پر تخلیق کو مقدم تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں تخلیق

ہمیشہ زندہ رہتی ہے جب کے تنقید وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے اس لحاظ سے نا قدین کی اہمیت اور ضرورت وقتی ہے۔ وہ اس بات سے شاقی تھے کہ موجودہ عہد میں تخلیق کاروں کی اہمیت دوئم درجہ کی ہو کر رہ گئی ہے جب کہ تنقید کا پیشہ مال ومنعفت اور خیر و برکت کا سبب بن گیا ہے۔ اپنی کتاب 'تنقید و تحسین' میں وہ لکھتے ہیں؛ ''آج کا دور نا قدین کے لئے خیر و برکت کا دور ہے ادبی سماج میں نا قدین نے اس قدر اپنی اہمیت اور ضرورت کا احساس دلا رکھا ہے کہ ہر جگہ نا قد نظر آتا ہے جب کہ تخلیق کار کی ضرورت نا قد نہیں بلکہ نا قد کی ضرورت تخلیق کار ہے۔ تخلیق کے بغیر نا قد کی اہمیت صفر ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، پریم چند یا منٹو اس لئے بڑے فن کار نہیں ہیں کہ ان کے فن پر بہت تنقید لکھی گئی بلکہ اس لئے بڑے ہیں کہ ان کا فن بڑا ہے۔ اگر کوئی ماہرِ غالب یا ماہرِ اقبال ہے تو اس کی وجہ غالبؔ یا اقبالؔ کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ غالبؔ اور اقبال کی وجہ سے اسے شہرت نصیب ہوئی۔'' یہ درست ہے کہ ادب میں تخلیقی نگارشات کو اساسی حیثیت حاصل ہے اس لحاظ سے تخلیق کار کو نا قدین پر برتری ہونی چاہیے۔ لیکن یہ بھی سچائی ہے ک فن اور فنکار کی عظمت کا دارومدار فن پاروں کی افہام وتفہیم اور تعین قدر پر منحصر ہے۔ اور یہ ذمہ دارانہ عمل بغیر تنقید کے ممکن نہیں۔ آج میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، پریم چند۔ منٹو، بیدی، اگر ادب کا حوالہ ہیں تو اس میں بلاشبہ نا قدین کا بڑا ہاتھ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم یہ تفریق نہیں کر پاتے کہ ''ہر تحریر تخلیق نہیں ہے اور نہ ہر لکھاری کی حیثیت نقاد کی ہے''۔ ہاں موجودہ دور کی ادبی صورتحال اور رویوں پر سولات قائم کئے جا سکتے ہیں کہ ہر شخص ممتاز ادیب، نقاد اور دانشور کی صف میں کھڑا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابنِ کنول موجودہ ادبی صورتحال اور جینوئن تخلیق کاروں اور ادیبوں کی نا قدری سے افسردہ تھے ورنہ اس طرح کے خیالات رقم نہ کرتے انھیں نا قدین کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا ورنہ وہ خود تنقیدی تحریریں نہ لکھتے۔ وہ معاصر اہم نا قدین کا عقیدت کی حد تک احترام کرتے تھے۔

ابنِ کنول بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے اور اسی حیثیت سے وہ معروف بھی ہوئے اور تین افسانوی مجموعے 'تیسری دنیا کے لوگ'، 'بند راستے' اور 'خانہ بدوش' یادگار چھوڑے۔ وہ تخلیق کے تعلق سے ایک واضح نظریہ رکھتے تھے جس کی رو سے یہ ایک بے حد ذمہ دارانہ عمل ہے۔ تخلیق نہ تو تفنن طبع کے لئے وجود میں آتی ہے اور نا ہی یہ وقت گزاری کا ذریعہ ہے بلکہ اس کا بنیادی مقصد بنی نوع انسان کی صلاح وفلاح ہے۔ حالی نے بھی مقدمہ شعر وشاعری میں شاعری کی یہی غرض وغایت بتائی ہے۔ اس خیال سے اتفاق و اختلاف کی پوری گنجائش ہے لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ ادب ہمارے ذہن وفکر میں اگر گرمی اور تازگی، روشنی اور بصیرت نہ پیدا کرے تو پھر اس کی ضرورت کیا ہے؟ اپنے افسانوی مجموعہ 'بند راستے' کے دیباچے میں ابنِ کنول نے جو کچھ لکھا ہے اس سے جہاں ایک طرف ان کے نظریۂ فن سے واقفیت بہم پہنچتی ہے وہیں ادب اور زندگی سے متعلق ان کے مثبت رویوں اور تقاضوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں؛

> ''بعد ورق گردانی کے ایک قاری نے یوں استفسار کیا، اے قلمکار ذی ہوش تو کیا بیان کرنا چاہتا ہے؟ تیرا مقصد کیا ہے؟ قاری کے اس سوال پر قلمکار نے نگاہ اٹھائی اور کہا ''میں اس عالمِ آب وگل

میں ابنِ آدم کے افعال واعمال کو دیکھ کر جو کچھ محسوس کرتا ہوں قلمبند کر دیتا ہوں اور میں چاہتا ہوں
کہ میرا قاری بھی اسی درد اور احساس کے دریا سے گزرے کہ جس سے میں گزر رہا ہوں'' (ص ۸)

اس اقتباس کے چند جملے بے حد بلیغ ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں ادب کا ایک واضح شعور تھا، اور ادیب کو ایک بیحد ذمہ دار اور حساس انسان سمجھتے تھے۔ وہ 'عالم آب وگل میں ابنِ آدم کے افعال واعمال' کا احتساب کرنے کے خواہاں تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ 'ادب کو حیاتِ انسانی کی انفرادی یا اجتماعی جدوجہد کے ادراک اور اس میں ادیب کی شمولیت کے حمایتی ہیں' زندگی کی مثبت قدروں سے وابستگی اور اخلاص ومروت کی یکجائی سے پیدا ہونے والے احساس کو تخلیق کے قالب میں ڈھالنے کے عمل سے جو تخلیق وجود میں آتی ہے وہ ہمارے فکر وشعور کو روشن اور منور کرتی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر عرض کیا جا چکا ہے کہ ابنِ کنول کی ادبی سطح پر جو شناخت ہے وہ ایک معتبر افسانہ نگار کی ہے۔ ان افسانوں پر داستانوی اسلوب کے پرتو موجود ہیں۔ اپنے معاصر افسانہ نگاروں میں اپنے اسی لہجے کی وجہ سے انفرادیت رکھتے ہیں۔ یہ لہجہ ان کی داستانوں سے دلچسپی اور گہرے مطالعے کی آئینہ دار ہے یہی سبب ہے کہ داستانوی لفظیات ان کے افسانوں میں بدیہی طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دوسرے کئی افسانہ نگاروں کے یہاں داستانوی رنگ کی کارفرمائی ہے ان تخلیق کاروں کے یہاں داستانوں سے استفادہ کی مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں لیکن ماضی قریب میں اس نوع کی سب سے توانا اسلوب انتظار حسین کے یہاں نظر آتا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بیشتر افسانہ نگاروں کے یہاں یہ اسلوب انتظار حسین کا ہی فیضان ہے۔ جب کہ ابنِ کنول اس خیال سے متفق نہیں ان کا خیال ہے کہ یہ داستانوی رنگ اصلاً داستانوں کے عمیق مطالعے کا ثمرہ ہے اس ضمن میں اپنے مضمون ''اردو افسانہ اور داستانوی طرزِ اظہار'' میں وہ رقمطراز ہیں؛

''مختصر افسانہ نگاروں نے داستانوں سے مختلف انداز میں استفادہ کیا ہے۔ بعض نے اپنے افسانوں کے عنوانات اس طرح رکھے ہیں کہ ان پر داستانوں کا گمان ہوتا ہے۔ مثلاً آئینہ فروش شہر کوراں، سات منزلہ بھوت، خار پشت، چوپال میں سنا ہوا قصہ، سر بریدہ آدمی، من کا توتا، داخل ہونا بے نظیر کا بیابان میں، طلسمات وغیرہ، کچھ افسانہ نگاروں نے داستانوں کے پُرشکوہ اسلوب کو اختیار کر کے اپنے افسانوں میں داستانوی فضا تیار کی۔ بعض نے اسطور سازی کے عمل کو اپنایا۔ تمثیلی پیرائے میں بھی افسانے لکھے گئے اور جانوروں کو کردار بنا کر عصری مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا۔ چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے انداز پر افسانے لکھے گئے۔ داستانوں کی طرح مختصر افسانہ کو ضمنی کہانیوں کی شمولیت کے انداز میں بھی لکھا گیا۔ بعض افسانہ نگاروں نے داستانوں کے مافوق الفطرت عناصر اور طلسمی ماحول کے زیرِ اثر اپنے افسانوں میں طلسمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی'' (داستان سے افسانے تک ص ۷۷)

ابنِ کنول نے اپنے افسانوں میں داستانوں کے مختلف رنگ وآہنگ کو بروئے کار لایا ہے کبھی زبان کی سطح پر کبھی عنوان

کے طور پر تو کبھی لب و لہجے میں مسجع و پُرشکوہ عبارت آرائی کر کے پوری افسانوی فضا کو داستان میں تبدیل کر دیتے ہیں۔اس ضمن میں ہمارا تمہارا خدا بادشاہ،صرف ایک شب کا فاصلہ اور وارث جیسے افسانوں کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ابنِ کنول کا افسانہ'' ہمارا تمہارا خدا بادشاہ' ہمارے عہد کی سیاست پر گہرا طنز ہے۔ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اس میں سیاست ایک پاور کا روپ دھار گئی ہے۔عوام کٹھ پتلی کے مانند ہے اور اس کی ڈور سدھے ہوئے سیاست دانوں کے ہاتھ میں ہیں افسانے کی پوری فضا داستانوی ہے لیکن پردے میں موجودہ نظام پر گہری ضرب لگائی گئی ہے جس سے حکمراں طبقہ کی شعبدہ بازی،عیاری اور مکاری پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے۔حکومت کا کام اپنے عوام اور شہری کی فلاح و بہبود،اس کی ترقی و کامرانی کے امکانات وا کرنا اور اس کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔یہ اقتباس دیکھیے :'' سانپ انہیں کی گردنوں پر کیوں گرتے ہیں جن کے سروں پر اونچے مکانوں کی چھتیں نہیں ہوتیں۔جن کی زندگی کا تمام سفر پیدل طے کرنا ہوتا ہے۔جو موسموں کی تبدیلیوں کو اپنے جسموں پر برداشت کرتے ہیں۔سوچتے سوچتے جب ان کے ذہن تھک گئے تو سب نے فیصلہ کیا ہم سب جہاں پناہ کے روبرو جا کر اپنی اس مصیبت کا حال بیان کریں گے اور اس سے دتخواست کریں گے کہ وہ ہمیں اس عذاب سے نجات دلائے کہ خدا نے رعایا کی سرپرستی و محافظت اس کے ذمہ کی ہے'' اسی طرح 'صرف ایک شب کا فاصلہ' میں داستانوی رنگ غالب ہے ایمرجنسی کے زمانے کو محیط اس افسانے کا خمیر اصحابِ کہف کے واقعہ سے تیار ہوا ہے تاہم اس کے پسِ پردہ ہمارا عہد اور اس کے مسائل ہیں۔اصحابِ کہف کو اسلامی اسطور کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ایک ایسی تخلیق پیش کی ہے جس میں معنی کی کئی پرتیں موجود ہیں۔سیاست کے محور پر گردش کرنے والا حکمراں طبقہ کس قدر ظالم اور جابر ہوتا ہے اور کس حکمت،عیاری اور چالاکی سے مثبت قدروں کو تہس نہس کر دیتا ہے اس کی عمدہ مثال یہاں موجود ہے۔اصحابِ کہف جب تین سو برس کے خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو حکومت بدل چکی ہے انہیں یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ ملک میں ایک چُنی ہوئی سرکار ہے اور عوام کو اظہارِ رائے کی آزادی نصیب ہے۔تاہم ان کی خوشی اس وقت کافور ہو گئی جب ان کی مقبولیت کو حکومت اپنے لئے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ان کو گرفتار کرا لیتی ہے۔ان کا افسانہ 'صرف ایک دن کے لئے' سیاسی دوروں سے متعلق ایک حقیقت کا تخلیقی اظہار ہے جس میں وزرا اور بادشاہِ وقت کے دوروں کے دوران جھونپڑیوں،بدحال سڑکوں اور غلاظت کے ڈھیروں کو ڈھک دینے کا رواج عام ہو چکا ہے تا کہ ان کی نظر ان غلیظ افراد،ان کی جھگی جھونپڑیوں اور گندگی کے انبار پر نہ پڑے۔ابنِ کنول کے افسانوں کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔جاگیردارانہ نظام کی شکست و ریخت،لہولہان معاشرہ،سیاست کی شعبدہ بازی،فسادات،اور زندگی کے گوناگوں مسائل پر کئی اچھے افسانے لکھے۔

ابنِ کنول ایک زندہ دل انسان تھے۔وہ مشکل وقت میں ہنسنے مسکرانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔اپنے دوستوں اور عزیزوں کے درمیان اپنی گل افشانیوں اور ظریفانہ جملوں سے محفل کو خوشگوار بنا دیتے تھے۔کورونا کے دوران جب ہر شخص اپنی جان کی امان مانگ رہا تھا ابن کنول صاحب اپنی شگفتگی تحریروں اور فیس بک لائیو کے ذریعہ غم غلط کرنے میں مصروف تھے۔بعد

میں جب ان کے خاکوں کا مجموعہ بہ موسوم ''کچھ شگفتگی'' شائع ہوا تو ان کی بے تکلفی، بذلہ سنجی اور ظرافت کا اندازہ ہوا جو زمانۂ طالب علمی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی علمی، ادبی اور تہذیبی فضا میں پروان چڑھے تھے اور جسے رشید احمد صدیقی میں وقار عطا کیا تھا۔ان خاکوں کی تمام شخصیتیں ہمارے عہد سے تعلق رکھتی ہیں۔ابنِ کنول نے کسی بھی شخص کی تضحیک نہیں کی، چاہتے تو کدورت ،خوشونت اور سفاکیت کی بدولت انھیں زیرِ وزبر کر سکتے تھے۔لیکن ابنِ کنول کے یہاں جو قدریں ملتی ہیں ان میں اس طرح کی گنجائش نہیں تھی۔وہ بات سے بات پیدا کرتے تھے لیکن کسی کی دل آزاری یا تضحیک ان کا شیوہ نہ تھا۔ان خاکوں میں اشخاص کے تعلق سے ان کے رشتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جن میں خلوص، احترام اور عقیدت بدرجہ اتم موجود انھوں نے حسبِ ضرورت شوخی اور سنجیدگی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ان کی تحریروں میں آپ قہقہے نہیں لگا سکتے بلکہ زیرِ لب مسکراہٹ دیر تک قائم رہتی ہے۔مثلاً اردو کے ممتاز محقق تنویر احمد علوی کے بارے میں لکھتے ہیں؛

> ''جو سامنے آتا تعریف میں ایسے رطب اللسان ہوتے کہ وہ بیچارہ اسی سرشاری میں کئی مہینے سو نہیں پاتا۔پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے بتایا کہ علوی صاحب نے ان کی اتنی تعریف کی کہ وہ آسمان پر اڑنے لگے،ان کے لئے زمین پر چلنا دشوار ہو گیا،لیکن ایک روز دہلی کالج گیٹ پر دیکھا کہ تعریف کے ہو بہو وہی الفاظ علوی صاحب دربان کی شان میں بھی استعمال کر رہے تھے۔یہ دیکھ کر ان کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ دھڑام سے آسمان سے زمین پر آ گرے''

واقعہ یہ ہے کہ ان کے خاکوں کے مطالعے سے ان کی شگفتگیٔ طبع ،خلوص ،متانت ، اور ذہنی اعتدال وتوازن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے یہ ساری خوبیاں ان کی شخصیت میں موجود تھیں۔

☆☆☆

پروفیسر ''ابن کنول'' اردو ادب کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد طالب انصاری
ایسوسی ایٹ پروفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، بیدر، کرناٹکا

تلخیص

ہر معاشرہ اپنے ادب سے ہی اپنی اقداروں، کلچر اور ثقافت کو حاصل کرتا ہے اور ان کلچر، ثقافت اور اقداروں کی حفاظت، توسیع اور ان کو نئی نسلوں تک منتقلی ایک ادیب کا ذمہ ہوتا ہے۔ ''اردو ادب'' کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے وقت بہ وقت ایسے ادیب حاصل ہوتے رہے ہیں جو اردو ادب کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ پروفیسر ناسر محمود کمال لقب ''ابن کنول'' صاحب ایسے ہی اردو ادب کے چمکتے ستارے تھے جنہوں نے اپنی تصانیف سے اردو ادب کو روشن کیا۔ پروفیسر ابن کنول ایک ممتاز اردو ادیب، افسانہ نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار، شاعر اور استاد تھے جنہوں نے بیسیوں کتابیں تحریر کیں اور ساتھ ہی ساتھ بے بہا مقالوں سے اردو ادب کو منور کرنے کے ساتھ ہی ملک و ملت اور قوم کی فلاح کرنے کے لیے بھی کوشاں رہے۔ اس مقالے میں ہم پروفیسر ابن کنول صاحب کی زندگی، ان کی اردو خدمات اور تحقیق و تنقید کی چند تصانیف پر مختصراً نظر ثانی کریں گے۔

کلیدی اصطلاحات:

تحقیق، تدوین، تنقید، تیسری دنیا، اھل الکھف

تمہید

پروفیسر ناسر محمود کمال قلمی نام ''ابن کنول'' 15 اکتوبر 1957ء میں اتر پردیش کے ضلع مرادآباد کے قصبہ ہجوئی کے ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوے۔ والد محترم مشہور شاعر ''قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی'' تھے اور والدہ ''آمنہ خاتون ہاشمی کنول'' ۔ان کے آباؤ اجداد بادشاہ ''شاہ جہاں'' کے عہد میں ہندوستان آئے اور ''قاضی'' کے عہدہ سے نوازے گئے۔ انہیں حکومت کی طرف سے جاگیریں عطا کی گئیں۔ بعد میں ان کے بزرگ بدایوں کے قصبہ ''ڈبائی'' میں آکر مقیم ہوے۔ ان کا خاندان ہمیشہ سے ہی علمی و ادبی سرگرمیوں کے سبب کافی مشہور رہا۔ دادا ''قاضی شریت اللہ'' (1930ء) ایک قابل وکیل تھے اور پر دادا ''قاضی اوہم علی'' فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ ان کے والد ''کنول ڈبائیوی'' کی شاعری حب الوطنی کے جذبہ سے معمور ہے۔

ان کے والد قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی کی شاعری کے دو مجموعے ''بساط زیست'' اور ''سوز وطن'' ان کی زندگی میں ہی شائع ہو چکے تھے۔ بعد میں ان کے فرزند پروفیسر ''ابن کنول'' صاحب نے اپنے والد کی شاعری کو ایک کلیات کی شکل میں

''مضراب'' نام سے شائع کیا۔ کنول ڈوائیوی کی شاعری کو پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسن خان، خواجہ احمد فاروقی اور پروفیسر عبدالحق جیسے مشہور ناقدین فن نے سراہا۔

پروفیسر ابن کنول کی ابتدائی تعلیم بدایوں شہر کے قصبہ گنور کے ایک اسلامیہ اسکول سے سن 1962ء میں پہلی جماعت کے داخلہ سے شروع ہوئی۔ ان کے پہلے استاد حاجی صفدر علی تھے۔ پانچوی جماعت کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ''منٹو سرکل'' کے اسکول جو کہ سیف الدین طاہر ہائی اسکول کے نام سے بھی جانا جاتا ہے سے دسویں کلاس سن 1972ء میں پاس کرنے کے بعد ''پری یونی ورسٹی سائنس'' میں داخلہ لیا سن 1978ء میں ایم اے کی تعلیم حاصل کی آپ کی خوش نصیبی تھی کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں آپ کو پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر قاضی عبدالستار،، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی، پروفیسر شہریار، پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر منظر عباس، پروفیسر نعیم احمد اور پروفیسر اصغر عباس جیسے باکمال اساتذہ سے علم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ایم اے مکمل کرنے کے بعد آپ دہلی آ گئے اور سن 1979ء میں دہلی یونیورسٹی سے ماسٹر آف فلاسفی (M.Phil) کی ڈگری حاصل کی اور پی ایچ ڈی کی ڈگری سن 1984ء میں حاصل کر ریسرچ کاؤنسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل رسرچ، نئی دہلی میں ملازمت اختیار کی اس کے بعد دو سال تک تحقیق پر کام کیا اور دہلی یونی ورسٹی میں ہی 1987ء میں رسرچ اسوسیئٹ کے عہدہ پر فائز ہوے۔ سن 1990ء میں دہلی یونیورسٹی میں تدریس کے عمل سے منسلک ہو کر لیکچرر کے عہدہ پر فائز رہتے ہوے 2006ء میں اردو پروفیسر کے عہدہ کی ذمہ داری سنبھالی اور ڈپارٹمینٹ آف اردو کے ہیڈ کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ پروفیسر ابن کنول نے اپنی بے بہا تصانیف سے اردو ادب کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ ایک جانے مانے اردو کے مصنف ہیں اور آپ کئی کتابوں کے مترجم بھی ہیں، ابن کنول نے اپنے شروعاتی دور میں ہی افسانہ نگاری میں گولڈ میڈل حاصل کیا تھا، اس کے بعد متعدد اعزازوں سے بھی آپکو نوازا گیا جن میں میلینیم فکشن اوارڈ، دہلی، بہار، بنگال اردو اکیڈمی اوارڈوں وغیرہ سے نوازے گئے۔

پروفیسر ابن کنول بیسیوں کتابوں کے مصنف تھے۔ تخلیقی کاوشوں میں شاہکار افسانے، خاکے، انشائیے، ڈرامے اور سفرنامے وغیرہ قابل رشک تصنیفات ہیں۔ تنقید میں بھی انکا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ان کی رہنمائی میں ان گنت طلبا و طالبات نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریا حاصل کیں۔ تقریباً پانچ دہائیوں سے وہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں ہمہ تن مصروف تھے چنانچہ اب تک انہوں نے اردو کی مختلف اصناف میں متعدد تحقیقی، تنقیدی، علمی و ادبی مضامین قلم بند کیے ان کے افسانے قارئین کو خط بہم پہنچا رہے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول اب تک اپنی 28 سے بھی زائد کتابیں اردو دنیا کے قارئین تک پہنچا چکے ہیں۔ جن میں ''تیسری دنیا کے لوگ'' افسانے (1984ء)، ''بندراستے'' (افسانے) 2000ء، ''ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں'' 1988ء، ''ریاض دلربا'' (تحقیق) 1990ء، ''آؤ اردو سیکھیں'' (قاعدہ) 1993ء، ''داستان سے ناول تک'' (تنقید) 2001ء، ''انتخاب سخن'' (اردو شاعری کا انتخاب) 2005ء، ''منتخب غزلیات'' 2005ء، ''اصناف پارینہ'' (قصیدہ مثنوی اور مرثیہ) 2005

سنہ ء، ''منتخب نظمیں'' 2005ء، ''تنقید وتحسین'' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2006ء، ''تحقیق وتدوین'' (ترتیب) 2007ء، ''میرامن'' (مونوگراف) 2007ء، ''باغ و بہار'' (مقدمہ ومتن) 2008ء، ''پہلے آپ'' (ڈرامہ) 2008ء، ''نظیر اکبرآبادی کی شاعری'' 2008ء، ''مضراب'' (کنول ڈوائیوی کا کلیات معہ مقدمہ) 2010ء، ''اردوافسانہ'' (افسانوی تنقید) 2011ء، ''پچاس افسانے'' (افسانوی مجموعہ) 2014ء، ''تنقیدی اظہار'' (تنقید) 2015ء، ''فسانہ عجائب'' (مرتبہ) 2016ء، ''اردولوک ناٹک اور رواسالیب (ڈبائیوی)'' (مرتبہ) 2014ء، ''اھل الکیف'' (افسانے) عربی مترجم: احمد قاضی، مصر 2018ء، ''اردوشاعری'' (تنقید) 2019ء، ''داستان کی جمالیات'' 2020ء، ''بساط نشاط دل'' (انشائیے) اور ''تبریک'' (تقاریظ) وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر ابن کنول صاحب نے اپنی تصانیف میں مختلف عنوانات پر طبع آزمائی کی ہے جس پر ہم درج ذیل میں مختصراً روشنی ڈالیں گے۔

1. **''تیسری دنیا کے لوگ''** جمال پرنٹنگ پریس، دہلی سے (جون 1984ء) میں شائع ہوئی: یہ کتاب کنول صاحب نے اپنے والدین کو پیش کی اور وہ لکھتے ہیں ''ایک طرف اگر نئی ضروریات کا ہجوم خوفناک اژدہوں کی طرح منہ کھولے زبانیں لپلپا رہا ہے اور خوف زدہ آدمی سمٹتے سمٹتے اپنے وجود کو کھو رہا ہے، تو دوسری جانب ذات پات، طبقات اور فرقہ و مذہب کی چمکتی ہوئی قبائیں زیب جسم کیے بھیڑیے اپنے جبڑوں سے ٹپکتا ہوا لہو چاٹ رہے ہیں، اور پھر نئی اقداریں سیاہ جونکوں کی طرح تیسری دنیا کے تندومند جسموں سے لپٹی چپکے چپکے توانا عزائم کا خون پی رہی ہیں۔ جو تخلیق کار اس بھیانک پیش منظر کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، کیا وہ اس سے بھی زیادہ بھیانک جرم کے مرتکب نہیں ہوتے؟''

''تیسری دنیا کے لوگ'' افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں ابن کنول صاحب کے مختلف سماجی عنوانات کے افسانوں کی شمولیت ہے اور یہ تمام افسانے معاشرہ میں رائج مختلف برائیوں، بزدلانہ حرکات اور معاشرے میں صرف اپنے لیے زندہ رہنے والوں کے لیے کئی سبق آمیز قصوں، سے شعور جگانے کی کوشش کی ہے۔

2. **''ہندوستانی تہذیب''**: نیا سفر پبلیکیشن، دہلی سے 1988ء میں شائع ہوئی: یہ فارسی کتب بوستان خیال کا اردو ترجمہ اور اس کی نظر ثانی پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے بارے میں تجزیہ کرتے ہوے ابن کنول صاحب لکھتے ہیں کہ ''صنعتی زندگی کی تیز رفتاری نے ہمیں ایک طرف آسان بے شمار آسائشیں فراہم کی ہیں وہیں ہماری سالوں، دنوں اور لمحوں کی آزادی چھین لی ہے، انہیں وجوہات کی بنیاد پر کچھ فن ناپید ہوتے جارہے ہیں، جیسے داستان کا فن۔ داستانیں افسانوی ادب کا ایک قیمتی سرمایا ہیں''

اردو ادب میں جو داستانیں اپنی طوالت کے اعتبار سے یاد کی جاتی ہیں ان میں میر تقی خیال کی ''بوستان خیال'' ایک اہم داستان ہے۔ ابن کنول صاحب میر تقی خیال کی ''بوستان خیال'' کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوے کہتے ہیں کہ ''بوستان خیال'' صرف ایک داستان نہیں بلکہ اپنے عہد کی تہذیبی اقداروں کی آئینہ داری کارتی ہے۔ راقم نے ماضی کی ان تمام تہذیبی اقداروں کو بوستان خیال کے تناظر میں ترتیب دینے کی کوشش کی ہے اور اس عہد کے معاشرتی حالات اور ماحول کو پیش نظر رکھا ہے جس میں

داستان لکھی جا رہی تھی۔ جگہ جگہ مثالیں دے کر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ داستان میں موجود تہذیب ہندوستان کے عہد وسطیٰ خاص کر مغل عہد کی عکاسی کرتی ہے۔''

''ہندوستانی تہذیب'' تصنیف کے موضوعات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصہ میں داستان کی تحقیق، تنقید اور تاریخی ورثہ کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں داستان نگاری کے تاریخ اور فنی مہارتوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور اس وقت کے سیاسی حالات کی وضاحت بھی کی گئی ہے ساتھ ہی بوستان خیال کے مصنف محمد تقی خیال سے تعلق رکھتے ہوئے تحقیقی نکات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ مغلیہ حکومت کی تہذیبی اقداروں پر مشتمل ہے۔ جس میں بادشاہ ''شکوہ سلطنت'' اور اسکی حکومت کے انتظامیہ، شاہی رہن سہن، لباس، شاہی حرم تک کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ اس دور کے معاشرتی حالات، اقداروں، اخلاقیات، مہمان نوازی غرض یہ کہ معاشرے کے تمام حالات پر تنقیدی تبصرہ کر موجودہ دور کے لیے سبق آمیز حکایات پیش کی گئی ہیں جو آج کے دور میں بھی اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح اس دور میں تھی۔

3. **''داستان سے ناول تک''** ایس این لینگوئج اکیڈمی دہلی سے شائع کتاب سن 2003ء میں منظر عام پر آئی: اس کتاب میں ابن کنول صاحب نے داستان نگاری سے اپنے لگاؤ اور قربت کو بیان کرتے ہوئے مختلف قصوں کو پیش کیا ہے جو مختلف حالات میں تحریر کیے گئے۔ ''داستان سے ناول تک'' تصنیف میں داستان کے فن کے ساتھ ساتھ اردو کے تمام مختلف مشہور داستانوں کے عنوانات کی شمولیت ہے جس میں باغ و بہار، فسانہ عجائب، نوطرز مرصع وغیرہ پر تفصیلی مضامین کی شمولیت ہے۔ اس تصنیف میں داستان کی تحقیق بھی ہے اور تنقید بھی اور داستان کے فن کا مظاہرہ بھی۔ ان تمام کے مطالعہ سے اردو ادب اور اردو زبان کے ارتقا کا علم ہوتا ہے، اردو ادب میں نئے الفاظوں کی طرز اور ان کے استعمال کا بھی علم ہوتا ہے، اپنی تہذیبی، تاریخی ورثہ کے مطالعہ کا علم بھی اس سے حاصل کر سکتے ہیں اور ہم معاشرے کے حالات اور جدید اقداروں کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔

4. **''بحر تجلیات''** کتابی دنیا دہلی سے سن 2021ء میں شائع ہوئی: اس کتاب میں ابن کنول صاحب نے اپنے والد قاضی شمس الحسن کنول ڈوائیوی کے سفر حج کی ڈائری کو داستان کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ''بحر تجلیات'' ابن کنول صاحب کے والد محترم شمس الحسن کنول ڈبائیوی کے سفر حج (1988ء کی مکمل داستان ہے جو ابن کنوال صاحب نے بڑی خوبصورتی سے داستان کی شکل میں تحریر کی ہے۔ اس سفر حج کی تمام یادیں ابن کنول صاحب نے اپنے والد محترم کی ڈائری کی جانب سے ایک ایک وقت ایک ایک جگہ اور ایک ایک لمحہ کی روئے داد کو اور حج کے فرائض اور بحری جہاز کی تین ماہ کی بحری سفر کے ساتھ ساتھ مدینہ اور مکہ معظّمہ کی زیارت کے اوقاف اور دیگر روزمرہ کے حالات زندگی کو بے حد خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''کہ مدینہ منورہ چونکہ رحمتوں کا شہر ہے اس لیے یہاں کے لوگ زیادہ نرم مزاج ہوتے ہیں جبکہ مکہ معظّمہ جلال عظمت کا شہر ہے تو یہاں کے لوگ سخت قانون کی پابندی کرتے ہیں'' اس سفر حج کی داستان کی یادیں کنول صاحب بحری جہاز سے سفر حج کی اپلیکیشن اور اس کی منظوری کے قصہ کے ساتھ شروع کرتے ہوئے، تمام سفر حج کی کھٹی میٹھی اور معاشرہ میں موجود ناقص یا ''حج کم تجارتی نظریہ'' کی بھی تفصیل سے وضاحت پیش کرتے ہیں۔ یہ سفر نامہ حج انکی ایک یادگار تصنیف ہے جس کا جتنی بار بھی مطالعہ کیا جائے ہر بار قاری اس کے علمی فن سے محظوظ ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی ابن کنول صاحب نے اپنے خود کے سفر کے مجموعہ کو ''چار کھونٹ'' کے نام سے 2022ء شائع کیا جس میں مختلف ملک اور بیرونی ملک کے سفر کو اپنے تحریری نظریہ سے پیش کیا ہے۔

5. ''**تنقیدی اظہار**'' کتابی دنیا دہلی سے سن 2015ء میں شائع ہوئی: ابن کنول صاحب نے اس کتاب میں اردو ادب کی مختلف اصناف پر تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق اور مختلف عنوانات کی اہمیت وافادیت پر بحث کی ہے، جس میں داستان، داستان میں کردار سازی، داستان کی ترقی اور انکے ترقی پسند ناقدین پر تبصرہ کیا ہے اس کے ساتھ ہی اصناف نثر کی قدر و قیمت، اردو مرثیہ نگاری کے رجز ورزم اور مرزا انیس کے مرثیوں میں ہندوستانی معاشرت، شمالی ہند کی مثنویوں میں ہندوستانی معاشرت، حالی کی نثری تصانیف، علامہ اقبال کی قصہ گوئی، بچوں کا ادب، فراق کی تنقید، تحریک آزادی اور اردو کے ساتھ ساتھ اردو ادب اور ہندوستان و پاکستان کے رشتے، ناول نگاری وغیرہ تمام عنوانات کو اس کتاب مین پیش کرنے اور اس پر مثالی تجربات کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی معاشرت وتہذیب کے اور اردو کی اہمیت اور اس کی مختلف اصناف کی ترقی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کا ایک نتیجہ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

ابن کنول صاحب ''بچوں کا ادب اور اردو'' عنوان میں لکھتے ہیں کہ'' پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا تھا کہ بچے باغیچہ کی کلی کی طرح ہیں، ان کو احتیاط اور پیار کے ساتھ پالنا چاہیے، کیوں کہ وہ قوم کا مستقبل اور کل کے عوام ہیں۔'' یہ آواز صرف جواہر لال نہرو کی ہی نہیں بلکہ ہر اس باشعور شخص کی ہونی چاہیے جو ملک وملت کی ترقی اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی معاشرہ کی فلاح کی طرف مائل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ابن کنول آگے لکھتے ہیں کہ'' بچے کسی بھی ملک اور تہذیب کی بنیاد ہوتے ہیں، ملک کے مستقبل اور اور تہذیب کے تحفظ کا انحصار بچوں کی تربیت اور پرورش پر ہے، ہمیں بچوں کو مشرقی تہذیب واقداروں سے بھی روشناس کروانا ہوگا، جس سے ملک وملت اور قوم کی فلاح ہو سکے''

6. ''**انتخاب سخن**'' کتابی دنیا سے سن 2005ء شائع شدہ اردو شاعری پر ایک نظریاتی تحقیق وتنقید کے ساتھ پرانے کلام پر ایک نظر ثانی بھی ہے۔ ابن کنوول صاحب لکھتے ہیں کہ انکی ایک خواہش تھی کہ اردو شاعری کے تما عہد کو قلم بند کیا جائے، اس کام کو مکمل کرنے کے لیے ''انتخاب سخن'' نام سے اردو شاعری پر نظر ثانی کرتے ہوے طلبا کے لیے ایک عظیم کتاب کو منظر عام پر رکھا۔ جس میں اردو شاعری کے عام طور پر تمام شعرا کے کلام کو شامل کیا گیا ہے۔ ''انتخاب سخن'' میں کنول صاحب نے نمائندہ شعرا کی غزلیات، قصائد، مثنویات، مراثی اور منظومات کو شامل کیا ہے۔ 'انتخاب سخن'' تصنیف کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں حضرت امیر خسرو سے لے کر ناصر کاظمی تک کی منتخب غزلیں شامل ہیں۔ دوسرے حصہ ''اصناف پارینہ'' اردو کی قدیم اصناف یعنی مثنوی، قصیدہ، مرثیہ پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصہ میں نظیر اکبر آبادی سے لے کر قتیل شفائی تک کی منتخب نظموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ انتخاب سخن منظوم کلام کے جملہ 49 مختلف اصناف کا مجموعہ ہے جو کہ اردو شاعری کے مختلف ادوار کی سنہری یادوں کو تازہ کرتا ہے۔

ابن کنول کی تصانیف صرف کسی ایک عنوان یا کسی ایک اردو کی صنف تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ ابن کنول صاحب نے اردو کی تمام اصناف سخن چاہے وہ نثر ہو یا نظم تمام پر بڑے ہی اثر انداز طریقہ سے گفتگو کی ہے۔ پروفیسر ابن کنول باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ اردو ادب میں ان کے دوستوں، شاگردوں اور ہمنواؤں کی بڑی تعداد موجود ہے جن سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے اور سبھی کے دلوں میں پروفیسر صاحب کی بڑی قدر تھی۔ پروفیسر ابن کنول صاحب گفتگو میں حد درجہ مزاح کا عنصر تھا وہ ہر گفتگو میں سوالوں کے جواب بڑی بے ساختگی سے دیتے تھے۔ ان کا سب کے ساتھ خلوص کا رشتہ تھا، سبھی کی خیریت

دریافت کرتے اور طلبہ کے مسائل حل کرنے میں ایک خاص دلچسپی رکھتے تھے۔

پروفیسر ابن کنول صاحب اس دنیائے فانی کو 11 فروری 2023ء الوداع کہ گئے۔ پروفیسر ابن کنول صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بہت پیار کرتے تھے۔شاید اسی وجہ سے ان کی آخری سانس کا گھونٹ بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے احاطہ میں ہی رہا اور انکی آخری رسومات بھی علی گڑھ میں ہی مکمل ہویں۔ پروفیسر صاحب کا انتقال ان کے وطن علی گڑھ میں ہوا۔ وہ اپنی درسگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا وائیوا لینے گئے تھے اور اس وائیوا کے گھنٹہ دو گھنٹہ کے اندر ہی ان کی روح اس دنیائے فانی کو خیر باد کہ گئی۔دوسرے دن وہ علی گڑھ کے قبرستان میں ہی سپرد خاک کئے گئے اور ایسا محسوس ہوا کہ ابن کنول صاحب اپنے مخصوص انداز میں اپنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام احباب کا شکریہ ادا کر رہے ہوں کہ ان کا آغاز بھی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ہوا اور آخری رسومات بھی کنول صاحب کے ادبی گہوارہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ہی میں مکمل ہویں۔ پروفیسر ابن کنول صاحب کا گزر جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ایسے دور میں جب کہ اساتذہ کے یہاں اخلاقی پستی اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔ ادب وتہذیب کی جگہ دنیاداری اور بازاری مزاج اپنے عروج پر ہے،ابن کنول صاحب کی خالی جگہ کو پر کرنا ایک مشکل کام ہے۔ وہ ہمیشہ یاد آتے رہیں گے چونکہ انھوں نے اساتذہ اور طلبہ کو محبت کرنے کا ایک سلیقہ سکھایا اور علم وادب سے رشتہ قائم کرنے پر زور دیا۔ادبی دنیا میں اب ایسے اساتذہ کم ہی ہیں اس لیے پروفیسر ابن کنول کا اس دنیا کو خیر باد کہ دینا اردو ادبی دنیا کے لیے ایک بڑا صدمہ اور سانحہ ہے۔

References

1. https://prabook.com/web/ibne.kanwal/227398
2.https://www.rekhta.org/ebooks/intikhab-e-sukhan-urdu-shairi-ka-naya-intikhab-ebooks
3. Shahzad, A. (2023) "maut uski hai kre jiska zmana afsos" Inqalab, Delhi edition, 12th Feb-2023.
4. https://epaper.inquilab.com/ePaperImg/
5. Ahmad, U.(2014) "Ibne kanwal ba haisiat afsana nigar" ISBN. 81-89506-15-3, H.S offset Printers, Dehli-2014

****

Mohd. Talib Ather Ansari
Maulana Azad National Urdu University
College of Teacher Education
Bidar -Karnataka
E-mail: talib@manuu.edu.in, talibmanuu@rediffmail.com
8171861845

☆☆☆

ابن کنول: ادبی خدمات

ڈاکٹر عبدالرّحمٰن
ریختہ فاؤنڈیشن، نوئیڈا، اتر پردیش

گذشتہ پانچ دہائیوں میں اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دینے میں جن ادیبوں اور قلم کاروں نے اپنی شناخت قائم کی ہے، ان میں ابن کنول کا نام محتاج تعارف نہیں۔ ابن کنول نے اپنے ادبی سفر کا آغاز آٹھویں دہائی میں اردو میں مختصر افسانہ نگاری سے کیا، لیکن افسانہ نگاری ہی ان کی توجہ کا مرکز نہیں رہی بلکہ تحقیق، تنقیدی، ڈرامہ نگاری کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی خدمات انجام دے کر اردو ادب میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابن کنول کا اصل میدان افسانہ نگاری ہی رہا ہے۔

ابن کنول کا تعلق صوبہ اتر پردیش کے ضلع بلند شہر کے ایک قدیم قصبہ ڈبائی سے ہے۔ ان کے والد کا نام شمش الحسن کنولؔ ڈبائیوی تھا جن کو اردو ادب سے اس قدر دلچسپی تھی کہ بچپن ہی میں اردو کی بیشتر داستانیں پڑھ ڈالی تھیں۔ شمس الحسن کنول ایک وطن پرست شاعر تھے اور کنولؔ تخلص اختیار کرتے تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے "بساط زیست" اور "سوز وطن" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں اور "مضراب" کے نام سے ان کا کلیات بھی شائع ہو چکا ہے۔

ابن کنول کی پیدائش 5/اکتوبر 1957ء بجوئی ضلع مرادآباد میں ہوئی۔ گھر والوں نے ان کا نام ناصر محمود کمال رکھا۔ انھوں نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو ابنِ کنول کے نام سے اپنی شناخت قائم کی۔ ابن کنول نے افسانہ نگاری کے ساتھ تحقیق و تنقید اور ڈرامہ نگاری میں بھی نمایاں خدمات انجام دیا ہے۔

ابن کنول نے ابتدائی تعلیم گنور میں حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ کا رخ کیا جہاں انھوں نے ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کے امتحانات پاس کیے۔ ابن کنول نے اعلیٰ تعلیم دہلی یونیورسٹی سے حاصل کی جہاں انھوں نے ایم فل اور بوستان خیال کے تہذیبی اور لسانی مطالعہ کے موضوع پر ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ابن کنول دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہو گئے اور اسی شعبہ کے ذریعہ انھوں نے اپنی تمام زندگی اردو ادب کی خدمت میں گزار دی۔ تحریری خدمات کے علاوہ تعلیم و تعلم اور تدریس کے میدان میں بھی ان کی خدمات لائق تحسین اور قابل صد افتخار ہے۔

ابن کنول کی ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران ہی انھوں نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھی۔ ان کے ایک ساتھی اسلم حنیف شاعری کرتے تھے اور یہ افسانے لکھتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو سنا کر خوش ہوتے تھے۔ ابنِ کنول کو شاعرانہ مزاج ورثہ میں ملا تھا۔ جس کی بنا پر کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے

تھے۔انھوں انسان کے چاند پر اترنے پر پہلی نظم کہی جو رسالہ "نور" رام پور میں شائع ہوئی۔ابن کنول نے 1972ء سے با قاعدہ افسانہ لکھنا شروع کیا جو ناصر کمال کے نام سے شائع ہوتا رہا،لیکن 1975ء سے انھوں نے ابنِ کنول کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد کنول تخلص اختیار کیا کرتے تھے جس کی نسبت سے انھوں نے بھی اپنا قلمی نام ابنِ کنول ہی رکھ لیا۔

ابن کنول نے جب بی۔اے میں داخلہ لیا تو ان کی ملاقات قاضی عبدالستار سے ہوئی۔اسی زمانے میں علی گڑھ میں نوجوان افسانہ نگاروں کی ایک جماعت ابھر کر سامنے آئی جس کی رہنمائی برصغیر کے معروف افسانہ نگار قاضی عبدالستار کر رہے تھے۔ اس جماعت میں شارق ادیب،سید محمد اشرف،غضنفر، پیغام آفاقی،طارق چھتاری،غیاث الرّحمن وغیرہ بھی شامل تھے۔اس کے علاوہ نوجوان شعرا کی بھی ایک جماعت تھی۔جس میں صلاح الدین پرویز،آشفتہ چنگیزی،فرحت احساس،اسد بدایونی،مہتاب حیدر نقوی وغیرہ شامل تھے۔دونوں جماعت کی ماہ نامہ نشست قاضی عبدالستار کے مکان پر ہوتی تھی۔افسانے، شاعری سنائی جاتی تھی اور اس پر تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ابن کنول بھی اس جماعت کا حصہ بن گئے اور افسانے لکھنے کے کا آغاز کیا۔ صرف افسانوں تک ہی ان کی توجہ مرکوز نہ رہی بلکہ اردو ادب کے مختلف گوشوں کو اپنی مرکز توجہ بنایا جن کا ذکر ذیل میں تفصیل کے ساتھ ہے۔

افسانہ نگاری:

اردو افسانے کی تاریخ میں بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی ایک منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں سے اردو افسانہ ایک نئی شاہراہ پر نئے قافلے کے ساتھ اس صنف کی تاریخی ارتقا میں کچھ نئے اضافوں کے ساتھ ایک داستان رقم کرنے کی طرف گامزن ہوتا ہے۔یہی وہ نشان منزل ہے جہاں سے اس دور کے لکھنے والوں نے اصول ونظریات کی بے جا پابندیوں کو پس پشت ڈال کر مکمل آزادی کی فضا میں سانس لینے اور انسانی زندگی کے متنوع مسائل کو تخلیقی آزادی کے ساتھ رقم کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں سے ایک نام ابن کنول کا بھی ہے،جنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ انسانی زندگی کی گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی کی ہے اور اپنے فن کارانہ ہنرمندی وفکری رسائی کے ذریعہ عہد جدید کے افسانہ نگاروں میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ابن کنول نے نہ صرف ایک نئی راہ اختیار کی بلکہ متنوع اسالیب بیان وطرز اظہار کے ذریعہ اردو افسانہ کے فن کو نئی دشا بھی دی۔ ابن کنول نے پچاس سے زائد کہانیاں تخلیق کی ہیں جو متعدد رسائل وجرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''آٹھویں دہائی نے اردو کو اس کی محبوب متاع گمشدہ،افسانہ واپس کر دیا۔ نام نہاد جدیدیت نے افسانہ کو چیستاں بنا کر ان ہزاروں قارئین سے چھین لیا تھا، جو افسانے میں انسانی مسائل کے تخلیقی افسانوی اظہار سے مانوس تھے اور اسی کو افسانہ کا افسوں جانتے تھے۔اردو میں افسانہ کی اس بحالی میں بعض ممتاز ادیبوں کے علاوہ آٹھویں دہائی کے جن نوعمر اور نوجوان ادیبوں کا حصہ رہا ہے۔ان میں ڈاکٹر ابن کنول کا نام اہمیت رکھتا ہے۔''

(ڈاکٹر ابن کنول، تیسری دنیا کے لوگ، جمال پرنٹنگ پریس دہلی، 1984ء، فلیپ)

ابن کنول کے اب تک تین افسانوی مجموعے "تیسری دنیا کے لوگ"، "بندر راستے" اور "خانہ بدوش" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ان مجموعوں میں شامل تمام افسانوں کو یکجا کر کے 2014ء پچاس افسانے کے نام سے خود شائع کیا۔افسانوں کے علاوہ اردو ادب کے مختلف گوشوں پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ "تیسری دنیا کے لوگ" جون 1984ء میں منظر عام پر آیا۔

اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں انھوں نے داستانوی طرز اسلوب کو اختیار کیا ہے اور بڑی خوش اسلوبی اور کمال فنکاری سے اس اسلوب میں اپنی کہانیوں کو برت کر صنف افسانہ کو نئے معنی سے سرفراز کیا ہے۔اس مجموعہ کے افسانوں میں بیسویں صدی کے کوائف کا ذکر اس انداز سے ملتا ہے۔ جیسے قاری اسی عہد میں موجود ہو اور بعینہ اس کا مشاہدہ بھی کر رہا ہو۔ان کے افسانوں میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے عناصر کارفرمائیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔اس مجموعہ کے بعض افسانے انسان کی داخلی زندگی اور نفسیاتی گتھیوں کا تجزیہ پیش کرتے ہیں، نیز اس کے علاوہ ابن کنول کے افسانوں میں عہد حاضر کے پیچیدہ اور گنجلک مسائل کی عکاسی بھی بخوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔اسی لیے ان کے بیشتر افسانے انسانی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔کمال امتیاز یہ ہے کہ ان کے افسانے قصہ گوئی اور داستانوی اسلوب سے مزین ہوتے ہوئے بھی موجودہ عہد اور ان کے مسائل سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

دوسرا افسانوی مجموعہ "بندر راستے" 2000ء میں منظر عام پر آیا۔ابن کنول نے اس مجموعے کے زیادہ تر افسانوں میں ہندوستانی پس منظر میں عوام کے ہنگامی مسائل خصوصاً عصر حاضر میں ہندوستانی مسلمانوں کے حالت زار کی عکاسی ہے۔اس مجموعہ کے افسانے زیادہ تر ملک کے سیاسی منظر نامہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔مثلاً: سانحہ بابری مسجد، گجرات کی قتل وغارت گری کا حادثہ، دور حاضر میں دہشت گردانہ کاروئیاں وغیرہ ہیں۔ نیز اسی کے ساتھ اس مجموعے کے بعض افسانے بدعنوانی، مہنگائی، عصمت دری جیسے سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ افسانے موضوعاتی سطح پر اپنے دور کے حالات، مسلمانوں کی بے بسی اور ہندوستانی معاشرہ میں در آئی خرابیوں کا مرثیہ بیان کرتے ہیں۔

ابن کنول افسانہ نگاری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جسے مابعد جدیدیت کہا جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت سے قبل جدیدیت کا رجحان زوروں پر تھا جس میں علامت، استعارہ اور تمثیلی انداز بیان ناگزیر تصور کی جاتی تھی۔اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں سیاسی اور سماجی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ابن کنول کے بعض افسانے بھی علامت واستعارے کی اچھی مثالیں ہیں، چونکہ ان کا تعلق داستانوں سے بھی رہا ہے لہٰذا انھوں نے داستانوی رنگ وآہنگ سے بھی خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے افسانوں میں ندرت پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس مجموعے میں شامل بعض افسانوں کا اسلوب مذکورہ بالا اسالیب میں لکھے گئے ہیں جبکہ بعض افسانے مختلف ہیں۔ان افسانوں میں علامت کا استعمال تو ملتا ہے لیکن ابہام نہیں ہے۔اسی طرح داستانوی

طرز کا احساس تو ہوتا ہے مگر اس رنگ کا غلبہ نظر نہیں آتا۔ یہ افسانے نہایت ہی خوبصورت اور صاف ستھرے انداز میں لکھے گئے ہیں۔

تیسرا افسانوی مجموعہ "خانہ بدوش" 2014ء میں منظر عام پر آیا۔ جس میں 23 افسانے شامل ہیں۔ ابن کنول نے اس مجموعہ کے زیادہ تر افسانوں میں فرقہ وارانہ فساد، انسانی درندگی، دہشت گردی اور سماجی مسائل جیسے موضوعات کو بڑے ہی فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ فنی لوازم سے پُر ان افسانوں میں بہت ہی سادہ اور عام فہم زبان میں تخلیق کار نے اپنا پیغام قاری تک پہنچایا ہے۔

تحقیق نگاری:

ابن کنول نے تحقیق کے میدان میں بھی اپنے قلم کا جوہر دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دو ایسی کتابیں ہیں جو خالص تحقیقی کام پر مشتمل ہیں۔ ان میں ایک کتاب ان کے پی ایچ۔ ڈی۔ کا تحقیقی موضوع تھا۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ سندی تحقیق غیر معیاری زیادہ ہوتی ہے لیکن ابن کنول کی یہ تحقیق اس معنوں میں اہم ہے جس کو دیکھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انھوں بڑی محنت و مشقت اور لگن کے ساتھ کام کیا ہے۔ دوسرا تحقیقی کارنامہ ابن کنول نے اپنے شوق اور جذبہ کے ساتھ کیا ہے جو اردو ادب میں ایک نیا اضافہ کرتا ہے۔ اس تحقیق میں ابن کنول نے اردو ناول کا نقش اوّل دریافت کیا ہے۔

''ریاض دلربا'' پروفیسر ابن کنول کی ایک مرتب کردہ کتاب ہی نہیں بلکہ ان کی بہت اہم تحقیق بھی ہے۔ کتاب پر ابن کنول نے وقیع مقدمہ لکھا ہے اور اس مقدمے میں اپنی کی گئی تحقیق کے ذریعہ یہ ثابت بھی کیا ہے کہ ''ریاض دلربا'' اردو کا پہلا ناول ہے۔ جس میں انھوں نے اس کتاب کے متعلق اہم جواز پیش کیا ہے۔ ''ریاض دلربا'' کا سنہ تصنیف 1832ء ہے۔ اس میں ہندوستانی عوام کی معاشی بدحالی کی طرف توجہ مبذول کرایا گیا ہے۔ ابن کنول کے ہاتھ جو نسخہ لگا وہ مطبوعہ تھا۔ اس کی طباعت 1863ء میں جیل پریس رہتک (ہریانہ) سے ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اردو دنیا نے اسے اردو ناول کا نقش اول نہیں قبول کیا۔

تنقید نگاری:

ابن کنول کے تنقیدی نظریات و عملی تجزیئے ان کے متعدد تنقیدی مجموعوں پر مشتمل ہیں۔ ابن کنول نے تنقید نگاری کے تعلق سے کئی کتابیں لکھی ہیں جو ادب و فن کے مسائل پر بڑی گہرائی کے ساتھ ان کے نظریات کو پیش کرتی ہیں، نیز سمجھنے اور سمجھانے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ یہ کتابیں اردو ادب کے متعدد گوشوں پر ان کی گہری نگاہ کو بھی ثابت کرتی ہیں۔ ابن کنول کی تنقیدی تحریروں میں ان کی کتاب ''تنقید تحسین'' ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں اردو کے مختلف گوشوں پر مضامین شامل ہیں۔، جو علیحدہ علیحدہ گوشوں پر اپنی تنقیدی نوعیت پیش کرتی ہیں۔ ابن کنول کی تنقیدی تحریروں میں دوسری اہم اور مشہور کتاب ''داستان سے ناول تک'' ہے اس میں داستان کے فن کے علاوہ اردو کے داستانوں مثلاً سب رس، قصہ مہر افروز دلبر، نوطرز مرصع، عجائب القصص، باغ و بہار، مذہب عشق، فسانۂ عجائب اور بوستان خیال وغیرہ پر تفصیلی مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب پر پروفیسر عبدالحق

کا یہ اعتراف بجا ہے۔ ''تقریباً سبھی اہم داستانوں کی تفہیم و تجزیے اور ان کے اساسی اسالیب کی دروں بینی نے اس کتاب کو اساتذہ وطلبا کے لیے ناگزیر بنا دیا ہے۔'' پروفیسر ابن کنول کی یہ کتاب واقعی اساتذہ اور طلبا کے لیے کارآمد اور مفید ہے۔

پروفیسر ابن کنول کی کتاب ''اردو افسانہ'' افسانوی تنقید پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں ابن کنول نے اردو ادب کے صف اول کے افسانہ نگاروں پر تنقیدی مضامین اور ان کے ایک شاہکار افسانے کا انتخاب بھی کیا ہے۔ ابن کنول کی تنقیدی کتابوں میں ایک کتاب ''تنقیدی اظہار'' کے عنوان سے بھی ہے۔ جس میں اردو ادب کے مختلف گوشوں مثلاً داستانوں، غیر افسانوی نثر، مرثیہ نگاری، تنقید نگاری اور افسانوں وغیرہ کے متعلق تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

ڈرامہ نگاری:

ابن کنول نے تخلیقی ادب میں افسانے کے علاوہ ڈراموں کی طرف بھی توجہ مبذول کی ہے۔ 'بزم داغ' ابن کنول کے ڈراموں کا واحد مجموعہ ہے جو 2020ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں کل چار ڈرامے ہیں۔ پہلا ڈرامہ 'بزم داغ' ایک شخصی ڈرامہ ہے جو اردو ادب کے مشہور شاعر 'داغ' دہلوی پر مشتمل ہے۔ دوسرا ڈرامہ 'ایک بادشاہ کی کہانی' ہے۔ تیسرا ڈرامہ 'خواب' کے عنوان سے ہے جو موجودہ دور کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مجموعہ کا چوتھا ڈرامہ 'پہلے آپ' کے عنوان سے ہے۔ جس میں انسانی ہوس اور خود غرضی کی و مدنظر رکھ کر اس کی طرف توجہ مذول کرائی گئی ہے۔ یہ کشمکش اور تذبذب سے بھرپور دلچسپ ڈرامہ ہے۔ ان تمام ڈراموں کے متعلق ڈاکٹر محمد کاظم لکھتے ہیں:

''ان چاروں ڈراموں میں چار مختلف پلاٹ کے زمانے کی ناہمواریوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں انیسویں، بیسویں اور اکیسویں صدی کی تہذیب وثقافت، انسان کی فکر اور اس کے رویے، اخلاق واطوار کے گرتے معیار اور خود پرستی کے بڑھتے رجہان کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان ڈراموں میں فلیش بیک کی تکنیک دکھائی دیتی ہے تو پیش کش میں سادگی کا احساس ہوتا ہے۔''

(تقریظ، مجموعہ 'بزم داغ' ص 24، 25)

دیگر ادبی خدمات:

ابن کنول نے افسانہ نگاری اور تحقیق وتنقید نگاری کے علاوہ اردو ادب میں کئی طرح کی خدمات انجام دی ہیں، اس سلسلے میں ان کی کئی کتابیں مرتب کردہ اور اردو شاعری کے انتخاب وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ''آؤ اردو سیکھیں'' اردو زبان سیکھنے کے متعلق لکھی گئی ہے۔ ایک کتاب ''سیرت مسیح'' کے عنوان سے مرتب کی ہے یہ کتاب 'بیضون محمد بیضون' کی عربی زبان میں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ 'طبیب سلیم' نے کیا تھا، جسے ابن کنول نے مرتب کے 1988ء میں خود شائع کیا۔ ''نظیر اکبر آبادی (منتخب شاعری)'' کے عنوان سے بھی ابن کنول کی ایک کتاب ہے۔ جس میں ابن کنول نے نظیر اکبر آبادی بہترین نظموں وغزلوں کا انتخاب کر کے ترتیب دی ہے۔ ''انتخاب سخن (اردو شاعری کا نیا انتخاب)'' اردو شاعری کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس انتخاب میں ابن کنول نے کوشش کی ہے کہ اردو کی نمائندہ اصناف کے نمائندہ شعراء کے مخصوص کلام کی نمائندگی ہو سکے۔ گذشتہ تین چار صدیوں میں اردو کے اتنے قابل ذکر شاعر موجود ہیں کہ سب کے کلام کا انتخاب شامل کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے کتاب کے مرتب نے کتاب میں نمائندہ شعراء کے غزلیات، قصائد، مثنویات، مراثی اور منظومات کو ہی شامل کیا

ہے۔

''باغ و بہار'' ابن کنول نے ایک دقیق مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ جو 2008ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں میر امن دہلوی کی مختصر حالات زندگی اور ''باغ و بہار'' کی کہانی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد باغ و بہار کی پوری کہانی ہے۔ آخر میں فرہنگ دیا گیا ہے جس میں مشکل الفاظ کے معانی کی وضاحت کی گئی ہے۔

''مضراب'' ابن کنول کے والد کنول ڈبائیوی کی کلیات ہے جس کو ابن کنول نے مرتب کیا ہے۔ اس میں کنول ڈبائیوی کے شعری مجموعے بالترتیب ''سوز وطن''، ''بساط زیست''، ''سوز دروں (غزلیات)'' اور ''قطعات'' شامل ہیں۔

ابن کنول نے کئی سفر اندرون ملک اور بیرون ممالک کا کیا۔ ان میں کچھ تعلیمی غرض کی نسبت سے اور کچھ ذاتی غرض سے بھی کیا ہے۔ جن کے نتیجے میں یہ سفرناموں کا مجموعہ ''چار کھونٹ (سفرنامے)'' قلمبند کیا جو 2022ء میں منظر عام پر آیا۔ غیر ملکی اسفار میں سب سے پہلا سفر حج کے فرائض کے لیے مکہ سعودی عربیہ کا کیا۔ اس کے علاوہ امریکہ، موریشش، لندن، پاکستان، متحدہ عرب امارات، ماسکو اور ازبکستان کا بھی سفر کیا۔ غیر ملکی اسفار کے علاوہ اندرون ملک میں کئی شہروں کا سفر کیا جن کا ذکر ''اختتامیہ (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا)'' کے عنوان سے اس سفرنامے کے مجموعے میں کیا ہے۔ یہ سفرنامے ان کی سفر کی شروعات سے لے کر واپسی تک ان تمام مراحل کی داستان بیان کرنے کے ساتھ ان ممالک اور جگہوں کی تہذیبی و ثقافتی داستان بھی پیش کرتے ہیں۔ بعض اسفار انھوں نے سیمینار وغیرہ میں شرکت کی غرض سے کی جس میں سیمینار کی روداد کا مختصر طور پر ذکر ملتا ہے۔

ابن کنول کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہم جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی تحریریں ہر دور میں طلبا، ریسرچ اسکالرز، محققین، نقادوں اور افسانے کی بنیاد تلاش کرنے والوں کے لیے روشنی فراہم کرتی رہیں گی۔ ان کی تحریریں ان کی شخصیت اور ذات کو کبھی فنا نہیں ہونے دیں گی۔ وہ ہر دور میں پڑھے اور سمجھے جائیں گے۔ لیکن اس دار فانی میں فنا ہر ذات کی مقدر ہے۔ 11 رفروری 2023ء کو اچانک ایک افسوس ناک خبر موصول ہوئی کہ اردو ادب کا یہ ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ان کے انتقال کی خبر نے ہمارے دل پر گہرا اثر کیا چونکہ ابن کنول ادیب کے ساتھ ساتھ ہمارے بہت مشفق استاذ بھی تھے۔ وہ جب بھی ملتے بہت خلوص اور خوش مزاجی کے ساتھ ہنستے ہوئے ملتے اور لکھنے پڑھنے کی تاکید کرتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ رب العالمین استاد محترم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین!

☆☆☆☆

ابن کنول: اردو ادب کا ایک روشن باب

تنویر احمد
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-۱۱۰۰۰۷
رابطہ نمبر: ۶۰۰۶۴۹۹۳۵۲

اردو ادیبوں میں جنھوں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا میں بھی اپنے نقوش ثبت کیے ہیں، ان میں ایک نمایاں نام پروفیسر ابن کنول کا ہے۔ پروفیسر ابن کنول کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے، وہ تخلیقی ذہن کے مالک کثیر الجہات ادیب تھے۔ ابن کنول بیک وقت افسانہ نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار، سفرنامہ نگار، ڈرامہ نگار، ناقد، محقق اور شاعر تھے۔ ابن کنول کا اصل نام ناصر محمود کمال تھا، والد کا نام قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی تھا۔ ڈبائی ضلع بلند شہر آپ کا آبائی وطن ہے، ابن کنول ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں بہجوئی ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گنّور ضلع بدایوں کے ایک اردو میڈیم اسلامیہ اسکول میں حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے ۱۹۶۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشہور اسکول منٹو سرکل میں داخلہ لیا اور پھر علی گڑھ سے ۱۹۷۸ء میں ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد دہلی یونیورسٹی آ گئے جہاں سے ۱۹۷۹ء میں ایم فل (اردو) اور ۱۹۸۴ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۵ء میں شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں ہی درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۹۸ء میں ریڈر، ۲۰۰۶ء میں پروفیسر اور ۲۰۱۲ء میں سینیئر پروفیسر کے لیے ترقی ہوئی۔ ابن کنول نے تین مرتبہ صدر شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی کے فرائض انجام دیئے، ۳۱ اکتوبر ۲۰۲۲ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے، افسوس کہ سبکدوشی کے بعد پروفیسر ابن کنول زیادہ عرصہ باحیات نہیں رہے اور ۱۱ فروری ۲۰۲۳ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہمیشہ ہمیش کے لیے خاموش ہو گئے۔ پروفیسر ابن کنول نے دہلی یونیورسٹی میں طویل عرصہ تک درس و تدریس کی خدمات سر انجام دی ہیں۔ ان کی نگرانی میں ۳۸ پی ایچ ڈی اور ۵۰ ایم فل کے تحقیقی مقالے لکھے گئے، ملک اور بیرون ملک میں بھی مختلف یونیورسٹیوں میں ممتحن اور بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن بھی رہے ہیں۔ انھوں نے ماریشس یونیورسٹی میں تین سال غیر ملکی ممتحن کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔

پروفیسر ابن کنول امریکہ، ماریشس، انگلینڈ، پاکستان، روس اور ازبکستان کے عالمی سمیناروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ انھوں نے گزشتہ چالیس برسوں میں متعدد قومی اور بین الاقوامی سمیناروں اور کانفرنسوں میں مقالات اور کلیدی خطبات پیش کیے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول کو ان کی کئی اہم کتابوں پر دہلی، اتر پردیش، ہریانہ، بہار اور مغربی بنگال کی اردو اکاڈمیاں انعامات سے نواز چکی ہیں۔ ابن کنول کی تخلیقی خدمات پر دہلی اردو اکیڈمی فکشن ایوارڈ، ہریانہ اردو اکیڈمی کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ، مغربی

بنگال اکیڈمی عبدالغفور نساخ ایوارڈ، سرسید ملینیم ایوارڈ برائے اردو فکشن اور غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے اردو نثر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

اردو نثر پر ابن کنول کے ناقابل فراموش احسانات ہیں۔ ابن کنول اپنے پچاس سالا ادبی سفر میں اتنا وسیع ذخیرہ چھوڑ کر گئے ہیں، جس پر ایک نہیں بلکہ کئی تحقیقی مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔ ابن کنول کا ادبی سفر طالب علمی کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا، گھر اور علی گڑھ کے ادبی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ ۱۹۶۹ء میں ان کی پہلی نظم شائع ہوئی۔ اس کے بعد مختلف رسائل میں مسلسل لکھتے رہے، پروفیسر ابن کنول کا پہلا افسانوی مجموعہ ''تیسری دنیا کے لوگ'' ۱۹۸۴ء میں طبع ہوا، ۲۰۰۰ء میں دوسرا افسانوی مجموعہ ''بند راستے'' منظر عام پر آیا، افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''پچاس افسانے'' ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ ابن کنول کے خاکوں کا مجموعہ ''کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی'' ۲۰۲۰ء میں، انشائیوں کا مجموعہ ''بساط نشاط دل'' ۲۰۲۱ء میں، ڈراموں کا مجموعہ ''بزم داغ'' ۲۰۲۰ء میں اور سفرناموں کا مجموعہ ''چار کھونٹ'' ۲۰۲۲ء میں شائع ہوئے۔ ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں متعدد کتابیں ہیں۔ پروفیسر ابن کنول کی دیگر اہم کتابوں میں ''ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں''، ''داستان سے ناول تک''، داستان کی جمالیات''، ''تنقید و تحسین''، ''میر امن''، ''نظیر اکبر آبادی کی شاعری''، ''اردو افسانہ''، ''اردو شاعری''، ''تنقیدی اظہار''، ''پہلے آپ (ڈرامہ)''، ''تبریک (تقاریظ)'' وغیرہ شامل ہیں۔ ابن کنول نے تقریباً ایک درجن کتابیں طویل مقدموں کے ساتھ مرتب بھی کی ہیں، جن میں ''انتخاب سخن''، ''منتخب غزلیں''، ''منتخب نظمیں''، ''اصناف پارینہ''، ''تحقیق وتدوین''، مضراب (کنول ڈبائیوی)''، ''لوک ناٹک: روایت اور اسالیب''، 'باغ وبہار'' اور ''فسانۂ عجائب'' شامل ہیں۔ اردو ناول کا نقش اوّل ''ریاض دلربا'' ابن کنول کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ ابن کنول کے دو افسانوی مجموعے عربی زبان میں ترجمہ ہو کر ''اہل الکہف'' اور ''الحلم'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، ان افسانوں کا ترجمہ الازہر یونیورسٹی، قاہرہ کے پروفیسر احمد القاضی نے کیا ہے، آپ کے افسانے روسی زبان میں ترجمہ ہو کر ماسکو سے بھی شائع ہوئے ہیں۔

مابعد جدید اردو ادیبوں میں ابن کنول کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ایک نامور داستان شناس، کامیاب افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کے محقق و نقاد اور منفرد خاکہ نگار بھی تھے۔ ابن کنول کی تخلیقیت میں صرف خارجی عوامل کا ہی دخل نہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ان کی تخلیقیت میں شعوری اور داخلی احساسات کارفرما ہیں، جو انھیں تخلیقیت کے اعلیٰ مقام پر فائز کرتے ہیں۔ نثر کے حوالے سے ابن کنول کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ اردو نثر کو لفظیات، ترکیب سازی، کردار نگاری، پیکر تراشی اور مختلف اعتبار سے بالکل ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ روایتی ڈگر سے انحراف کر کے اور راہ تقلید سے الگ انھوں نے اردو نثر کو ایک ایسے اسلوب اور لب و لہجے سے روشناس کرایا جو کہ منفرد اور جداگانہ ہے۔ یہی ایک بڑے فنکار کی علامت ہے۔

ابن کنول ایک تجربہ پسند اور تجربہ کار تخلیق کار تھے۔ ان کے یہاں عصری مسائل، خواہ وہ سیاسی ہوں، سماجی ہوں، تہذیبی ہوں

سب کے حوالے سے ابن کنول کی فکر مندی اور فنی ہنر مندی عمدہ رچاؤ بساؤ کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ افسانوں میں فرقہ وارانہ فسادات، جاگیردارانہ نظام اور شہری زندگی ان کے اہم موضوعات ہیں۔ بحیثیت افسانہ نگار جو چیز ابن کنول کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے وہ ان کا داستانوی رنگ و روپ ہے۔ چوں کہ ابن کنول کے یہاں داستانوں کے کافی گہرے مطالعے کا پتہ ملتا ہے۔ دور جدید میں وہ داستان شناسی کے واحد روشن منار تھے۔ داستان کی قرات و تفہیم میں ابن کنول اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں پر داستانوی ادب کے اثرات نمایاں ہیں۔ ''بند راستے'' میں شامل افسانے ''وارث'' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جس وقت بادشاہ کے وصال کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے قریب ترین وزیروں کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا:
> عزیزو تم سب ہمیں بے حد عزیز ہو، ہماری زندگی کا سرمایہ ہو، ہم اپنے رب کے بعد تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے ہماری زندگی کے سفر کو آسان کیا، ہر مشکل ساعت میں تم ہمارے مددگار رہوئے۔
> اے سلطان مہربان آپ کی خدمت کرنا ہمارے لئے اعزاز و افتخار کا باعث ہے کہ آپ کی بدولت ہمیں نجات ملے گی۔ سب کے لہجے میں عاجزی و انکساری تھی''

ابن کنول کے ہر افسانے کا اپنا ایک وجود ہے، ان کی ہر تحریر بذات خود ایک کہانی ہے جو ان کے تجربات کی عکاسی کرتی ہے۔ جس میں کردار، واقعہ، مکالمہ، فضا اور کیفیت سے ایک تحیراتی ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ابن کنول کا اسلوب نہایت ہی سادہ اور سلیس ہے۔ خیال میں تہہ داری ہے البتہ لب و لہجہ سہل ہے، کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ جملوں کی ساخت میں الفاظ کا رکھ رکھاؤ قابل ذکر ہے۔ عبارت میں کوئی جھول نہیں ہے۔ انداز تحریر یوں ہے کہ قاری اس میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ تمام کردار صفحہ قرطاس پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جذبات نگاری، کردار نگاری اور واقعات نگاری کے اعلی و ارفع نمونے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تحریر شوخی، ظرافت اور شگفتگی سے مرکب ہے جو قاری کو ایک عجیب لطف فراہم کرتی ہے۔ اس سلسلے میں گجرات کے فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں لکھے ان کے افسانے "خانہ بدوش" کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

> ''پولیس کی گاڑی نے انھیں ایک کیمپ میں اتارا دیا۔ اسے منی کے خیمے یاد آئے، عرفات اور مزدلفہ کے بے سایہ میدان اس کی نظروں میں گھوم گئے لیکن منظر بدلا ہوا تھا، چاروں طرف آہ و بکا، بے سروسامانی، برہنہ پا، برہنہ سر خواتین کا ہجوم، بے کفن لاشیں، اس نے محسوس کیا کہ اب وہ ابرہہ کے نرغے

میں ہے۔اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ابابیلوں کا دور دور تک پتہ نہیں
تھا،اس لئے کہ وہ اب تین سو تیرہ میں سے نہیں تھا''

ان کے افسانوں میں موضوعات،کردار،اسلوب،آرٹ،داخلیت،خارجیت،احساس کی گرمی،جذبات کی نرمی،مطالعہ کی گہرائی،مشاہدہ کی باریک بینی وغیرہ کی بھرپور چمک دمک اورانفرادیت ہے۔جس نے ناقدین اورقارئین کی نگاہوں کوخیرہ کردیا ہے۔

تحقیق وتدوین میں بھی ابن کنول نے اہم کارنامے سرانجام دیے ہیں۔تحقیق میں ان کاایک تاریخی کارنامہ ناول ''ریاض دلربا'' ہے۔ابن کنول نے اپنی تحقیق میں دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کا پہلا ناول ہریانہ کے ادیب منشی گمانی لعل کا ناول ''ریاض دلربا'' ہے۔اس کے علاوہ ''مضراب''،''بحر تجلیات''،''انتخاب سخن''،''اصناف پارنیہ'' وغیرہ ان کی اہم مرتب کردہ تصانیف ہیں۔تحقیق وتدوین کے ساتھ ساتھ ابن کنول نے بحیثیت نقاد بھی اپنی ایک خاص پہچان بنائی۔تنقید میں ابن کنول کا رویہ اعتدال پسندی کا ہے۔وہ نہ تو خالص روایتی انداز کی وکالت کرتے ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر جدیدیت کے حصار میں قید ہیں۔اردو فکشن کے لئے وہ کہانی پن کو لازمی قرار دیتے ہیں اسلوب میں سادگی ولطافت کے ساتھ ساتھ وہ داستانوی آہنگ کو اہمیت دیتے ہیں۔شاعری میں اعلیٰ تخیل،علامتی و اشارتی انداز اور تہذیبی وتاریخی پہلوؤں کو مقدم مانتے ہیں۔''تنقید و تحسین''،''داستان سے ناول تک''،''اردو افسانہ''،''تنقیدی اظہار''،''داستان کی جمالیات'' وغیرہ ان کی اہم تنقیدی تصانیف ہیں۔

ابن کنول نے خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری کے میدان میں افسانہ نگاری اور تحقیق وتنقید کے مقابل بہت دیر سے قدم رکھا۔لیکن انھوں نے چار پانچ برسوں کے مختصر سے عرصے میں خاکہ نگاری وانشائیہ نگاری کے میدان میں خود کو معتبر منوالیا۔خاکہ نگاری میں ابن کنول نے ایک منفرد انداز اپنایا۔ابن کنول خاکے میں کسی شخصیت کے داخلی وخارجی پہلوؤں کو قلم بند کرتے ہوئے بغیر کسی جھول کے صاحب خاکہ کے عہد وسماج کے سیاسی،سماجی،علمی وادبی زاویوں کو بھی منظر عام پر لے آتے ہیں۔ابن کنول کا جو انداز گفتگو تھا ان کی آواز میں جو بے باکی اور گھن گرج تھی ان کے تحریر کردہ خاکوں کی زبان واسلوب میں بھی وہی دائمی اور پختگی نظر آتی ہے۔اوران کے تحریر کردہ خاکے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ابن کنول ہمارے سامنے بول رہے ہوں اور ہم انھیں سنتے ہوں۔گوپی چند نارنگ پر لکھے گئے خاکے میں سے ایک اقتباس:

> ''ہم ذاتی یا نظریاتی اختلافات رکھتے ہوں،لیکن سچ یہ ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو زبان کے لئے اور اردو ادب میں جو کام انجام دیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ساہتیہ اکیڈمی کی صدارت کے عہدے تک کسی اردو والے کا پہنچنا ہی معجزہ ہے۔ساہتیہ اکیڈمی میں نارنگ صاحب کی وجہ سے ہی اردو کو منفرد مقام حاصل ہے۔پسند اور ناپسند ہر شخص کی ہوتی ہے۔ہم بھی اگر اس عہدے پر ہوتے تو اپنی مرضی کے کنوینر بناتے اور اپنے چاہنے والوں کو ایوارڈ سے نوازتے۔یہ تو

انسانی فطرت ہے،اس کی شکایت غیر انسانی ہے۔نارنگ صاحب کو جاننا ہے توان کی انسانی
کمزوریوں کو ہٹا کر دیکھیے۔خالص اردو کے ادیب کے طور پر دیکھیے،تب ان کے قد کا اندازہ ہوگا''

ان کے تحریر کردہ خاکوں میں شارب رودولوی، گوپی چند نارنگ، ارتضی کریم، محمد کاظم، خالد محمود وغیرہ کے خاکے قابل ذکر ہیں۔

ابن کنول غیر افسانوی نثر میں خاکہ نگاری اور انشائیہ نگاری کے ساتھ ساتھ اردو سفرنامہ نگاری میں بھی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔انھوں نے امریکہ، انگلستان، روس، ازبکستان، ماریشس اور پاکستان کے تاریخی سفر کیے۔اور اپنے ان اسفار کو نہایت عمدگی اور فنی چابکدستی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔جس طرح ابن کنول خاکہ نگاری میں اپنے ٹھہرے ہوے اسلوب اور استقلالی انداز میں ادبی جوہر دکھاتے ہیں۔اسی طرح سفرنامہ لکھتے ہوئے بھی وہ مکمل فنی پختگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ان کے سفرنامے اردو ادب میں زبان و بیان اور تفصیلات سفر کے حوالے سے خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ابن کنول سفرنامے میں مخص سفر کی اجمالی تصویر پیش نہیں کرتے بلکہ مکمل جزیات نگاری کے ساتھ احوال سفر قلم بند کرتے ہیں۔سفرنامہ لکھتے ہوئے ان کی زبان سلیس اور اسلوب میں روانگی رہتی ہے،کہیں کوئی اکھر پن محسوس نہیں ہوتا۔ابن کنول کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ سفر کی تصویر اتنے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو اپنے ساتھ سفر میں شریک کر لیتے ہیں۔اس حوالے سے ۲۰۰۶ء میں پاکستان فیصل آباد کے سفر پر تحریر کردہ سفرنامے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''جہاز کے دروازے پر ایئر ہوسٹس سر پر دوپٹہ رکھے آداب کر رہی تھیں۔جہاز میں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو بھی لکھی دیکھی۔جب اعلانات ہوئے تو السلام علیکم،انشاء اللہ،شکریہ،اللہ حافظ جیسے الفاظ سننے کو ملے۔پہلی بار کسی جہاز میں ایئر ہوسٹس کو اردو بولتے ہوئے سن کر ہم اردو والوں کو اچھا لگا۔ایئر ہوسٹس کے اعلان سے پہلے سفر کے دعا کی ریکارڈنگ بجائی گئی،پھر اس طرح اعلان کیا:

السلام علیکم۔معزز خواتین وحضرات ا پاکستان ایئر لائنز کی طرف سے ہم آپ کو خوش آمدید کہتے
ہیں۔ہم ۶۵۰۰۰ میٹر کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں۔انشاء اللہ ۴۵ منٹ میں ہم لاہور پہنچیں
گے''

المختصر ابن کنول کا شعور بہت پختہ تھا۔انہوں نے انسانی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا اور بحیثیت تخلیق کار ان کی بے باکی اور گہری فکر ان کا سب سے بڑا ہنر تھا۔ان کی فکر کا دائرہ بہت وسیع تھا،جس کی مثال ان کے تخلیقی ادب سے دی جاسکتی ہے۔افسانہ ہو یا داستان،خاکہ نگاری ہو یا سفرنامہ نگاری،تحقیق ہو یا تنقید ابن کنول ہر محاذ پر کامیاب نظر آتے ہیں۔

☆☆☆☆

پروفیسر ابن کنول: تعلیمی خیالات اور ادبی خدمات

سونو رجک
ریسرچ اسکالر مانو کالج آف ٹیچر ایجوکیشن دربھنگہ (بہار)
Mobile no:- 9708779952,7979072824
Email ID:- Sonu.06541@gmail.com

ہندوستانی اور بین الاقوامی فکر و دانش کے سرچشمے جن علوم وفنون، مذاہب، تہذیبوں، زبانوں، علاقائی ثقافتوں، تاریخی اور سماجیاتی جدلیات سے پھوٹتے ہیں ان سب کے معتبر اسکالر اور شناور شخصیات میں ایک نام پروفیسر ابن کنول کا ہے۔ پروفیسر ابن کنول کی شخصیت عالمی اردو ادب پر ایک جگمگاتے اور ٹمٹماتے ہوئے آفتاب و سیارے کی مانند ہے۔ اکیسویں صدی میں موصوف کی شخصیت صرف ایک فرد واحد کے طور پر ہی تسلیم نہیں کی جاتی بلکہ ان کی شہرت ومقبولیت عالمی سطح پر نمایاں ہے۔ دنیا کے جن حصوں یا جن تعلیمی اداروں میں اردو بولی جاتی ہے اور کبھی جاتی تھی، وہاں وہاں پروفیسر ابن کنول کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے عالمانہ خیالات، نظریات اور اپنی غیر معمولی علمی اور ادبی خدمات کی بنا پر اردو ادب میں ایک انقلاب برپا کیا۔ پروفیسر ابن کنول کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے، آپ بیک وقت افسانہ نگار، فکشن نگار، ناول نگار، انشائیہ نگار، خاکہ نگار، ڈرامہ نگار، سفرنامہ نگار، ناقد محقق، مدقق اور شاعر تھے۔

ابن کنول (پروفیسر ناصر محمود کمال) کی پیدائش آبائی وطن ڈبائی ضلع بلند شہر میں 15 / اکتوبر 1957 کو ہوئی۔ ان کا تعلق قصبہ بھجوئی کے ایک زمیندار خانوادے سے تھا۔ آپ کا اصل نام ناصر محمود کمال تھا، آپ کے والد معروف قومی شاعر قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی تھے۔ والد محترم مشہور قومی شاعر قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی تھے۔ ان کے اجداد شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور قاضی کے عہدے سے نوازے گئے حکومت کی طرف سے جاگیریں دی گئیں۔ بعد میں آپ کے بزرگ قصبہ ڈبائی میں آکر رہائش پزیر ہو گئے۔ آپ کا خاندان علمی وادبی سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ دادا قاضی شریعت اللہ (متوفی 1930) ایک قابل وکیل تھے۔ پردادا قاضی ادہم علی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے قصبہ ڈبائی علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اس قصبے نے اردو ادب کو کئی اہم شخصیات دی ہیں۔ وفاؔ ڈبائیوی، دعاؔ ڈبائیوی، انتظار حسین، منیب الرحمان اور ندا فاضلی جیسے اکابرین علم وفن اسی قصبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزادی سے پہلے یہاں علمی وادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں ہر طبقہ کو لوگ شوق سے شامل ہوا کرتے تھے۔ مشاعروں سے سبھی مذاہب کے لوگ لطف لیا کرتے تھے۔ بعد میں ان میں سے اکثر پاکستان چلے گئے یا علی گڑھ اور دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے۔ ان کے والد کنول ڈبائیوی کی شاعری وطن کی محبت کے جذبے سے معمور ہے۔ وہ ایک سچے محب وطن تھے۔ ان کی شاعری اس کا نمونہ ہے۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے "بساط زیست" اور

''سوز وطن'' اوران کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے۔ حال ہیں میں ان کی شاعری کو ایک کلیات کی شکل میں پروفیسر ابن کنول نے 'مضراب' کے نام سے شائع کیا ہے۔ وہ ایک اچھے محقق بھی تھے انہوں نے لوک ناٹک پر بھی کام کیا تھا۔ لوک ناٹک پر اردو زبان میں اب تک کوئی کتاب نہیں ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے لوک ناٹک کی تاریخ اور اس فن کے بارے میں تفصیلات فراہم کی ہیں۔ یہ کتاب ابھی اشاعت کے مرحلہ میں ہے۔ کنول ڈبائیوی کی شاعری کو پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین خاں، خواجہ احمد فاروقی، میکش اکبر آبادی اور پروفیسر عبدالحق جیسے مشہور ناقدین فن نے سراہا ہے۔

تعلیم و تربیت

ابن کنول نے اپنی ابتدائی تعلیم ضلع بدایوں کے قصبہ گنور میں ایک اسلامیہ اردو اسکول میں حاصل کی۔ آپ 1962 میں پہلی جماعت میں داخل ہوئے آپ کے پہلے استاد حاجی صفدر علی مرحوم تھے۔ پانچویں جماعت کے بعد آپ نے آگے کی تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے منٹو سرکل اسکول میں داخل ہوئے۔ 1972 میں ہائی اسکول مکمل کرنے کے بعد پری یونی ورسٹی سائنس میں داخلہ لیا۔ 1978 میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ایم اے کیا۔ یہاں کی علمی فضا سے بھر پور استفادہ کیا۔ پروفیسر ابن کنول کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں علی گڑھ میں پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر قاضی عبدالستار، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی، پروفیسر شہریار، پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر نعیم احمد اور پروفیسر اصغر عباس جیسے اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ ایم اے مکمل کرنے کے بعد آپ نے دہلی یونی ورسٹی کا رخ کیا۔ پی ایچ ڈی میں آپ نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نگرانی میں 'بوستان خیال کا تہذیبی ولسانی مطالعہ' کے عنوان سے تحقیقی کام کیا۔ آپ کی یہ کاوش کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔ دہلی میں آپ کو بانیٔ شعبۂ اردو خواجہ احمد فاروقی اور مشہور ترقی پسند نقاد قمر رئیس سے بھی شرف تلمذ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ 1985 میں شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی ہی میں درس تدریس سے وابستہ ہوئے۔ 1998 میں ریڈر، 2006 میں پروفیسر اور 2018 میں سینئر پروفیسر کے لیے ترقی ہوئی۔ آپ نے دو مرتبہ صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے فرائض انجام دیئے، 31 اکتوبر 2022 کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ عہد حاضر میں ابن کنول کو بلند و پایہ ادبی ہستیوں کی صحبت حاصل رہی جن میں پروفیسر قاضی عبدالستار، ڈاکٹر منظر عباس، پروفیسر شہریار، پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر نعیم احمد اور ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی قابل ذکر ہیں۔

اُردو زبان و ادب کے میدان میں پروفیسر ابن کنول کے کارنامے کثیر الجہات ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ وہ نہ صرف بلند پایہ مفکر محقق اور ممتاز دانشور تھے بلکہ بلند پایہ کے نقاد بھی تھے۔ وہ نظریہ ساز ادیب و فنکار بھی تھے اور عہد ساز شخصیت کے مالک بھی۔ وہ ادب کے حوالے سے تبدیل ہوتے رجحانات اور رویوں سے نہ صرف یہ کہ پوری طرح باخبر رہتے تھے بلکہ ان رجحانات کے ساتھ ساتھ خود کو بھی بدلنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ جمود و سکون کے قائل نہیں تھے۔ شہرت و مقبولیت کی یہ بھی بڑی وجہ تھی کہ وہ ادبی منظر نامے پر ہمیشہ تازہ دم نظر آتے اور نئی پرانی دونوں نسلوں کو ہر جدید اور تازہ نظریہ پر کھل کر گفتگو کے

مواقع فراہم کرتے تھے۔اس سلسلے میں انہوں نے تصنیف وتالیف اور فکر وفلسفہ کے علاوہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں اردو کے اتنے عظیم الشان اور یادگار سمینار منعقد کروائے ہیں جو نہ صرف تاریخی نوعیت کے حامل رہے بلکہ ان سے ادب کی نئی نئی راہوں پر چلنے اور منزل تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ان سے ایک پوری نسل کے ذہن ودماغ کی آبیاری ہوئی ہے اور ادبی فضا کو تابنا کی وروشنی حاصل ہوئی ہے۔

پروفیسر ابن کنول ایک ہمہ گیر اور کثیر الجہات شخصیت کا نام ہے اردو تنقید کے میدان میں بھی ان کی جہتیں مختلف ہیں جن میں اردو شاعری، اردونثر، اور اسلوبیات کے ساتھ ساتھ ان کا پسندیدہ میدان" اردو افسانہ بھی رہا ہے۔اردو تنقید کی تاریخ میں زیادہ تر نثر کی تنقید سے ہی سروکار رکھا گیا ہے یعنی ادب کے مطالعے میں فکشن کو بنیادی حیثیت حاصل رہی اور شاعری کو ثانوی مقام بھی مشکل سے دیا گیا۔ پروفیسر ابن کنول نے ہماری علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی کو اپنی تحریروں اور تقاریر سے نہایت دلچسپ انداز میں متاثر کیا ہے۔اردونثر کے ارتقائی سفر پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔کلاسیکی اور جدید نثر کے سلسلے میں ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔ پروفیسر ابن کنول موجودہ ادبی منظرنامے پر کلاسیکی نثر کے بڑے پارکھ تھے۔ پروفیسر ابن کنول پریم چند اسکول کے جدید قابل قدر اور عظیم افسانہ نگار (قلم کار) تھے اور دبستان قمر رئیس کے اہم ناقد اور محقق تھے۔شعبہء اردو دہلی یونیورسٹی کے وقار کی بازیافت، فلاح وترویج اور تعمیر وترقی میں آپ کا اہم کردار رہا ہے۔ابن کنول صاحب ہمیشہ باصلاحیت اور باہمت طلبا کی حتی الامکان معاونت کرتے اور اردو تحقیق وتنقید کو معیار ووقار بخشنے کی کوشش کرتے۔ابن کنول کا قلم آخری ایام تک رواں دواں تھا۔ ان کے افسانے اور علمی وادبی مضامین ملک وبیرون ملک کے رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔قومی وبین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کرتے رہتے، اس وجہ سے اس فہرست میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ابن کنول کے اس مختصر سے تعلیمی وسوانحی خاکہ کو سامنے رکھتے ہوئے ایک بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک عظیم قلم کار اور لکھاری تھے، باضابطہ پور پر ان کی تحریریں مختصر رسالوں اور جرائد کی زینت اور قارئین کے دلچسپی کا سامان ہوتی تھی۔ابن کنول اپنے قلم کا ذائقہ بدلنے کے لئے مختلف اصناف میں سے جسے بھی چاہتے تھے منتخب کر لیتے تھے اور اپنے اندر کی آواز کو اپنے قاری تک پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کرتے تھے۔ان کی تحریریں قاری کو عزم وحوصلہ دیتی ہیں۔حالات سے نبرد آزما ہونے کا سلیقہ دیتی ہیں۔ابن کنول کے یہاں آج کے قلم کاروں کے سیکھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔میں نے ان کے افسانوں کو بار بار پڑھا۔ ہر مرتبہ مجھے ان کے اندر کچھ نیا ملا ہے۔غالبا یہی وہ چیز ہے جس کو پروفیسر عتیق اللہ نے بین السطور سے تعبیر کیا ہے۔ابن کنول کے افسانے پس متن بھی کچھ بیان کرتے ہیں۔اس پس متن کو پڑھنے کے لئے افسانوں کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔زیادہ تر نثر کی تنقید سے ہی سروکار رکھا گیا ہے یعنی ادب کے مطالعے میں فکشن کو بنیادی حیثیت حاصل رہی اور شاعری کو ثانوی مقام بھی مشکل سے دیا گیا۔

ابن کنول نے فکشن کو طلسماتی انداز اور ماحول سے الگ کر کے حقیقی دنیا کے مرقع کو جس حُسن اسلوبی اور فطری انداز میں پیش کر کے

آئندہ نسلوں کے لیے افسانوی فن کا راستہ ہموار کیا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے۔ابن کنول نے زندگی کے معاملات سے اپنے آپ کو پابند کرلیا تھا۔وہ ایسے ماحول کی تصویر کشی کرتے رہے جو ان کے مشاہدے اور تجربے کا حصہ ہیں۔انھوں نے خیالی زندگی سے یکسر منہ نہیں پھیرا بلکہ تخلیق کے منصب کو اس کے حقیقی خدوخال میں واضح کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ان کا افسانوی فن زمانے کے نشیب وفراز کی افسانوی زندگی کی تاریخ کو رقم کرتا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فنکار تاریخ بیان نہیں کرتا مگر مورخ سے زیادہ کھلے ذہن اور کشادہ قلب سے معاشرتی،سماجی وتہذیبی،سیاسی اور معاشی حالات کو دیکھتا اور دکھاتا ہے اور اپنے فن کے ذریعہ ذہنی تحدیدات اور گھٹن زدہ فضا و ماحول کو کشادہ کرنے لگتا ہے،جس سے اس کے فن پارہ میں تخلیقی تاثرات سامنے ابھر کر آتے ہیں اور انہیں وہ افسانوی رنگ وروغن کے باوجود ایک ایسی حقیقت نمایاں کرتا ہے جس میں افسانوی رنگ بھی ہوتا ہے اور حقیقت وصداقت کی تصویریں بھی۔جہاں یہ تصویریں زمانے کے حالات وکوائف کو ظاہر کرتی ہیں،اس طرح سے فنکار کا فن عیاں اور روشن ہوتا ہے۔ابن کنول کے تخلیقی فن میں بظاہر واقعات اور حادثات کا ایک سلسلہ زندگی اور ماحول سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔

پروفیسر ابن کنول کی اب تک تقریباً 27 سے زائد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔انہیں میں ایک تصنیف خاکوں کا مجموعہ(کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی) کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے جو خاصا مقبول ہے مختلف شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔(مجموعہ میں کل 25 خاکے ہیں۔)ان میں طنز ومزاح کا لطف ہے تو کچھ بہت سنجیدہ ہیں۔لیکن کوئی خاکہ ایسا نہیں ہے جو قاری کو متاثر نہ کرے۔ان خاکوں کی متعدد خصوصیات ہیں سب سے بڑی خصوصیت تو زبان کی سادگی وسلاست ہے۔بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بقول" سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کردیے جائیں۔ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزا ہوگی۔سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے۔یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ابن کنول کے خاکوں میں آسان الفاظ تو ہیں مگر تحریر سپاٹ نہیں ہے اور لطف بیان سے خالی بھی نہیں ہے۔(گویا بابائے اردو کی زبان میں ابن کنول ایک باکمال ادیب کا نام ہے) تحریر میں غضب کی روانی ہے۔آمد ہی آمد ہے۔ایسا لگتا ہے کہ ہر خاکہ بیک نشست اور قلم برداشتہ لکھا گیا ہے۔کہیں بھی بے ربطی یا بے لطفی نہیں ہے۔تحریر میں جو بہاو ہے وہ قاری کو بہالے جاتا ہے اور وہ ایک خاکہ ختم کرتا ہے تو دوسرا شروع کردیتا ہے۔

تنویر احمد علوی کے خاکے کی چند سطور ملاحظہ ہوں،میرے دعوے کی تصدیق ہوجائے گی۔لکھتے ہیں:

> ''علوی صاحب دہلی آکر دہلی ہی کے ہورہے۔جن گلیوں میں ذوق اور غالب بستے تھے وہیں قیام کیا۔دہلی کی گلیوں سے ذوق کی طرح محبت ہوگئی۔پچاس سال سے زیادہ وقت عمر کا دہلی میں گزارا لیکن شاہ جہان آباد کی فصیل سے باہر نہ گھر کرائے پر لیا اور نہ بنایا۔جبکہ کتنے ہی دہلی والے دہلی اور اس کی تہذیب سے محبت کا دعویٰ تو کرتے رہے لیکن دہلی سے بیوفائی کرکے جمنا پار جا بسے''۔

اس اقتباس سے دہلی سے علوی صاحب کی محبت تو ظاہر ہی ہوتی ہے، وہ یہ خبر بھی دے دیتے ہیں کہ دہلی سے محبت کا دم بھرنے والے بہت سے لوگ دہلی کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔

اسی طرح قمر رئیس کے خاکے کی یہ سطور ملاحظہ ہوں:

> نوجوانوں میں قمر رئیس بہت مقبول تھے۔ دراصل ان کی گفتگو اور افعال نوجوانوں جیسے تھے۔ وہ اپنی عمر کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتے تھے۔ خواتین کی طرح اپنی عمر چھپاتے بھی تھے۔ جب پچھتر سال کے ہوئے تو کچھ شاگردوں نے ان کے یوم پیدائش پر جشن منانے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے کہا کہ کارڈ میں عمر کا ذکر نہیں کرنا ورنہ کوئی میری طرف دیکھے گا بھی نہیں"۔

اسی تسلسل میں یہ جملے بھی خاصے دلچسپ ہیں:

> قمر رئیس صاحب نسلاً پٹھان ضرور تھے۔ نام بھی گھر والوں نے مصاحب علی خان رکھا تھا۔ لیکن ان میں سوائے رنگ و روپ کے پٹھانوں والے خصائص نہیں تھے۔ ان میں سیدوں جیسی نفاست و نزاکت تھی۔ اتنے نرم دل تھے کہ جس نے ہنس کے بات کی بس اسی کے ہو لیے۔ خصوصاً اگر سامنے کوئی صنف نازک ہے تو تمام طلاقت لسانی اور شیریں زبانی مع تبسم صرف کر دیتے تھے۔" سنا ہے قمر صاحب نوجوانی میں ایسے نہیں تھے، یعنی جب شاہجہاں پور میں تھے نماز بھی پڑھتے تھے اور کبھی کبھی اذان بھی دیتے تھے لیکن لکھنو آئے تو پڑھے لکھوں کی صحبت میں بگڑ گئے۔ ان خاکوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ خاکہ نگار نے خود کو بڑا دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ ابن کنول جیسے ہیں ویسے ہی انھوں نے خود کو بھی پیش کر دیا ہے۔ جس طرح انھوں نے دوسروں کے محاسن وعیوب کو بیان کیا ہے اپنے عیوب بھی بیان کر دیے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے اور چھپ چھپاتے نہیں بلکہ علی الاعلان کیا ہے۔ جس کی وجہ سے تقریباً تمام خاکوں میں ان کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی کے حوالے سے اردو دنیا کو ایک نیا اور اچھا ناکہ نگار مل گیا ہے۔ میرا خیال ہے ابن کنول کو عہد حاضر کے صف اول کے خاکہ نگاروں میں شمار کرنا چاہئے۔

پروفیسر ابن کنول کا شمار اردو کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے، آپ بیک وقت افسانہ نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار، سفرنامہ نگار، ڈرامہ نگار، ناقد، محقق اور شاعر ہیں۔

ادبی نشو ونما اور ادبی خدمات

ابن کنول ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد کنولؔ ڈبائیوی ایک قومی شاعر تھے، شعر وادب کی خدمت آپ کا مشغلہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کی تربیت میں رہ کر آپ کے ادبی ذوق کو جلا ملی ہوگی۔ ابن کنول کے والد کہا کرتے تھے کہ ہماری زمینداری ہماری اولاد ہے۔ انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ الحمدللہ ان کے سبھی لڑکوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اسکول کے زمانے میں ہی آپ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے لگے تھے۔ آپ کے اسکول کے ساتھی اسلم

حنیف شاعری کیا کرتے تھے اور آپ کہانی لکھے آ تھے۔کبھی کبھی ان سے متاثر ہوکر ابن کنول بھی شاعری میں طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ابن کنول بتاتے ہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی تخلیقات پڑھ کر سناتے اور خوش ہوتے۔یہ ابتدائی زمانے کی شاعری اور افسانے ظاہر ہے کہ اس معیار کی نہیں ہوتی تھیں کہ انہیں افسانہ یا شاعری میں شمار کیا جاتا۔لیکن کہتے ہیں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔یہ ابتدائی نگارشات ابن کنول کے مستقبل کے ادبی سفر کی تمہید تھے۔ابن کنول کے ادبی ذوق کو جلا بخشنے میں علی گڑھ کی ادبی وعلمی فضا کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ایم اے میں آپ ''انجمن اردوئے معلیٰ'' کے سکریٹری رہے۔یہ وہی انجمن ہے جس کی بنیاد مولانا حسرت موہانی نے رکھی تھی۔اسلم حنیف سے متاثر ہوکر ابن کنول نے اس زمانے میں انسان کے چاند پر قدم رکھنے پر پہلی نظم کہی تھی جو ماہنامہ نور رامپور میں شائع ہوئی۔لیکن جلد ہی ابن کنول نے اندازہ لگا لیا کہ ان کا حقیقی میدان افسانہ ہے۔اس وجہ سے آپ نے اپنی توجہ اسی طرف رکھی۔ابتدا میں ناصر کمال کے نام سے افسانے لکھتے تھے۔لیکن 1975 سے ابن کنول کے نام سے افسانے لکھنے لگے۔ابن کنول اصل میں آپ کے والد کی طرف نسبت ہے۔باقاعدہ افسانہ لکھنے کا آغاز 1972 سے ہوا۔آپ کا پہلا مطبوعہ افسانہ 'اپنے ملے اجنبی کی طرح' ہے جو 1974 میں آفتاب سحر (سکندرآباد) نامی رسالے میں شائع ہوا۔جب 1973 میں آپ نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا تو قاضی عبدالستار کی سرپرستی مل گئی۔قاضی عبدالستار کے مکان پر ماہانہ نشستیں ہوتی تھی جس میں نوجوان ادیب اپنی نگارشات پیش کیا کرتے تھے اور قاضی عبدالستار اور دیگر ان پر تبصرہ کرتے تھے۔ان نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں جو لوگ تھے ان میں سے چند اہم نام یہ ہیں: شارق ادیب، سید محمد اشرف، غضنفر، پیغام آفاقی، طارق چھتاری، غیاث الرحمان، صلاح الدین پرویز، آشفتہ چنگیزی، فرحت احساس، اسعد بدایونی، مہتاب حیدر نقوی وغیرہ۔علی گڑھ میں تعلیم کے دوران میں آپ کے افسانے ملک کے معروف ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے۔جن میں شاعر، عصری ادب، آہنگ، صبح ادب اور نشانات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ابن کنول نے بتایا کہ 'بندر راستے' جب 1976 میں عصری ادب میں شائع ہوا تو محمد حسن نے اس کی بڑی تعریف کی۔طالب علمی کے زمانے میں اردو کے اس عظیم ناقد سے تحسین کے کلمات کسی سند سے کم نہیں تھے۔دہلی یونی ورسٹی میں داخل ہونے کے بعد بھی افسانہ نگاری کا سلسلہ برقرار رہا۔یہاں آکر پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی تربیت میں آپ کے اندر تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتیں پروان پائیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو افسانہ، تنقید اور تحقیق جیسے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ان کے افسانے اور علمی و ادبی مضامین ملک و بیرون ملک کے رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔قومی و بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی۔ان کی تصانیف میں تیسری دنیا کے لوگ (افسانے) 19842، بندر راستے (افسانے) 2000۔ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں 19883۔('بوستان خیال ایک مطالعہ' کے نام سے 2005 میں دوبارہ شائع ہوئی)۔ریاض دلربا (اردو کا پہلا ناول) (تحقیق) 19904، تنقید و تحسین (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2006، نظیر اکبرآبادی کی شاعری 2008۔مضراب (کنول ڈبائیوی کا کلیات معہ مقدمہ) 2010۔اردو افسانہ (افسانوی تنقید) 2011 وغیرہ قابل ہیں۔

اپنے منفرد لب ولہجہ کی وجہ سے اپنے ابن کنول نے اردو دنیا میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ابن کنول کے افسانوں کی سب سے اہم خصوصیت جو ان کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے داستانوی رنگ وآہنگ۔ابن کنول کے افسانوں پر داستانوی ادب کے اثرات بہت واضح ہیں۔خود ابن کنول کو بھی اس بات کا اعتراف ہے۔اس کی وجہ ان کی نظر میں یہ ہے کہ انہوں نے داستانوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔داستان ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔اس وجہ سے داستانوی زبان ان کی لفظیات پر حاوی ہے۔اسّی کی دہائی کے بعد لکھنے والے بہت سے افسانہ نگاروں نے داستانوی رنگ میں افسانے لکھے ہیں۔عام طور پر انتظار حسین کو اس منزل کا راہ رو سمجھا جاتا ہے۔مگر ابن کنول کا ماننا ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کو انتظار حسین نے نہیں بلکہ براہ راست داستانوں نے متاثر کیا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں سلام بن عبد الرزاق، حسین الحق، عبد الصمد، قمر احسن، ساجد رشید، انور خاں، شوکت حیات، سعید سہروردی، سید محمد اشرف، غضنفر اور انجم عثمانی سب کے یہاں کسی نہ کسی شکل میں داستانوی رنگ وآہنگ مل جاتا ہے۔

ابن کنول اپنے ایک مضمون 'اردو افسانہ اور داستانوی طرز اظہار' میں لکھتے ہیں:

> ''مختصر افسانہ نگاروں نے داستانوں سے مختلف انداز میں استفادہ کیا ہے۔بعض نے اپنے افسانوں کے عنوانات اس طرح رکھے ہیں کہ ان پر داستانوں کا گمان ہوتا ہے۔ابن کنول عموماً اپنے افسانوں کی ابتدا داستانوی زبان میں کرتے ہیں۔ابن کنول نے اپنے بعض افسانوں کے نام بھی داستانوں کے طرز پر رکھا ہے۔جیسے 'ہمارا تمہارا خدا بادشاہ' اور 'آنکھوں کی سوئیاں' وغیرہ۔ ابن کنول کے یہ سبھی افسانے جن میں داستانوی اثرات ہیں سن 1980 سے پہلے کے ہیں۔ 1980 کے بعد کے افسانوں میں داستانوی عناصر کم ہیں۔اس کے باوجود چند الفاظ ایسے ہیں جو ان افسانوں میں بھی مل جاتے ہیں۔جیسے 'اور ہر پھر ایسا ہوا' اور 'اور پھر یوں ہوا' یہ جملے بھی داستانوں اثرات کی نشان دہی کر رہے ہیں۔''

ابن کنول افسانہ نگار کے ساتھ ایک ناقد بھی ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں فحاشیت کو جگہ دی ہے اور نہ ان کی تنقیدوں میں ان کے لیے کوئی جگہ ہے۔دراصل کہانی یا قصہ پن داستانوی ادب کی جان ہے۔داستان اگرچہ صرف کہانی قصہ ہی نہیں بلکہ تہذیبی مرقعے بھی ہیں۔بقول ابن کنول 'داستانوں میں اگرچہ فرضی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں لیکن ان داستانوں میں جو تہذیبی مرقعے ہیں، وہ سو فی صدی سچ ہیں' لیکن داستانوں میں پورا زور کہانی پر ہوتا ہے۔ابن کنول ''میں کیوں لکھتا ہوں'' کے عنوان تحت اپنے متعلق کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> ''شاید تم سمجھ گئے ہوگے میں کیوں لکھتا ہوں۔میں اپنے احساسات کو الفاظ دینے کی کوشش کرتا ہوں۔واقعات اور حادثات چہار جانب بکھرے ہوئے ہیں۔ان کا بیان الفاظ چاہتا ہے، میں انہیں الفاظ دے کر رقم کرنا چاہتا ہوں۔میں اس میں کتنا کامیاب ہوں۔اس کا فیصلہ تم کروگے۔تم سب۔

پروفیسرابن کنول کی کئی اہم کتابوں پر دہلی، اتّر پردیش، ہریانہ، بہاراور مغربی بنگال کی اردو اکاڈمیاں انھیں انعامات سے نواز چکی ہیں۔آپ امریکہ، ماریشس، انگلینڈ، پاکستان، روس اوراز بکستان کے عالمی سمیناروں میں شرکت کر چکے ہیں۔آپ نے گزشتہ چالیس برسوں میں متعددقومی اور بین الاقوامی سیمناروں اورکانفرنسوں میں مقالات اور کلیدی خطبات پیش کیے ہیں۔آپ کی تخلیقی خدمات پر آپ کودہلی اردو اکیڈمی فکشن ایوارڈ، ہریانہ اردو اکیڈمی کنورمہندرسنگھ بیدی ایوارڈ،مغربی بنگال اکیڈمی عبدالغفورنساخ ایوارڈ،سرسیدملینیم ایوارڈ برائے اردوفکشن اورغالب انسٹی ٹیوٹ،نئی دہلی کے اردونثرایوارڈ سے نوازا گیا۔ اردوزبان وادب کا یہ چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے 11 فروری 2023 کومحبان اردوکوالوداع کہہ گیا۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کرگیا

دعا ہے کہ رب کریم انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔آمین ثم آمین

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆

کتابیات

1) ہندوستانی تہزیب بوستان خیال کے تناظر میں پروفیسرابن کنول 1988
2) تنقید وتحسین مجموعہ مضامین ڈاکٹرابن کنول 2015
3) تنقید اظہار کتابی دنیا نئی دہلی پروفیسرابن کنول 2006
4) تیسری دنیا کے لوگ مکتبہ جامعہ نئی دہلی پروفیسرابن کنول 1984
5) اردوافسانہ ای ایس بی این نمبر 9789380919249 غالب اکیڈمی نئی دہلی پروفیسرابن کنول 2011

☆☆☆☆

میرے خیال میں تو ادبی چوریوں کو جائز قرار دینا چاہئے۔اب آپ کے کلام میں میر، غالب، یا اقبال وغیرہ کے خیال آجاتے ہیں تو اس میں آپ کی کیا غلطی ہے۔

(چوری کے بابعد جدید طریقے)

ابن کنول کی شخصیت اور ادبی خدمات

ڈاکٹر محمد شاہد زیدی
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
گورنمنٹ پی۔جی۔کالج،سوائی مادھوپور(راجستھان)
رابطہ:9461103904
m.zaidishahid@gmail.com

ابن کنول کا نام اردو افسانوی ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ مایہ ناز ادیب، محقق، ناقد، افسانہ نگار، خاکہ نگار، ڈرامہ نگار، انشائیہ پرداز، مفکر، شاعر، مضمون نگار اور درجنوں کتابوں کے مصنف کے ساتھ ساتھ ہر دلعزیز استاد بھی تھے۔ ابن کنول کا انداز بیان اور موضوعات ان کے ہم عصروں سے مختلف ہیں۔ ابن کنول کے ادبی کارناموں پر گفتگو کرنے سے پہلے ان کے خاندانی پس منظر اور تعلیمی سفر پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ آپ 15 اکتوبر 1957 کو ضلع مرادآباد کے شہر ہجوئی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام ناصر محمد کمال تھا۔ آپ کے ناصر محمد کمال سے ابن کنول بننے کی وجہ ان کے والد کا تخلص تھا ان کے والد محترم قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی ایک معتبر قومی شاعر تھے اور ادبی حلقوں میں کنول کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اسی مناسبت سے ناصر محمد کمال نے ادبی اور قلمی نام ابن کنول ڈبائیوی کے طور پر کنول اختیار کیا۔ ان کے اجداد شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور قاضی کے عہدے سے نوازے گئے۔ حکومت کی طرف سے ان کو جاگیر دی گئی۔ بعد میں آپ کے بزرگ قصبہ ڈبائی (بلند شہر) میں آکر رہائش پذیر ہوے۔ آپ کا خاندان علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ آپ کے پردادا قاضی ادہم علی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ آپ کے دادا قاضی شریعت اللہ اپنے دور کے قابل وکیل تھے۔

ابن کنول کی ابتدائی تعلیم کا آغاز 1962 میں بدایوں کے قصبہ گنور میں ایک اردو میڈیم اسلامیہ اسکول سے ہوا۔ جہاں آپ نے پہلی سے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ مزید تعلیمی سفر کا باقاعدہ آغاز علی گڑھ سے ہوا جہاں 1967 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے منٹوسرکل اسکول میں داخل ہوئے۔ 1972 میں ہائی اسکول مکمل کرنے کے بعد پری یونیورسٹی سائنس میں داخلہ لیا۔ بقول ابن کنول" والدین میڈیکل کالج میں داخلہ دلانا چاہتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ان کی بھی خواہش تھی کہ ان کا لڑکا بڑا ہوکر ڈاکٹر یا انجینئر بنے مگر ایسا نہ ہوا آخر کار بی اے میں اردو لے کر بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد 1978 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ یہاں کی علمی فضا سے بھرپور استفادہ کیا۔ آپ خوش قسمت تھے کہ آپ کو علی گڑھ میں اردو ادب کی قدآور ہستیوں سے کسب فیض کا موقع ملا جن ادبی ہستیوں کی صحبت ابن کنول کو میسر رہی ان میں پروفیسر خورشید

الاسلام، پروفیسر قاضی عبدالستار، ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، پروفیسر منظر عباس، پروفیسر شہر یار، پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر نعیم احمد، پروفیسر اصغر عباس شامل ہیں۔ 1978 میں ایم اے کرنے کے بعد آپ نے دہلی یونیورسٹی کا رخ کیا جہاں آپ نے 1979 میں ایم فل (اردو) کیا اور وہیں سے 1984 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے دہلی یونیورسٹی سے اپنا رشتہ اس طرح قائم کیا کہ پھر اس دن سے لے کر آخری دم تک قائم رہا۔ پی ایچ ڈی میں آپ نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نگرانی میں" بوستان خیال کا تہذیبی ولسانی مطالعہ" کے عنوان سے تحقیقی کام کیا۔ دہلی میں آپ کو خواجہ احمد فاروقی اور مشہور ترقی پسند نقاد قمر رئیس سے بھی شرف حاصل کرنے کا موقع ملا۔ آخر میں دہلی کو ہی آپ نے اپنی علمی، ادبی اور قلمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔

ابن کنول تعلیم کے زمانے سے ہی ادبی دنیا میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ تعلیمی سلسلہ ختم ہونے کے بعد جلد ہی آپ کو دہلی یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد آپ 1985 میں سی ایس آئی آر کی طرف سے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ سائنٹسٹ کے طور پر آپ کو ملازمت ملی۔ اپنی صلاحیتوں کے دم پر ترقی کرتے ہوئے 1987 سے 1990 تک دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1990 میں ہی مستقل لیکچر کے عہدے پر آپ کی تقرری ہوئی۔ اس کے بعد 1998 میں ریڈر اور جنوری 2006 میں ترقی کرتے ہوئے پروفیسر اور 2018 میں سینئر پروفیسر کے عہدے پر پہنچے۔ آپ نے 2005 سے 2008 تک اور بعد میں ریٹائرمنٹ تک صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے فرائض بھی انجام دیے۔ آپ دہلی یونیورسٹی میں درس وتدریس سے 37 سال وابستہ رہے۔ ایک طویل عرصے تک دہلی یونیورسٹی میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد 31 اکتوبر 2022 کو صدر شعبہ اردو کے عہدے سے سینئر پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ علمی منصبی حصولیابیوں کے باوجود ابن کنول ایک سادہ زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ وہ ایک ملنسار ہنس مکھ انسان تھے اپنے شاگردوں کے ساتھ ان کا معاملہ ایک استاد سے بڑھ کر دوست کا ہوتا تھا۔ وہ سینئر استاد کی حیثیت سے طلبہ واساتذہ میں یکساں مقبول تھے ان کی نگرانی میں تقریبا 38 پی ایچ ڈی اور 50 ایم فل کے تحقیقی مقالے تحریر کیے گئے۔ ملک اور بیرون ملک آپ مختلف یونیورسٹیوں میں ممتحن اور بورڈ آف اسٹڈیز کے رکن بھی رہے۔

ابن کنول ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کنول ڈبائیوی بھی ایک قومی شاعر تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تربیت میں رہ کر آپ کے ادبی ذوق کو جلا ملی ہوگی۔ اسکول کے زمانے میں ہی آپ چھوٹی چھوٹی کہانیا لکھنے لگے تھے۔ آپ کے اسکول کے ساتھی اسلم حنیف شاعری کیا کرتے تھے اور آپکہانی لکھتے تھے۔ کبھی کبھی آپ بھی ان سے متاثر ہوکر شاعری میں طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ ابن کنول کے ادبی ذوق کو جلا بخشنے میں علی گڑھ کی ادبی فضا کا بڑا رول رہا ہے۔ ایم اے میں آپ" انجمن اردوئے معلیٰ" کے سیکریٹری رہے۔ ابن کنول نے اسی زمانے میں انسان کے چاند پر قدم رکھنے پر پہلی نظم کہی تھی جو ماہنامہ نور (رامپور) میں شائع ہوئی۔ لیکن جلد ہی ابنکنول سمجھ گئے کہ ان کا حقیقی میدان شاعری نہیں افسانہ ہے۔ اور اپنی پوری توجہ افسانہ

نگاری پر صرف کر دی بقول ابن کنول:

جیسا کہ میں نے کہا کہ گھر میں ادبی ماحول تھا، پھر بچپن ہی سے کچھ دوست بھی ایسے ملے، اسکول ہی کے زمانے میں شعر موزوں کرنا شروع کر دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی، گنور میں اس وقت مشاعرے بہت ہوتے تھے۔ ابراحسنی گنوری اس وقت موجود تھے۔ والد مرحوم مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ میں بھی شریک ہوتا تھا۔ علی گڑھ آنے کے بعد باقاعدہ افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ علی گڑھ کے ماحول کا بہت اثر ہوا۔"

(بحوالہ اردو فکشن اور علی گڑھ، ڈاکٹر فرح جاوید ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی 2012، ص:252)

باقاعدہ افسانہ لکھنے کا آغاز 1972 سے ہوا۔ ابتدا میں ناصر کمال کے نام سے افسانے لکھے پھر 1975 سے ابن کنول کے قلمی نام سے افسانے لکھنے لگے۔ آپ کا پہلا مطبوعہ افسانہ "اپنے ملے اجنبی کی طرح" ہے جو 1974 میں نامی رسالے آفتاب سحر (سکندرآباد) میں شائع ہوا۔ علی گڑھ میں زمانہ تعلیم کے دوران آپ کو قاضی عبدالستار کی سرپرستی مل گئی۔ آپ کے افسانے ملک کے معروف ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگے جن میں شاعر، عصری ادب، آہنگ، صبح ادب اور نشانات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بقول ابن کنول:

"طالب علمی کے زمانے سے اردو کے مختلف رسائل میں افسانے چھپنے شروع ہو گئے تھے، شاعر، عصری ادب، آہنگ، جیسے رسائل میں اشاعت سے میرا کافی حوصلہ بڑھا اور اسکے علاوہ علی گڑھ میں جو ادبی محفلیں منعقد ہوئی تھیں ان میں اکثر میں بھی افسانے سنایا کرتا تھا۔"

(ماہنامہ، ماہ نور، 2007، ص:23)

1976 میں ان کا ایک اور افسانہ "بند راستے" رسالہ عصری ادب میں شائع ہوا تو ڈاکٹر محمد حسن نے داد و تحسین دی اس سے ابن کنول کو بڑا حوصلہ ملا۔ دہلی یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد بھی افسانہ نگاری کا سلسلہ برقرار رہا یہاں آکر پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی تربیت میں آپ کے اندر تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتیں پروان چڑھیں۔ ابن کنول نے افسانہ، تنقید اور تحقیق ہر میدان میں ایک سے بڑھ کر ایک تخلیق پیش کی ہیں ان کا ہر کام نئی منزل کا پتا دیتا ہے۔ ان کے افسانے اور علمی و ادبی مضامین ملک و بیرون ملک کے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ آپ نے بہت سی قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں بطور خصوصی ممبر شرکت کی ہیں۔ اس کے لئے آپ نے کئی غیر ملکی سفر کئے جن میں امریکا، ماریشس، انگلینڈ، پاکستان، متحدہ عرب امارات، ازبکستان اور روس کے سفر شامل ہیں۔ آپ نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں واقع یونیورسٹیوں کی جانب سے منعقدہ سمیناروں میں بھی شرکت کی۔ اس کے علاوہ بطور ممتحن بھی آپ نے ملک اور بیرون ملک کی یونیورسٹیوں کا دورہ کیا۔ ابن کنول کے اس مختصر سے سوانحی خاکے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک قلم کار ہیں وہ اپنے قلم کا ذائقہ بدلنے کے لیے مختلف اصناف میں سے جسے بھی چاہتے ہیں چنتے ہیں اور اپنے اندر کی آواز کو اپنے قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ان کی تحریریں قاری کو عزم و

حوصلہ دیتی ہیں۔ابن کنول کے یہاں آج کے قلم کاروں کو سیکھنے کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔

ابن کنول نے اپنی قلمی سرگرمی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا انہوں نے عام لوگوں کے مسائل اور مشکلات کو مرکز میں رکھتے ہوئے افسانے لکھے۔ابن کنول اپنے قلمی نام کی طرح اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی منفرد تھے۔وہ اردو دنیا میں افسانہ نگار، خاکہ نگار، محقق اور مرتب کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے تنقید نگار کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔انہوں نے بیش بہا علمی و ادبی سرمایہ چھوڑا ہے۔ان کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں اردو کی خدمت کے حوالے سے ہی وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائیوا کے لیے گئے تھے جہاں 11 فروری 2023 کو انہیں دل کا دورہ پڑا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے علی گڑھ میں ہی انہیں سپرد خاک کیا گیا۔ان کے پسماندگان میں اہلیہ (صبیحہ ساغر) ایک فرزند (محمد عالش) اور چار بیٹیوں (اریبہ ناصر، زیانہ ناصر، ارشیہ ناصر اور عذبہ ناصر) کے ساتھ ساتھ تقریباً دو درجن سے زیادہ کتابیں بھی شامل ہیں۔ان کی تخلیقی کاوشوں میں افسانے، ڈرامے، تحقیقی و تنقیدی مضامین، خاکے، انشائیے اور سفرنامے شامل ہیں۔ابن کنول نے اردو ادب کی خدمات کے سلسلے میں جن کتابوں سے ہمیں سرفراز کیا وہ تحریر کردہ کتابیں ادب والوں کے لئے ایک رہنما کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

1۔تیسری دنیا کے لوگ (افسانوی مجموعہ) 1984، 2۔ہندوستانی تہذیب (بوستان خیال کے تناظر میں) 1988، 3۔ریاض دلربا (تحقیق) 1990، 4۔آؤ اردو سیکھیں (قاعدہ) 1993، 5۔سیرت مسیح (مرتب) 1998، 6۔بند راستے (افسانوی مجموعہ) 2000، 7۔داستان سے ناول تک (تنقید) 2001، 8۔داستان سے ناول تک (اضافہ شدہ) 2003، 9۔انتخاب سخن (اردو شاعری کا نیا انتخاب) 2005، 10۔منتخب غزلیات (امیر خسرو سے ناصر کاظمی تک) 2005، 11۔منتخب نظمیں 2005، 12۔اصناف پارینہ (مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، مرتب) 2005، 13۔تنقید و تحسین (تنقیدی مضامین) 2006، 14۔تحقیق و تدوین (مرتب) 2006، 15۔باغ و بہار (مقدمہ و متن، مرتب) 2008، 16۔پہلے آپ (ڈرامے) 2008، 17۔نظیر اکبر آبادی منتخب شاعری (مرتب) 2008، 18۔مضراب (کلیات کنول ڈبائیوی، مرتب) 2010، 19۔اردو افسانہ (افسانوی تنقید) 2011، 20۔مونوگراف (میر امن) 2012، 21۔اردو لوک ناٹک روایت و اسالیب (مرتب) 2014، 22۔پچاس افسانے (افسانوی مجموعہ) 2014، 23۔نظیر اکبر آبادی (ہندی) 2014، 24۔خانہ بدوش 2014، 25۔تنقیدی اظہار (تنقیدی مضامین) 2015، 26۔فسانہ عجائب (مقدمہ و متن) 2016، 27۔اہل الکہف اور الحلم (افسانے) عربی مترجم احمد قاضی، مصر، 2018، 28۔اردو شاعری (تنقید) 2019، 29۔بزم داغ (ڈرامے) 2020، 30۔داستان کی جمالیات 2020، 31۔کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی (خاکے) 2020، 32۔بساط نشاط دل (انشائیے) 2021، 33۔چار گھونٹ (سفرنامے) 2022، 34۔تبریک (تقاریظ)۔

آپ کو اپنی ادبی خدمات کے لئے کئی سرکاری انجمنوں نے انعامات و اعزازات سے نوازا جن میں:

1۔افسانہ بندراستے پر 1979 میں دہلی یونیورسٹی نے ہریش چندر کٹھپالیا گولڈ میڈل دیا۔ جسے سابق نائب صدر جمہوریہ جناب بی ڈی جتی نے اپنے ہاتھوں سے پیش کیا۔

2۔تیسری دنیا کے لوگ، ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں، داستان سے ناول تک، بندراستے، تنقید وتحسین اور اردو افسانہ پراتر پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمیاور مغربی بنگال اردو اکادمی نے 1985 میں انعامات سے نوازا۔

3۔سرسید ملینیم ایوارڈ، دہلی برائے اردو فکشن 2001۔ڈاکٹر من موہن سنگھ نے پیش کیا۔

4۔دہلی اردو اکادمی ایوارڈ 2004

5۔ہریانہ اردو اکادمی کا کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ برائے ادبی خدمات 2007۔گورنر ہریانہ جناب اخلاق الرحمن قدوائی کے ہاتھوں ملا۔

6۔دہلی اردو اکادمی فکشن ایوارڈ 2008 دہلی کی وزیر اعلی شیلا دکشت کی طرف سے ملا۔

7۔دہلی اردو اکادمی کتاب ایوارڈ 2010

8۔دہلی اردو اکادمی کتاب ایوارڈ 2012

9۔پہچان اردو ایوارڈ، جامعہ اردو علی گڑھ 2016

10۔عبدالغفور نساخ ایوارڈ، مغربی بنگال اردو اکادمی کلکتہ 2017

11۔غالب اردو ایوارڈ 2022

12۔اودھ فاونڈیشن لکھنو نے بھی ایوارڈ سے نوازا 2022

انہیں داستان کی تنقید میں ایک امتیاز حاصل تھا ہم عصر افسانہ نگاروں میں جن لوگوں نے اپنے منفرد لب و لہجے سے اردو دنیا میں اپنی پہچان بنائی ان میں ابن کا نام سرفہرست تھا ابن کنول کے افسانوں کی سب سے اہم خصوصیات جو ان کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا داستانوی رنگ وآہنگ ہے۔انہوں نے کئی اصناف ادب میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی محبوب اصناف افسانہ اور خاکہ رہی ہیں۔

پروفیسر ابن کنول کی علمی وادبی خدمات پچھلی پانچ دہائیوں پر محیط ہے۔آپ کی علمی وادبی کاوشوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے استاد سابق ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے صدر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے پروفیسر ابن کنول کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

اردو ادب کا ایک ایسا ستارہ غروب ہوا جس کا متبادل ممکن نہیں جو اپنی ادبی خدمات، تنقیدی بصیرت اور دانشورانہ نظریے اور اپنے مخلصانہ رویوں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔"

(آئی این بیورو، دہلی 16 فروری 2023)

معروف فکشن نگار اسلم جمشید پوری کا ابن کنول کے اسلوب اور طرز نگارش کے بارے میں کہنا ہے کہ:

افسانہ نگاری میں وہ 1970 کے بعد کے اکیلے ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے انتظار حسین کے اسلوب میں افسانے لکھے۔ داستانوی اسلوب کو آگے بڑھانے کا کام ابن کنول نے کیا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ان کے اسلوب اور انوکھے پن کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔"

(جمال عباس فہمی، قومی آواز، دہلی 13 فروری 2023)

اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین ڈاکٹر یوسف خشک نے ابن کنول کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ:

پروفیسر ابن کنول نے بیش بہا علمی وادبی سرمایہ چھوڑا ہے، ان کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔"

(قندیل، اسلام آباد، 15 فروری 2023)

قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

ابن کنول محبت اور شفقت کی ایک جلی علامت تھے۔ ان کی موت سے اردو زبان وادب کا ناقابل تلافی خسارہ ہوا ہے۔ ابن کنول نے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی لیکن داستان ان کا خاص موضوع تھا۔ اس کے علاوہ افسانے، خاکے، انشائیے اور تحقیق وتنقید پر بھی انہوں نے گراں قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت فنکار تھے۔ ان کی تخلیقات انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔"

یو این آئی اردو سروس، دہلی، 13 فروری 2023

☆☆☆☆

جہاز کے دروازے پر ایئر ہوسٹس سر پر دوپٹہ رکھے آداب کر رہی تھیں۔ جہاز میں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو بھی لکھی دیکھی۔ جب اعلانات ہوئے تو السلام علیکم، انشاء اللہ، شکریہ، اللہ حافظ جیسے الفاظ سننے کو ملے۔ پہلی بار کسی جہاز میں ایئر ہوسٹس کو اردو بولتے ہوئے سن کر ہم اردو والوں کو اچھا لگا۔ ایئر ہوسٹس کے اعلان سے پہلے سفر کے دعا کی ریکارڈنگ بجائی گئی۔

(چار کھونٹ سے)

اخباروں کے تراشے

پروفیسر ابن کنول کا انتقال اردو دنیا کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے۔ان کے وفات کی خبر کو اہم اخبارات نے خصوصی طور پر جگہ دی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مؤقر رسالے "اردو دنیا" نے ایک خصوصی گوشہ شائع کیا جس میں راقم الحروف کا بھی ایک مضمون شامل ہے۔ یہاں پر چند اخبارات کے تراشوں کے پیش کیا جارہا ہے تا کہ آپ کی ادبی خدمات پر تحقیقی کام کرنے والوں کے کام آئے۔راقم الحروف نے ابن کنول کی زندگی ہی میں ان کی ادبی تحریروں کے لیے ایک ویب سائٹ www.ibnekanwal.com بنائی تھی جواب بھی فعال ہے۔اس ویب سائٹ پر آپ کی ادبی تحریروں کے علاوہ ان پر کئے گئے کاموں کی تفصیل بھی موجود ہے۔قارئین اس ویب سائٹ پر جا کر ان کی تحریریں پڑھ سکتے ہیں۔(مدیر)

پروفیسر ابن کنول نم آنکھوں کے ساتھ علی گڑھ میں سپرد خاک

تدفین میں اے ایم یو، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ اور محبان اردو کی بڑی تعداد میں شرکت، سیکڑوں شاگردوں نے اپنے مشفق استاذ کو الوداع کہا

علی گڑھ میں تدفین کے دوران سوگوار، جبکہ انسیٹ میں مرحوم پروفیسر ابن کنول

علی گڑھ، (اسٹاف رپورٹر) ممتاز افسانہ نگار اور شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ابن کنول (ناصر محمود کمال) کو آج علی گڑھ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی تدفین علی گڑھ میں جمالپور عیدگاہ کے قریب واقع قبرستان میں عمل میں آئی۔پروفیسر ابن کنول کے آخری سفر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دیگر یونیورسٹی کے اساتذہ، طلب، رشتہ داروں کے علاوہ محبان اردو نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔خاص طور پر دہلی سے ان کے دیرینہ رفیق کار اور طلبہ بڑی تعداد میں ان کی تدفین میں شامل ہونے علی گڑھ پہنچے۔انھوں نے ایک مشفق اور مربی استاد کو نم آنکھوں کے ساتھ الوداع کہا۔پروفیسر ابن کنول کے جنازے میں خاص طور پر پروفیسر محمد علی جوہر (صدر شعبہ اردو، اے ایم یو، (پروفیسر اسلم پرویز، سابق وائس چانسلر اردو یونیورسٹی) ڈاکٹر عبد المعز شمس، پروفیسر شہاب الدین ثاقب، پروفیسر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی) پروفیسر عمران عندلیب (جامعہ ملیہ اسلامیہ) ڈاکٹر احمد امتیاز (دہلی یونیورسٹی) تفہیم الرحمن کشن، گنج بہار، ڈاکٹر مشیر احمد (جامعہ ملیہ اسلامیہ) پروفیسر سید محمد ہاشم، ڈاکٹر سلطان احمد، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر جمیل احمد، ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر معید الرحمن، ڈاکٹر عمر رضا، ڈاکٹر معید رشیدی، ڈاکٹر محمد شارق، ڈاکٹر مامون رشید، ڈاکٹر محمد خلیق الزماں، ڈاکٹر کیف فرشوری، ڈاکٹر اکمل شاداب (لکھنؤ) محمد صابر مکتبہ اور شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

واضح ہو کہ ہفتہ کے روز محبان اردو کو اس وقت ایک بڑا صدمہ لگا، جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ پروفیسر ابن کنول کا علی گڑھ میں اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ان کے انتقال کی خبر سے ادبی و تدریسی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔پروفیسر ابن کنول علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہفتہ کو پی ایچ ڈی کا وائیوا لینے آئے تھے، وائیوا کے بعد وہ اپنے بھائی کے گھر چلے گئے تھے، جہاں ان کی اچانک طبیعت خراب ہوئی، انھیں اے ایم یو کے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج لے جایا گیا، جہاں انھوں نے آخری سانس لی۔پروفیسر ابن کنول کے انتقال کی خبر سے اے ایم یو شعبہ اردو کے اساتذہ میں غم کی لہر دوڑ گئی۔لوگ حیران تھے کہ ابھی چند لمحوں قبل جو شخص اپنی مسکراہٹ کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوا، وہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔

پروفیسر ابن کنول کا اصل نام ناصر محمود کمال تھا، ان کی پیدائش ۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو مراد آباد میں ہوئی تھی۔پروفیسر ابن کنول نے ابتدائی تعلیم بدایوں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے منسوب کل اسکول سے حاصل کی۔اس کے بعد اے ایم یو سے ہی ایم اے کیا۔پھر دہلی کا رخ کیا، جہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔تقریباً چالیس برس سے اردو زبان و ادب کے فروغ میں ہمہ تن مصروف رہے۔پروفیسر ابن کنول متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔اس کے علاوہ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ملک و بیرون ملک مختلف کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر شعبوں میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہے۔

مہمان قلمکار

'تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی'

ممتاز افسانہ نگار ابن کنول کو خراج عقیدت

ڈاکٹر عزیز احمد

ابن کنول (پروفیسر ناصر محمود کمال) کی پیدائش ضلع مرادآباد کے قصبہ بہجوئی میں ایک زمیندار خاندان میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش ۱۵/اکتوبر ۱۹۵۷ء ہے۔ والد مشہور قومی شاعر قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی تھے۔ ان کے اجداد شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور قاضی کے عہدے سے نوازے گئے حکومت کی طرف سے جاگیریں دی گئیں۔ بعد میں آپ کے بزرگ قصبہ ڈبائی میں آکر رہائش پذیر ہوگئے۔ آپ کا خاندان علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ دادا قاضی شریعت اللہ (متوفی ۱۹۳۰) ایک قابل وکیل تھے۔ پردادا قاضی اولاد علی فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ قصبہ ڈبائی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اس قصبے نے اردو ادب کو کئی اہم شخصیات دی ہیں۔ وفا ڈبائیوی، دعا ڈبائیوی، انتظار حسین، مجیب الرحمان اور شفا قاضی جیسے اکابرین علم و فن اسی قصبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزادی سے پہلے یہاں علمی و ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں ہر طبقہ کے لوگ شوق سے شامل ہوا کرتے تھے۔ مشاعروں سے بھی مذاہب کے لوگ لطف لیا کرتے تھے۔ بعد میں ان میں سے اکثر پاکستان چلے گئے یا علی گڑھ اور دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے۔ ان کے والد کنول ڈبائیوی کی شاعری وطن کی محبت کے جذبے سے معمور ہے۔ وہ ایک سچے محب وطن تھے۔ ان کی شاعری اس کا نمونہ ہے۔ کنول ڈبائیوی کی شاعری کو پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین خاں، خواجہ احمد فاروقی، میکش اکبرآبادی اور پروفیسر عبدالحق جیسے مشہور ناقدین فن نے سراہا ہے۔

تعلیم: ابن کنول نے اپنی ابتدائی تعلیم ضلع بدایوں کے قصبہ گنور میں ایک اسلامیہ اسکول میں حاصل کی۔ اسکول اردو میڈیم تھا۔ آپ ۱۹۶۲ء میں پہلی جماعت میں داخل ہوئے، پہلے استاد حاجی صفدر علی مرحوم تھے۔ پانچویں جماعت کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے منٹو سرکل اسکول (جو سیف الدین طاہر ہائی اسکول کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) میں داخل ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں ہائی اسکول مکمل کرنے کے بعد پری یونیورسٹی سائنس میں داخلہ لیا۔ آپ بتاتے ہیں کہ والدین میڈیکل کالج میں داخلہ دلانا چاہتے تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ان کی بھی خواہش تھی کہ ان کا لڑکا بڑا ہو کر ڈاکٹر یا انجینئر بنے مگر بقول ابن کنول پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ بی اے میں اردو بنیادی مضمون قرار پایا۔ ۱۹۷۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ یہاں کی علمی فضا سے بھرپور استفادہ کیا۔ پروفیسر ابن کنول کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں علی گڑھ میں پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر قاضی عبدالستار، ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی، پروفیسر شہریار، پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر نعیم احمد اور پروفیسر اصغر عباس جیسے اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ ایم اے مکمل کرنے کے بعد آپ نے دہلی یونیورسٹی کا رخ کیا۔ اس کے بعد ابن کنول نے دہلی یونیورسٹی سے اپنا رشتہ اس طرح قائم کیا کہ پھر اس دن سے لے کر آخر تک یہیں خدمات انجام دیتے رہے۔ پی ایچ ڈی میں آپ نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نگرانی میں بوستان خیال کا تہذیبی و لسانی مطالعہ کے عنوان سے تحقیقی کام کیا۔ آپ کی یہ کاوش کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔ دہلی میں آپ کو بانی شعبہ اردو خواجہ احمد فاروقی اور مشہور ترقی پسند نقاد قمر رئیس سے بھی شرف تلمذ حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ادبی نشوونما: ابن کنول ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی اسکول کے زمانے میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنی شروع کر دی۔ اسکول کے ساتھی اسلم حنیف شاعری کیا کرتے تھے اور آپ کہانی لکھتے تھے۔ کبھی کبھی ان سے متاثر ہو کر ابن کنول بھی شاعری میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ ابن کنول بتاتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی تخلیقات پڑھ کر سناتے اور خوش ہوتے۔ یہ ابتدائی نگارشات ابن کنول کے مستقبل کے ادبی سفر کی تمہید تھے۔ ابن کنول کے ادبی ذوق و شوق کو بڑھانے میں علی گڑھ کی ادبی و علمی فضا کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ایم اے میں آپ ''انجمن اردوئے معلی'' کے سکریٹری رہے۔ یہ وہی انجمن ہے جس کی بنیاد مولانا حسرت موہانی نے رکھی تھی۔ اسلم حنیف سے متاثر ہو کر ابن کنول نے اس زمانے میں انسان کے چاند پر قدم رکھنے پر پہلی نظم کہی تھی جو ماہنامہ نور رامپور میں شائع ہوئی لیکن بعد میں ابن کنول نے اندازہ لگایا کہ ان کا حقیقی میدان افسانہ ہے۔ ابتدا میں ناصر کمال کے نام سے افسانے لکھتے تھے۔ لیکن ۱۹۷۵ء سے ابن کنول کے نام سے افسانے لکھنے لگے۔ ابن کنول اصل میں آپ کے والد کی طرف نسبت ہے۔ باقاعدہ افسانہ لکھنے کا آغاز ۱۹۷۳ء سے ہوا۔ آپ کا پہلا مطبوعہ افسانہ 'اپنے لیے اجنبی کی طرح' ہے جو ۱۹۷۳ء میں آفتاب سحر (سکندرآباد) نامی رسالے میں شائع ہوا۔ جب ۱۹۷۳ء میں آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا تو قاضی عبدالستار کی سرپرستی مل گئی۔

علی گڑھ میں تعلیم کے دوران آپ کے افسانے ملک کے معروف ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے۔ جن میں شاعر، عصری ادب، آہنگ، صبح ادب اور نشانات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ابن کنول نے بتایا کہ 'بند راستے' جب ۱۹۷۶ء میں عصری ادب میں شائع ہوا تو محمد حسن نے اس کی بڑی تعریف کی۔ طالب علمی کے زمانے میں اردو کے اس عظیم ناقد سے تحسین کے کلمات کسی سند سے کم نہیں تھے۔ دہلی یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد بھی افسانہ نگاری کا سلسلہ برقرار رہا۔ یہاں آکر پروفیسر قمر رئیس اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی تربیت میں آپ کے اندر تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتیں پروان پائیں۔

ملازمت: ابن کنول تعلیم کے زمانے سے ہی ادبی دنیا میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ جہاں آپ پہنچ گئے تھے وہاں آپ کا نام پہنچ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی سلسلہ ختم ہونے کے بعد جلد ہی آپ کو اپنے مادر علمی دہلی یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی۔ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد ۱۹۸۵ء میں سی ایس آئی آر کی طرف سے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ سائنٹسٹ کے طور پر آپ نے اپنی ملازمت شروع کی۔ اس کے بعد آپ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنی صلاحیتوں کے بل پر ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔ ۱۹۸۷ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک شعبہ اردو ہی میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی دوران جنوری ۱۹۹۰ء میں باقاعدہ مستقل لیکچرر بن گئے۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک وہ شعبہ میں ایک مستقل استاذ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ ۱۹۹۸ء میں ریڈر، اور جنوری ۲۰۰۶ء میں ترقی کرتے ہوئے پروفیسر کے عہدے تک پہنچے۔ کئی بار شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر بھی رہے۔ اور ۳۱ اکتوبر ۲۰۲۲ء میں سبکدوش ہوئے۔

علمی و منصبی مصروفیات کے باوجود ابن کنول ایک سادہ زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ وہ ایک ملنسار نفیس انسان تھے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ ان کا معاملہ ایک استاد سے بڑھ کر دوست کا ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ درخت پر پھل آتے ہیں تو اس کی شاخیں جھک جاتی ہیں۔ ابن کنول کی حیثیت بھی ایسے پھل دار درخت کی تھی جس کی شاخیں اپنے شاگردوں اور احباب کے لیے جھکی رہتی ہیں۔ آپ شعبہ کے سینئر استاذ کی حیثیت سے طلبہ و اساتذہ میں یکساں مقبول رہے۔ افسانہ، تنقید اور تحقیق ہر میدان میں ایک سے بڑھ کر ایک کاوش سامنے آئی۔ ان کا ہر قدم ایک نئی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ ابن کنول کا قلم اب بھی رواں تھا کہ آج بروز جمعہ علی گڑھ سے واپس آتے ہوئے راستے میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

ابن کنول کی موت کو ادبی دنیا نے ذاتی غم کے طور پر محسوس کیا

پروفیسر ابن کنول کے سانحہ ارتحال پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد تعزیتی نشست سے خالد محمود کا خطاب

نئی دہلی۔ (یو این آئی) پروفیسر ابن کنول اگرچہ دہلی یونیورسٹی کے استاذ تھے لیکن شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ جامعہ ملیہ کی کئی سلیکشن کمیٹیوں اور وائیوا میں وہ ممتحن کی حیثیت سے شریک رہے۔ ان کے چند دوست تو یہ بھی کہا کرتے تھے کہ آپ دہلی یونیورسٹی کے استاذ کم جامعہ ملیہ کے زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی رحلت نے سارے اردو معاشرے کو غم زدہ کر دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ابن کنول کے سانحہ ارتحال پر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقدہ تعزیتی جلسے میں صدر شعبہ پروفیسر احمد محفوظ نے کیا۔

اس موقع پر پروفیسر خالد محمود نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ابن کنول کی موت کو ادبی دنیا نے ذاتی غم کے طور پر محسوس کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے آخری لمحے تک اردو زبان و ادب سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔ وہ نیک، شریف اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی موت اردو ادب کے لیے کسی بڑے خسارے سے کم نہیں۔ سبکدوشی کے بعد ان کی ادبی تخلیقات جس تیز رفتاری کے ساتھ منظر عام پر آئیں وہ قابل دید ہیں۔ ان کی زود نویسی کو دیکھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ نہایت عجلت میں بہت سارے کام ایک ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر خالد جاوید نے ابن کنول کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی اچانک موت نے میرے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کی موت اندیشوں سے خالی موت تھی۔ اس موقعے پر پروفیسر ندیم احمد نے کہا کہ ابن کنول ایک مشفق استاذ اور نیک انسان تھے۔ ان کی طبیعت بذلہ سنج اور خوش مزاج واقع ہوئی تھی۔ وہ طالب علموں کی بھلائی اور بہتری کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے۔ پروفیسر عمران احمد عندلیب نے مرحوم کی بہت سی یادیں بیان کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

پروفیسر سرورالہدیٰ نے اس موقعے پر کہا کہ وہ بنیادی طور پر نثر کے آدمی تھے اور نثری اسالیب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ڈاکٹر شاہ عالم نے کہا کہ ابن کنول نے بہتوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا لیکن کبھی جتایا نہیں۔ وہ دوسروں کا بہت خیال کرتے تھے۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے ان کی خوش خلقی، خوش طبعی اور شفقت و محبت کے حوالے سے انھیں یاد کیا۔

ڈاکٹر سید تنویر حسین نے کہا کہ وہ شاگردوں کے تعلق سے بہت فکر مند رہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر محمد مقیم نے مرحوم کی شخصی خوبیوں کو یاد کرتے ہوئے ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ ڈاکٹر محمد آدم نے مرحوم کی خاکساری اور شفقت و محبت کا ذکر کیا۔ جلسے کا اختتام ڈاکٹر مشیر احمد کی تعزیتی قرارداد پر ہوا۔ اس جلسے میں ممتاز شاعر اور ڈراما نگار امجد اسلام امجد اور عہد حاضر کے مقبول ترین بلند خواں ضیا محی الدین کی رحلت پر بھی حاضرین نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ جلسے میں ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، ڈاکٹر ثاقب عمران، ڈاکٹر روبینہ شاہین زبیری، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر راہین شمع، ڈاکٹر غزالہ فاطمہ اور ڈاکٹر خوشتر زریں ملک موجود تھے۔

سپکٹر اشوک کمار سنگھ نے مہانگر کوتوالی میں درج کرائی ہے۔

ن کنول کی رحلت پر تعزیتی نشست

شعبہ اردو خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی
ت پر تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی
ر فخر عالم نے کی۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور صدر
احی نے پروفیسر ابن کنول کی علمی و ادبی کمالات کا
سر ابن کنول' ناصر محمود کمال' ممتاز افسانہ نگار سابق
کا انتقال اردو ادب کے لئے بہت بڑا خلا ہے وہ
ے تھے تخلیقی کاوشوں میں شاہکار افسانے، خاکے،
غیرہ قابل رشک تصنیف ہیں تنقید میں بھی کوئی ان کا ثانی
نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے تحریر کیے۔ اس مو
ابن کنول کے شاگرد ڈاکٹر محمد اکمل، شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر
ر تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اللہ ابن کنول مرحوم کی مغ
م کریم عطا فرمائے خصوصی طور پر ان کے تلامذہ اور لواحقین کو
فیظ اور رضوان خاں کے علاوہ دیگر شعبوں کے اساتذہ اور طلبہ

قابل تعریف تھے مگر دنیا انھیں محمود کے نام سے نہیں جانتی تھی، انھوں نے اپنے ادبی کمالات کے جھنڈے بھی گاڑے تھے لیکن دنیا انھیں کمال کے نام سے نہیں جانتی تھی، وہ عزیزوں کا بڑا خیال بھی رکھتے تھے ان کی مدد بھی کرتے تھے لیکن وہ ناصر کے نام سے بھی نہیں جانے جاتے تھے اسی لیے وہ کنول کی طرح ہمیشہ شگفتگی اور خوشبو بکھیرتے تھے، سراپا کنول تھے بلکہ ابن کنول بھی ہاں محمود، ناصر اور کمال والے مسمیات سے انھیں فطری لگاؤ تھا اسی لیے جب میں ان سے پہلی بار ملا تو میں حیران ہو گیا کہ یہ شخص مجھ سے کیوں اتنی محبت سے مل رہا ہے جیسے مجھ سے خوب واقف ہو۔۔۔ پھر جب میں نے خالد محمود صاحب کا خاکہ سنا تب معلوم ہوا کہ جس نام کے ساتھ یہ تینوں الفاظ جڑے ہوتے تھے انھیں ان سے فطری لگاؤ ہوتا تھا ‘‘

mepaper.qaumibharat.com

قومی بھارت

پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر علی جاوید طلبا و طالبات کے ہمدرد اور مشفق اساتذہ تھے'

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں نشست بیاد پروفیسر ابن کنول و پروفیسر علی جاوید کا انعقاد

'پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر علی جاوید طلبا

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں نشست بیاد

اردو زبان میں داستان گوئی کی تاریخ کا حرف آخر ہمارے بیچ سے اٹھ گیا: پروفیسر اختر الواسع

نئی دہلی: اردو کی داستان گوئی پر درجہ استناد رکھنے والے اور شخصی خاکہ نگاری میں امتیازی حیثیت کے مالک پروفیسر ابن کنول کا انتقال ایک بڑا حادثہ ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے پروفیسر ابن کنول کے انتقال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ وہ انتہائی ملنسار خوش اخلاق اور اچھے قلم کاروں میں تھے۔ ان کے شاگرد اور رفقائے کار اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس طرح سے ہمارے بیچ سے اٹھ جائیں گے۔ میرا ان سے اور ان کے والد سے دیرینہ تعلق تھا آج دونوں اس دنیا میں نہیں رہے یہ احساس بڑا صبر آزما ہے۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو اس حادثۂ ناگہانی پر صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ ابن کنول کے اچانک اٹھ جانے سے اردو دنیا میں صف ماتم بچھ گئی ہے۔ وہ ایک اچھے خاکہ نگار انشاء پرداز اور بہترین استاد تھے۔ انھوں نے سیکڑوں طلبہ کی ذہنی تربیت کی اور انھیں اردو زبان و تہذیب سے روشناس کرایا۔ وہ بذلہ سنج اور خوش مزاج انسان تھے۔ پچھلے مہینے لکھنؤ کے سفر میں ان سے ڈھیروں باتیں ہوئی تھیں۔ وہ حال ہی میں عمرہ کی سعادت حاصل کر کے آئے تھے۔ ڈاکٹر افضل مصباحی نے کہا کہ پروفیسر ابن کنول میرے مشفق استاد تھے، وہ انتہائی نیک دل، ایماندار اور دیانتدار تھے۔ ان کے ہزاروں شاگرد ہیں جو ملکی و بین الاقوامی سطح پر علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی رحلت سے علم و ادب کا بہت بڑا خسارہ ہوا ہے۔ وہ مسلسل لکھ رہے تھے اور حال ہی میں ان کی متعدد ادبی کاوشیں منظر عام پر آ کر مقبول خاص و عام ہو چکی ہیں۔ ایسے ایماندار استاذ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ ابن کنول کا دنیا سے چلے جانا اردو زبان و ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ ابن کنول ایک مخلص انسان اور ایک اچھے ادیب تھے۔ افسانہ نگاری میں بھی انہوں نے ایک مقام حاصل کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

IBN-E-KANWAL NUMBER

QUARTERLY

URDU RESEARCH JOURNAL

JULY 2022 TO MARCH 2023 || ISSUE 31-33

Editor

Dr. Uzair Israil

ISSN 2348-3687